محفلِ دانش منداں

محمد اسحاق بھٹی

www.KitaboSunnat.com

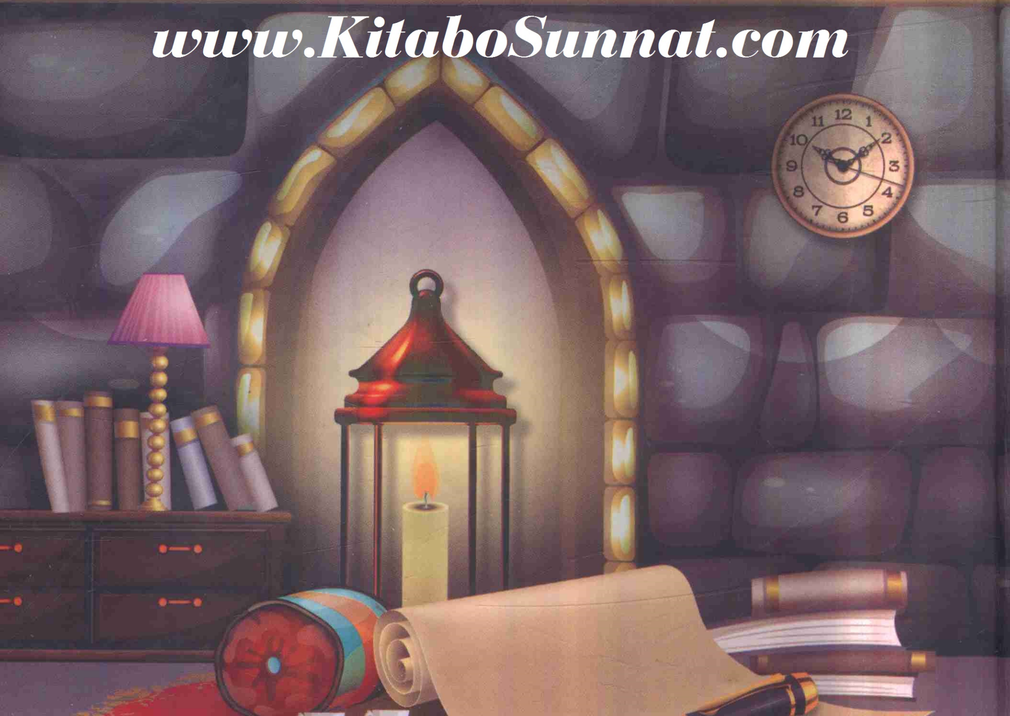

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

کتاب و قلم
مکتبہ دارالعلوم المحمدیہ

محفلِ دانش منداں

محمد اسحاق بھٹی

www.KitaboSunnat.com

ناشر

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

20S/13 جناح سٹریٹ، اسلامیہ کالونی ساندہ، لاہور
Ph 0301-4768918، 0423-7143677
mishaqbhattiri2002@gmail.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: ـــــــــ محفل دانش منداں

مصنف: ـــــــــ محمد اسحاق بھٹی

ناشر: ـــــــــ سعید احمد بھٹی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

حروف خوانی: ـــــــــ حافظ محمد حسان سعید

کمپوزنگ: ـــــــــ محمد لقمان سعید

صفحات: ـــــــــ ۳۲۰

سن اشاعت: ـــــــــ ۲۰۱۶

مطبع

ثوبان نعمان پرنٹنگ پریس، لاہور

0300-8661763

کتاب ملنے کا پتہ:

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

20S/13 جناح سٹریٹ، اسلامیہ کالونی ساندہ، لاہور

0301-4768918، 0423-7143677

mishaqbhattiri2002@gmail.com

مکتبہ اسلامیہ

لاہور: ہادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد

041-2631204 - 2641204

0300-8661763 ، 0321-8661763

www.facebook.com/maktabaislamia1

maktabaislamiapk@gmail.com

www.maktabaislamiapk.com

www.maktabaislamiapk.blogspot.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

◈ حرفے چند (سعید احمد بھٹی) ---------- 5
◈ پیشِ گفتار (ڈاکٹر زاہد منیر عامر) ---------- 7
◈ مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ...... علم کا سمندر تھے! (رانا محمد شفیق پسروری) ---------- 14
◈ میاں الحمد للہ ---------- 29
◈ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری ---------- 34
◈ ایم ایم شریف ---------- 57
◈ شیخ قمر الدین ---------- 76
◈ حاجی محمد اسحاق حنیف ---------- 79
◈ مولانا عبیداللہ احرار ---------- 102
◈ حکیم محمد عبدالسلام ہزاروی ---------- 113
◈ بشیر احمد ڈار ---------- 127
◈ مولانا محمد ابراہیم ڈنڈا ---------- 135
◈ مفتی عتیق الرحمان عثمانی ---------- 140
◈ پروفیسر محمد سرور جامعی ---------- 144
◈ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ---------- 173
◈ میر علی احمد تالپور ---------- 197

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

◈ سید صباح الدین عبدالرحمان ---------------------------- 202

◈ میاں عبدالمجید مالواڈا ---------------------------------- 211

◈ حکیم عنایت اللہ نسیم ----------------------------------- 224

◈ حاجی محمد رفیق زبیدی --------------------------------- 232

◈ اسماعیل ضیا -- 246

◈ مشفق خواجہ -- 261

◈ مارگریٹ مارکیوس سے مریم جمیلہ تک ---------------------- 282

◈ مولانا مجاہد الحسینی ----------------------------------- 290

◈ حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی ------------------------------ 300

◈ آہ! ابو جی..... ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے (حافظ محمد حسان سعید) ---- 305

◈ مولانا سید محمد داؤد غزنوی (آخری مضمون) ---------------------- 311

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرفے چند

ابو جی (مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ) ایک بلند پایہ مصنف، محقق اور مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین خاکہ نویس بھی تھے۔ آپ نے کئی ایک نامور شخصیات کے ''شخصی خاکے'' تحریر کیے۔ چوں کہ آپ کے اسلوبِ بیان میں حد درجہ سلاست اور شگفتگی پائی جاتی ہے اس لیے ان خاکوں کو پڑھتے ہوئے قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے یہ شخصیات اب بھی متحرک زندگی بسر کر رہی ہیں اور ہم ان سے ہم کلام ہیں۔ عظیم ادیب و مصنف محترم مشفق خواجہ (وفات ۲۰۔فروری ۲۰۰۵ء) کے الفاظ ہیں:

> ''شخصیات پر لکھنے والا آپ سے بہتر اس وقت کوئی نہیں ہے، آپ لکھتے نہیں، کارمسیحائی فرماتے ہیں۔ جسے مُردوں کو چلتے پھرتے دیکھنا ہو وہ آپ کے مضامین پڑھ لے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ نے کیسی کیسی منتخب روزگار شخصیات کو دیکھا، وہ لوگ بھی کچھ کم خوش نصیب نہیں جو آپ کے توسط سے یعنی آپ کے مضامین پڑھ کر ان شخصیات کو قریب سے دیکھتے ہیں میں بھی ایسے خوش نصیبوں میں شامل ہوں۔''

مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ وفات (۲۲۔دسمبر ۲۰۱۵ء) سے کچھ عرصہ پہلے اپنی دیگر تصنیفی مصروفیات کے ساتھ ساتھ زیرِ نظر کتاب محفلِ دانش منداں جو مختلف اہم شخصیات کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے، کی تکمیل میں مصروف تھے۔ چوں کہ وفات سے قبل انھوں نے اس کتاب کی حتمی فہرست کو مرتب کر لیا تھا، اس لیے ہم نے حتی الامکان اس فہرست کو اسی طرح رہنے دیا ہے۔

مولانا نے مختلف مجالس میں ذکر کرنے کے علاوہ کئی ایک جگہ پر یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی میرا حقیقی بیٹا بھی ہوتا تو شاید میری اتنی خدمت نہ کرتا جتنی سعید اور اس کے بیوی بچے کر رہے ہیں، یہ مولانا کی ہم سے محبت کا واضح ترین اظہار تھا۔ جس طرح ہم نے ان کی زندگی میں ہر طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے خدمت کرنے کی کوشش کی اسی طرح ان کی وفات کے بعد جو مسودات اور دیگر اہم چیزیں ہمارے پاس موجود ہیں اس کو شائع کر کے اس خدمت کو جاری رکھیں گے۔ ان شاء اللہ ۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ''محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' ۲۰۰۲ء میں قائم ہوا۔ اس ادارے نے بھٹی صاحب کی دو اہم تحقیقی تصانیف فقہائے ہند اور برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش کی دوبارہ اشاعت کی۔ اس ادارے کو قائم کرنے کے کچھ مقاصد تھے جن میں سے چند ایک اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکمل ہو گئے ہیں اور باقی ان شاء اللہ اب مکمل کیے جائیں گے۔

آخر میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب (پروفیسر اردو۔ پنجاب یونیوسٹی) کے انتہائی شکرگزار ہیں کہ انھوں نے اپنی تدریسی اور تصنیفی مصروفیات میں سے قیمتی وقت نکال کر اس کتاب پر نظر ثانی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک تفصیلی مقدمہ ''پیشِ گفتار'' کے نام سے لکھا، جس کا ایک ایک لفظ موتی کے نگینوں سے پرونے کے مترادف ہے۔ اسی طرح اگر بھٹی صاحبؒ کے قابل اعتماد دوستوں کی فہرست مرتب کی جائے تو ان میں ایک نام رانا محمد شفیق پسروری صاحب کا ضرور ہو گا۔ رانا صاحب نے ۷۔ اگست ۲۰۱۱ء کو روزنامہ ''پاکستان'' کے سنڈے میگزین (زندگی) میں مولانا محمد اسحاق بھٹی کی علمی خدمات کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون لکھا، جو بعدازاں وفات کے کچھ ترمیم کے ساتھ ''مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ...... علم کا سمندر تھے۔'' کے عنوان سے ۲۱۔ فروری ۲۰۱۶ء کو دوبارہ شائع ہوا۔ چوں کہ اس مضمون میں رانا صاحب نے بھٹی صاحب کی طویل جماعتی، صحافتی اور تصنیفی خدمات کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے اس مضمون کو اسی عنوان سے کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ابوجی کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے۔

آمین یا رب العالمین۔

۲۲ ستمبر ۲۰۱۶ء

سعید احمد بھٹی

042-37143677, 0301-4768918

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیشِ گفتار

تذکرہ نگاری ہماری ادبی اور تہذیبی روایت کا حصہ ہے۔مختلف فنون کے صاحبانِ کمال کے تذکرے ہمارے ہاں بہ کثرت لکھے گئے ہیں۔ایسے تذکروں کی بھی کمی نہیں جن میں کسی خاص فن کا نہیں بلکہ لکھنے والے کے مذاق یا تعلق کا لحاظ غالب ہوتا ہے۔ایسے تذکرے بھی مختلف فنون کی تاریخوں میں اساسی معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بن جایا کرتے ہیں۔تاریخ نگار سے جس معروضیت کا مطالبہ کیا جاتا ہے تذکرہ نگار عام طور سے ویسی معروضیت سے آزاد ہوتا ہے اور اپنے ربط و تعلق کی روشنی میں موضوع بننے والی شخصیت کا جائزہ لیتااور قاری کو اس کی تصویر دکھاتا ہے۔تذکرہ نگار یا شخصیت نگار موضوع میں سے اپنے پسندیدہ نقوش تو چن سکتا ہے لیکن اسے وہ سہولت بہ ہر حال میسر نہیں ہوتی جو ایک کہانی کار کو حاصل ہوتی ہے کہ کہانی کار کی انگلیاں کوزہ گر کی طرح جیسے چاہیں کہانی کے کوزے کی تعمیر و تشکیل کر سکتی ہیں جب کہ شخصیت نگار کی دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شخصیت کے وہی خدوخال پیش کرے جو کہ اس میں واقعاً موجود تھے۔

مولانا محمد اسحٰق بھٹی صاحب مرحوم ہمارے عہد کے نمایاں ترین تذکرہ نگاروں میں سے ہیں۔انھوں نے بڑے پیمانے پر تذکرہ نگاری یا شخصیت نگاری کی ہے۔ان کی شخصیت نگاری کے دو ضخیم مجموعے نقوشِ عظمتِ رفتہ (۱۹۹۶ء) اور بزمِ ارجمنداں (۱۹۹۹ء) خاص طور سے قارئین کی بارگاہ میں مقبول ٹھہرے ہیں۔مولانا اسحاق بھٹی صاحب کی زندگی کو بہ آسانی تین ادوار میں تقسیم کر کے مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔پہلا دور ان کی ابتدائی زندگی سے لے کر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے ان کی وابستگی تک کا ہے جسے ان کی زندگی کا تشکیلی دور بھی کہا جاسکتا ہے دوسرا اور اہم ترین دور وہ ہے جب وہ ۲۱۔اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے یہ ان کی علمی زندگی کا اہم ترین دور ہے جس میں انھوں نے متعدد قابل توجہ علمی کام کیے جن میں ابن ندیم کی الفہرست کا اردو ترجمہ، برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، فقہائے ہند (دس جلدیں)، برصغیر میں اسلام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اولین نقوش اور لسان القرآن کی توسیع شامل ہیں۔افسوس کہ ابھی ان کی فعال علمی زندگی کا ایک بڑا حصہ باقی تھا کہ ادارے سے ان کا انسلاک ختم کر دیا گیا جس کے نتیجے میں ادارہ ایک ایسے معمار اور جوہر قابل سے محروم ہو گیا جس کی کوئی تلافی آج تک ممکن نہ ہو سکی۔

اہلِ کمال کو نظیر اہل جہاں نے کیا دیا
اہلِ جہاں کو کیا نہیں اہل کمال دے گئے

ان کی علمی زندگی کا تیسرا دور ۱۶۔ مارچ ۱۹۹۶ء کو ادارے سے علیحدگی کے بعد شروع ہوتا ہے یہ ایک بھرپور دور ہے جس میں انھوں نے جم کر اپنے من پسند مسلکی و علمی کام کیے اور ان تمام لوگوں کی شخصیت نگاری کی جن کے ساتھ انھیں کام کرنے یا کسی بھی مرحلہ عمر میں تعارف و یکجائی کے مواقع ملے تھے۔یہی مرقعے محولہ بالا دو کتابوں کی صورت میں اہل علم تک پہنچے جن سے مولانا اسحٰق بھٹی صاحب کی غیر معمولی یادداشت، نہایت باریک مشاہدے اور ایک سادہ و بے ریا دل رکھنے والی دوست دار شخصیت کا اندازہ ہوا۔پیش نظر مجموعہ ان کی اسی شخصیت نگاری کا تیسرا نمونہ ہے، ابھی ایک اور مجموعہ اس کے بعد آنے والا ہے۔ان تراجم میں حسب سابق زندگی میں کسی بھی مرحلے پر مولانا اسحٰق بھٹی سے ملنے والی معروف، کم معروف یا غیر معروف شخصیات دکھائی دیتی ہیں۔ادارے سے وابستگی کے دوران چونکہ ان کا زیادہ رابطہ اہل علم سے رہا اس لیے ان کی پہلی کتابوں میں اہل علم زیادہ مقدار میں دکھائی دیتے ہیں باقی زندگی میں انھوں نے اپنی یادوں کے خزینے سے چن چن کر چنگاریاں اکٹھی کی ہیں، اندیشہ تھا کہ اگر یہ چنگاریاں سمیٹی نہ جا سکیں تو وقت کا سفاک عمل انھیں راکھ بنا کر رکھ دے گا۔

بھٹی صاحب کے توانا اور شگفتہ قلم نے ان چنگاریوں میں زندگی کے شعلے تلاش کیے ہیں۔ان کا موضوع بننے والی شخصیت اکہری اور سپاٹ ہے یا رنگا رنگ، انھوں نے اسے اسی طرح رہنے دیا ہے، ہاں اپنی طرف سے اس کے خاندانی احوال اور کاروبارِ حیات میں اس کی کارکردگی کا کوئی گوشہ قاری سے مخفی نہیں رکھا۔ان کا موضوع بننے والوں میں عام لوگ بھی ہیں اور اہل علم بھی، اہل سیاست بھی ہیں اور اہل تمدن بھی، وہ ان سب کو اپنے مشاہدے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روشنی میں قاری سے متعارف کرواتے ہیں۔ان کا قلم محمد حسین آزاد کی طرح الفاظ کے طوطے مینا نہیں بناتا نہ ہی انھیں عصمت چغتائی کی طرح کسی کی جنت دوزخ کا فیصلہ کرنا ہے نہ وہ اوپندر ناتھ اشک کی طرح زیرِ قلم شخصیات کو دشمن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ تو سیدھے سبھاؤ قاری کو اپنے موضوع سے ملوانے میں دل چسپی رکھتے ہیں اور اپنی طرف سے مشاہدے کے علاوہ موضوع بنائی جانے والی شخصیت کے احوال حیات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اس کوشش میں کہیں کہیں ان کا بیان خاصا سپاٹ ہو جاتا ہے لیکن جو شے ان تعارف ناموں کو خاصے کی چیز بنا دیتی ہے وہ جا بجا بکھری ہوئی معلومات ہیں۔جن کا تعلق ماضی قریب کی علمی تہذیبی اور سیاسی تاریخ سے بہت گہرا ہے مثلاً نقوش ابوالوفا کیسے لکھی گئی، قاضی سلیمان منصور پوری صاحب کی سیرت رحمۃ اللعالمین کا انگریزی ترجمہ کس نے کیا،مولوی انشاء اللہ خان کے اخبار وطن کی اشاعت کتنی تھی، پروفیسر سرور کس طرح مولانا عبید اللہ سندھی تک پہنچے اور پھر عمر بھر ولی اللہی افکار کی ترجمانی کرتے رہے، مارگریٹ مارکوئس، مریم جمیلہ بننے سے پہلے کون کونسے مسلمان اسکالرز سے راہ نمائی لیتی رہیں۔برصغیر کی آزادی میں جرمنی اور جاپان سے مدد لینے کے لیے سوبھاش چندر بوس داڑھی چھوڑ کر اور مولوی ضیاء الدین بن کر ہندوستان سے کیسے فرار ہوئے یہ اور اس طرح کی بہت سی معلومات اس کتاب کے اوراق میں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔

سوبھاش چندر بوس کے تذکرے میں، بھٹی صاحب نے بعض بہت دل چسپ باتیں لکھی ہیں۔سوبھاش بابو کو آزادی کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی جدوجہد سے اختلاف تھا ان کا خیال تھا کہ حالات کے جبر نے انگریزی استعمار سے نجات کو تو یقینی بنا دیا ہے مگر حقیقی آزادی خواب ہی رہے گی کیوں کہ جمود کی قوتیں انگریز کے بعد اقتدار میں آ جائیں گی اور یوں حقیقی انقلاب بے معنی اور بانجھ ہو کر رہ جائے گا۔اس خیال کی اصابت اپنی جگہ لیکن سوبھاش بابو نے جو طریقِ کار اختیار کیا وہ دورِ غلامی کی جذباتی فضا کا نتیجہ تھا چنانچہ شورش کاشمیری جیسے نوجوان ان کی تحریک سے متاثر ہو کر دہلی چلو کی پکار پر نغمے الاپنے لگے۔راقم نے ایک زمانے میں شورش کاشمیری کی اس زمانے کی لکھی ہوئی کتاب بھی دیکھی تھی جس کا نام سوبھاش بابو کی تحریک کے نام پر "دہلی چلو" رکھا گیا تھا۔اسی زمانے کے ایک اخبار میں اس کتاب پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انور صابری کی منظوم تقریظ بھی دیکھی تھی'' اپنی اس تصنیف تازہ میں یہ ہم سے آج بھی + کہہ رہا ہے شورش شعلہ نوا دہلی چلو' پھر کبھی یہ کتاب دکھائی دی نہ اس کا تذکرہ۔ سامراج سے نجات کے لیے آزاد ہند فوج قائم کر کے پرتشدد راستہ اختیار کرنے والے سوبھاش بابو اور ان کے ہم خیال اگر آج پرتشدد طریق کار کے نتائج دیکھتے تو ضرور اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرتے۔

میاں عبدالمجید مالواڈا (م: ۲۲۔ جون ۱۹۹۲ء) کے تذکرے میں ان کے والد گرامی میاں عبدالعزیز مالواڈا (۱۹۔ اگست ۱۸۷۲ء...... ۲۸۔ جولائی ۱۹۷۱ء) کا ذکر بھی آیا ہے مالواڈا مرحوم لنکنز اِنّ میں قائداعظم کے جونیر معاصر اور لاہور میں مسلم لیگ کو ٹھکانا فراہم کرنے والے اوّلین راہ نماؤں میں سے تھے (۲۹۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو مسلم لیگ کا پہلا اجلاس لاہور میں انھی کی قیام گاہ پر منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، اور ملک برکت علی جیسے لوگ شامل تھے) ان کے نام خطوط مشاہیر کا جو ذخیرہ سامنے آیا اس میں ۱۸۸۴ء سے لے کر قیام پاکستان تک کے زمانے کے نہایت اہم خطوط اور دستاویزات شامل تھیں۔ اس ذخیرے کے تذکرے سے راقم کی یادوں کے ذخیرے میں بھی ایک ہلچل سی ہوئی اور وہ دن نگاہوں پر روشن ہونے لگے جب اسّی کی دہائی میں اس ذخیرے کا علم ہوا اور ادارہ ثقافت اسلامیہ نے نوادر کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں ایک تعارفی مجموعہ شائع کیا جس میں میاں عبدالعزیز صاحب کے نام مشاہیر کے کچھ خطوط کے کچھ عکس نمونتاً شائع کیے گئے تھے ان میں قائداعظم، علامہ اقبال، نوابزادہ لیاقت علی خان، حکیم اجمل خان، سر محمد شفیع، مولانا غلام قادر گرامی، خواجہ حسن نظامی، سر شہاب الدین، شمس العلما مولوی ممتاز علی غلام بھیک نیرنگ، عبدالمجید سالک، چودھری افضل حق، خواجہ عبدالوحید اور دوسرے اکابر پنجاب کے خطوط شامل تھے۔ اسمبلی ہال کے سامنے، سمٹ مینار کے قدموں میں واقع متحف یا عجائب کدے میں ۱۲ سے ۱۴۔ اگست ۱۹۸۵ء کو اس ذخیرے میں شامل دستاویزات، خطوط، کتابچوں اور اشتہارات کی ایک نمائش لگائی گئی تھی۔ راقم اس نمائش میں بھٹی صاحب کے ساتھ شریک تھا اور ہم نے وہیں ایک دہلیز پر بیٹھ کر نوادر میں شامل علامہ اقبال کے خطوط کی خواندگی کی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ میاں عبدالعزیز کے نام ہندوستان کے مشاہیر کے پینتیس ہزار خطوط ہیں جو ان کے اخلاف کے پاس محفوظ ہیں، اور ادارہ ثقافت اسلامیہ ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست سازی اور بعدازاں ان کی اشاعت کے ایک منصوبے پر کام کررہا ہے لیکن پھر آن قدح بشکست...... اس سلسلے میں کوئی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔ ہم ایسے جدوجہد آزادی کے طالب علموں کے لیے اس ذخیرے کی خبر ملنا ایک بڑا انکشاف تھا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستانی مشاہیر قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفرعلی خان، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، نوابزادہ لیاقت علی خان، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیدو، پنڈت مدن موہن مالویہ، سردار ولبھ بھائی پٹیل، کون تھا جو میاں عبدالعزیز صاحب مالواڈا کے احباب کی فہرست میں شامل نہیں تھا اور اس ذخیرۂ خطوط میں جس کا کوئی نقش موجود نہ تھا۔ اس ذخیرے کی خبر ملنے کے بعد محض نمائش دیکھ لینے سے کہاں تشفی ہوتی تھی راقم ایک روز میاں عبدالعزیز صاحب کے خلف میاں عبدالمعید صاحب کے پاس پہنچ گیا جو لاہور چھاؤنی میں اسد جان روڈ پر رہتے تھے۔ خطوط سے اپنی دل چسپی کا اظہار کیا اور مولانا ظفرعلی خان کے خطوط کی تلاش میں جو جدوجہد ان دنوں کررہا تھا اس سے انھیں آگاہ کرکے ان کے پاس محفوظ ذخیرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میاں عبدالمعید ایک وضع دار اور خلیق شخص تھے انھوں نے راقم کی کم سنی کے باوصف ازرہِ کرم اسے یہ ذخیرہ دیکھنے کی اجازت دے دی، ذخیرہ اتنا بڑا اور اس طور منتشر و نامرتب تھا کہ اس میں سے کسی خاص شخص کا خط تلاش کرنا ممکن نہ ہوسکا البتہ جو چیزیں سامنے آتی جاتی تھیں ان میں سے اپنی دل چسپی کے خطوط الگ کرتا رہا اور بعد میں میاں صاحب کی اجازت سے ان سب کے عکس بنوالیے گئے۔ اب بھٹی صاحب کی زیرِنظر کتاب کا مسودہ پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ ۲۔ مارچ ۲۰۰۰ء کو میاں عبدالمعید صاحب وفات پاگئے اور ان کے بعد کسی نے اس عظیم الشان تاریخی سرمائے کو محفوظ نہیں رکھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بھٹی صاحب ایک عمر تک صحافت کی بادیہ پیمائی کرتے رہے دیکھا گیا ہے کہ اس کوچے کے صحرانورد، لفظوں کے استعمال میں خاصے آزاد ہوجاتے ہیں لیکن بھٹی صاحب اس معاملے میں محتاط تھے شاید یہ ان کی شخصیت کی علمی جہت کا نتیجہ تھا۔ علمی جہت کا نتیجہ ایک دوسری صورت میں بھی نکل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتا تھا لیکن علم فقہ پر کام کرنے کے باوصف ان کی نثر فقیہانہ رنگ کی حامل نہیں تھی۔ ان کی عبارت میں اغلاق یا اہمال کی جگہ صفائی اور سلاست ملتی ہے وہ کہا کرتے تھے کہ اردو زبان میں "لیکن" ایک جھاڑو کا نام ہے جو ماقبل کے سارے کلام کو صاف کر دیتی ہے اسی طرح وہ "مگر" کو مگر مچھ سے تعبیر کیا کرتے تھے جو پہلی بات کو نگل جاتا ہے اس لیے ان کی نثر اگر مگر اور لیکن ویکن سے پاک ہے۔

وہ اس بات کا اظہار بھی کیا کرتے تھے کہ انھیں شعر سے کوئی علاقہ نہیں، زیر نظر مسودے میں بھی کہیں انھوں نے یہ بات لکھی ہے۔ یہ بات اردو اور فارسی شاعری کی حد تک درست ہو سکتی ہے لیکن جہاں تک پنجابی کا تعلق ہے تو انھیں پنجابی کے بے شمار لوک گیت، ضرب الامثال اور ہیر وارث شاہ کے اشعار نوکِ زبان رہتے تھے اور وہ گفتگو میں انھیں بڑی فراوانی سے استعمال کرتے تھے جس سے ان کی شعر شناسی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس کتاب میں جہاں انھوں نے اردو کا شعر بھی استعمال کیا ہے وہ داد سے مستغنی ہے۔ مولانا مجاہد الحسینی صاحب کے تذکرے میں انھوں نے بڑی بے تکلفی سے ان کے اصل نام محمد یوسف اور قلمی نام مجاہد الحسینی میں مقابلہ کروایا ہے اس مقابلے بلکہ معارضے میں جس خوب صورتی سے غالب کا ۱۸۴۷ء کے بعد کی ایک غزل (مشمولہ نسخہ لاہور ۱۸۵۲ء) کا شعر نقل کیا ہے دیکھیے اس شعر نے کیا رنگ باندھا ہے۔

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

کتاب میں شامل ان شخصیات میں، جن سے تعلق کی مسرت راقم کو بھی حاصل رہی، مشفق خواجہ صاحب بھی شامل ہیں۔ خواجہ صاحب پر لکھا جانے والا مضمون پڑھ کر وہ دن یاد آ گئے جب اوّل اوّل راقم نے ان دونوں بزرگوں کا باہم رابطہ کروایا تھا جو بعد ازاں اپنے وقت کے دو نام ور اہل علم کی گراں قدر دوستی میں ڈھل گیا اور میرے لیے وہ دن کس قدر خوشی کا تھا جب بھٹی صاحب نے مشفق خواجہ پر مضمون باندھا اور راقم کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ "میں جناب مشفق خواجہ سے متعلق مضمون لکھ رہا ہوں، جس میں ظاہر ہے کہ ان کے اشعار بھی درج ہوں گے۔ میرے پاس ان کا کوئی مجموعۂ کلام نہیں ہے، اس کے لیے آپ کے باب علم پر دستک دے رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر ان کے چند اشعار لکھ کر مجھے ضرور بھجوائیے۔ نیز ان کی تصانیف و تراجم سے مطلع کیجیے۔ دو سال سے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ خط و کتابت کا سلام بھی کچھ عرصے سے منقطع ہے۔ معلوم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں وہ کس حال میں ہیں۔ میں چند روز تک انھیں ان شاء اللہ خط لکھوں گا لیکن مضمون کی اطلاع نہیں دینا چاہتا، جس کتاب میں چھپے گا وہ کتاب بہ صد ادب ان کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔''

یہ خط ۲۰۔ مئی ۲۰۰۲ء کو لکھا گیا اس کے بعد ۲۶۔ اگست ۲۰۰۲ء کے گرامی نامے کے ساتھ ان کا یہ مضمون منسلک ہو کر نظر نواز ہوا گویا یہ مضمون لکھنے میں انھیں تین ماہ کا عرصہ لگا مضمون بھجواتے ہوئے انھوں نے راقم کو لکھا ''مشفق خواجہ صاحب پر میں نے اِدھر اُدھر کی اکھڑی اکھڑی سی جو چند باتیں لکھی ہیں۔ وہ ارسال خدمت ہیں۔ آپ اچھی طرح پڑھ لیجیے۔ اگر ان میں کہیں اضافے کی ضرورت ہے تو کر دیجیے۔ اگر کوئی بات غلط ہے یا سوء ادب کا پہلو لیے ہوئے ہے تو حذف کر دیجیے۔ اس کے متعلق مجھے اپنی رائے بھی دیجیے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اسے دیکھنے اور تصحیح یا تغلیط کرانے کے لیے خواجہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیا جائے۔ آپ جو رائے دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔''

اضافے یا حذف کے لیے اپنا مضمون بھجوانا تو خیر ان کے اس حسنِ ظن کے باعث تھا جو وہ ان سطور کے راقم سے رکھتے تھے، حقیقت میں تو ''گل رُو و پشت ندارد'' والا مضمون تھا۔ بہ ہر حال وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جو مضمون ۲۰۰۲ء میں اس خیال سے لکھا گیا کہ اسے کتاب میں چھاپ کر خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا جائے گا، وہ چودہ برس بعد اس وقت زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہا ہے جب موضوع اور مصنف دونوں اس دنیا کو خیر باد کہہ چکے ہیں اور ان تحریروں کا تعارف کروانے کا فریضہ اس ہیچ مدان کو انجام دینا پڑ رہا ہے...... بھٹی صاحب! آپ نے مجھ سے رائے مانگی تھی، لیجیے میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دی ہے......

وہ جو اس جہاں سے گزر گئے کسی اور شہر میں زندہ ہیں
کوئی ایسا شہر ضرور ہے انھی دوستوں سے بھرا ہوا

۱۴۔ اگست ۲۰۱۶ء

ڈاکٹر زاہد منیر عامر
سابق صدر نشین مسندِ اردو و مطالعہ پاکستان، جامعہ الازہر قاہرہ، مصر
و مسندِ ظفر علی خان، ادارہ علوم ابلاغیات، پنجاب یونی ورسٹی
حال پروفیسر زبان و ادبیاتِ اردو،
پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ ......علم کا سمندر تھے!

(رانا محمد شفیق پسروری)

حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ ایک نابغہ روزگار اور عبقری شخصیت کے مالک تھے، حقیقتاً علم کا پہاڑ مگر انکسار کا پیکر، انھوں نے ساری زندگی، مسلسل شاقہ اور علم وتحقیق میں بسر کی، وہ اپنی تحریروں کے سہارے، علم وادب میں اونچا مقام حاصل کر گئے۔ ۲۲۔ دسمبر ۲۰۱۵ء کے روز وہ اکانوے (۹۱) سال کی بھرپور زندگی بسر کر کے اپنے خالق حقیقی سے جاملے، تو علوم وفنون سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں گہرے دُکھ کا اظہار کیا، صحیح طور پر اطلاع نہ دیئے جانے کے باوجود لاہور کے ناصر باغ (میں سوا دو بجے) اور ان کے گاؤں منصور پور ڈھیسیاں تحصیل جڑاں والا (میں بعد نماز عشاء) تمام مکاتب فکر اور مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والوں کا جم غفیر، اس مردِ درویش کی نمازِ مغفرت وجنازہ میں شرکت کے لیے حاضر تھا۔ تمام ذرائع ابلاغ نے اپنے اپنے انداز (اور سکت کے مطابق) مولانا محمد اسحاق بھٹی کی شخصیت اور اُن کے علم وفن پر روشنی ڈالی۔ برصغیر پاک وہند اور حرمین شریفین سمیت عالم اسلام کے اکثر علاقوں (بلکہ دنیا بھر میں مختلف مقامات پر) ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، ان کے مداحین، مسلسل مضامین لکھ رہے ہیں۔ روزنامہ ''پاکستان'' اور اس کے رفقاء کار کے ساتھ اُن کا ایک خاص تعلق رہا ہے اس لیے اس میں بھی اُن پر خوب لکھا گیا، ان کی تحاریر اور کتب کے حوالے سے ایک طائرانہ مضمون (پہلے بھی شائع ہو چکا ہے اور اب بھی) قارئین کی نذر کیا جارہا ہے۔

اکانوے (۹۱) سالہ ''جواں قلم'' مولانا محمد اسحاق بھٹی کی شخصیت علم ومطالعہ دوست قارئین کے لیے کم ہی محتاجِ تعارف ہوگی۔ وہ ایک کثیر التحریر لکھاری اور کتب کثیرہ کے مصنف تھے تاریخ نویسی بالخصوص شخصیات کی خاکہ نویسی میں ان کا اونچا مقام اور معروف نام ہے۔ شگفتہ نگاری اور جادو بیانی سے وہ اپنی تحریر کو شائستگی اور تازگی سے یوں نوازتے کہ پڑھنے والا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھتا ہی چلا جائے۔ ان کی لکھی کتب ہاتھوں ہاتھ لی اور مزے لے کر پڑھی جاتیں۔ وہ کہنہ مشق صحافی، مورخ اور بلند پایہ عالم تھے، وہ قرآن کی تفسیر، احادیث کی شرح، سیرت پاک کے مفاہیم، دینی تعلیمات کے ساتھ ساتھ برصغیر کی ہمہ جہت شخصیات پر اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ "آیت من آیات اللہ" کے مقام پر فائز محسوس ہوتے ہیں۔ طبیعت کی سادگی اور ''یار باش محفل سازی'' کے باوجود وہ کم وبیش ساٹھ (۶۰) ہزار صفحات رقم کر چکے ہیں اگر ان کو جمع کیا جائے تو بلا مبالغہ سو سے اوپر ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔ سیاسی سرگرمیوں، اسفار کی کثرت، تقریبات میں شرکت، استفادے کی خاطر آنے والے علمائے کرام وطلبہ کی بہتات میں بھی اُن کا بہت سا وقت صرف ہوتا رہا، پھر بھی وہ مسلسل لکھے جاتے تھے۔

ان کی علمی خدمات اور تنوع تحریر پر کئی طلبہ و طالبات ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ جات لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں، جب کہ برصغیر پاک وہند کے علاوہ بھی (اُن کی زندگی ہی میں) کئی ممالک کے اخبارات وجرائد میں ان کے بارے میں بے شمار مضامین، کالم اور شذرات شائع ہو چکے ہیں، ان کی وفات کے بعد عرب وعجم کے اردو، عربی اخبارات وجرائد میں ان پر بہت زیادہ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ اسی طرح مصنفین کی ایک کثیر تعداد اپنی کتب کو اہمیت دلانے کی خاطر ان سے مقدمات وتقاریظ لکھوانے کی متمنی رہتی۔ قدرت نے ان کو تحریر وانشاء کے بے پناہ ملکہ سے نوازا تھا اور انھوں نے علم کی مختلف جہات کو منور کیا تھا۔ کسی ایک مضمون میں ان کی شخصیت اور علمی خدمات کا احاطہ ممکن نہیں، پھر بھی ''زندگی'' کے قارئین کے لیے ایک کوشش ضرور کی جا رہی ہے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی بن عبدالمجید بن محمد بن دوست محمد بن منصور بن خزانہ بن جیوا......

آپ کے جد امجد جیوا مہاراجہ پٹیالہ کے درباری تھے۔ میاں جیوا کی آل اولاد طلب روزگار کے لیے پنجاب کے مختلف قصبوں اور دیہات میں چلی گئی، جن میں اکثر تقسیم ملک سے پہلے کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) مشرقی پنجاب میں آباد ہو گئے۔ مولانا ممدوح کی پیدائش یہیں ۱۵۔ مارچ ۱۹۲۵ء کو ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں دادا مرحوم سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا اور اردو لکھنا پڑھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ سرکاری سکول میں پہلی جماعت میں داخلہ لیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طبیعت چوں کہ علوم دینیہ کی طرف مائل تھی، اس لیے وقت کے جید عالم دین، شارح سنن نسائی اور دارالدعوۃ السلفیہ او رہفت روزہ ''الاعتصام'' کے بانی حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، جو موضع بھوجیاں، تحصیل ترن تارن، ضلع امرتسر کے رہنے والے تھے اور جو اس وقت خطابت وتدریس کے لیے کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کی دعوت پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ بھٹی صاحب نے مولانا مرحوم سے نحو، صرف، بلاغت، عروض، منطق وفلسفہ، بیان ومعانی، فقہ واصول، حدیث وتفسیر کی ساری کتابیں، جو اس زمانے میں درس نظامی میں شامل تھیں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۹ء کے عرصے میں پڑھیں۔ پھر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء تک شیخ العرب والعجم حضرت مولانا محمد گوندلویؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی خدمت میں گوجراں والا میں رہ کر کسب فیض کیا۔ مشہور مجاہد آزادی، دینی، علمی اور سیاسی لیڈر حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ اور صاحب تصانیف کثیرہ ومتکلم زمان حضرت مولانا محمد حنیف ندویؒ کی فیض صحبت وتربیت نے آپ کی علمی وفکری زندگی کو جلا بخشی۔ اپنے ان مشفق مربیان کرام کے متعلق مولانا خود رقم طراز ہیں:

> ''میری تربیت جن علمائے کرام میں ہوئی وہ نہایت اونچی شخصیات اور بے حد معتدل مزاج تھے اور اپنی بات مثبت انداز میں کرتے تھے، منفی نقطہ نظر سے کوسوں دور تھے، ان میں کسی نے بھی کفر وشرک، الحاد وبے دینی کے فتوے جاری نہیں کیے۔ وہ لوگوں کو مسلمان بنانے کے خواہاں تھے اور اسی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان میں سے کسی نے نہ الحاد کی دکان لگائی، نہ ہی کفر کی تقسیم کے لیے کوشاں ہوئے، نہ لوگوں کو مشرک بنانے کا دھندہ کیا، نہ کسی کو جنت سے نکالنے اور جہنم میں داخل کرنے کی کوشش کی۔''

مولانا بھٹی نے جن حالات میں ہوش سنبھالا، وہ برطانوی استعمار کے زوال اور صبح آزادی طلوع ہونے کا زمانہ تھا۔ انگریز اس خطے میں اپنے ناپاک قبضے کو دوام بخشنے کے لیے سارے گر اور ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے اور آزادی کے پروانے بھی حصول آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ وہ دور جس میں مولانا آزاد کے ''الہلال''، ''البلاغ'' مولانا محمد علی جوہر کے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ''، علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی، مولانا ظفر علی خاںؒ ''زمیندار'' اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون اور تحریک ''ہندوستان چھوڑ دو'' جیسی تحریکوں نے ہر اس شخص کو، جس کے دل میں وطن عزیز کے لیے تھوڑا سا بھی جذبہ قربانی، سرفروشی تھا، انھیں سڑکوں پر کھینچ لیا اور عالم یہ تھا کہ تاجروں نے تجارت چھوڑ دی، کسانوں نے ہل، علماء نے مدارس اور ملازمین نے اپنی سرکاری ملازمتوں کو چھوڑ دیا اور ساری قوم استعمار کے سامنے سینہ سپر ہوگئی تھی۔ بھلا ایسے حالات میں مولانا محمد اسحاق بھٹی تحریک آزادی سے اپنا دامن کیسے بچا سکتے تھے، چناں چہ آپ نے استخلاص وطن کے لیے اپنی ریاست کی ''پرجا منڈل'' میں شمولیت اختیار کرلی، جس کے صدر اس زمانے میں گیانی ذیل سنگھ تھے، (جو بعد میں مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ، پھر بھارت کی مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ اور پھر ۱۹۸۲ء سے کر لے ۲۴۔ جولائی ۱۹۸۷ء کے درمیان وقفے میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ بنے) اس کے سیکرٹری مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب تھے، اس ''پرجا منڈل'' کو آزادی کی صبح تک کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور کس مدوجزر سے گزرنا پڑا۔ بھٹی صاحب نے اس کی تفصیل اپنی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں اپنے دوست اور تحریک آزادی کے ہم سفر گیانی ذیل سنگھ کے تذکرے میں اس خوبصورتی سے بیان کی ہے کہ اس دور کی مشرقی پنجاب کی ساری جدوجہد آزادی کا حسین مرقع آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۵ء کے آخر میں پنجاب کی ریاستوں میں پھر تحریک آزادی شروع ہوگئی۔ یہ تحریک بہت زور دار تھی اور ۱۹۴۶ء میں اس نے شدت اختیار کر لی تھی۔ ہماری ریاست بھی اس تحریک کی زد میں آچکی تھی۔ ریاست میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی اور جلسے جلوس کی قطعی ممانعت، ان حالات میں طے کیا گیا کہ دفعہ ۱۴۴ توڑی جائے، سول نافرمانی شروع کر دی جائے اور پانچ پانچ آدمی گرفتاریاں پیش کریں۔ اس کے لیے پہلے تو ہم لوگ فیروز پور گئے، وہاں کھو کھلے ہال میں سائبان نصب کیے اور ڈیرہ لگا لیا۔ پھر فرید کوٹ شہر کے ریلوے سٹیشن کو مرکز بنایا گیا، جو انگریزی علاقہ ہونے کی وجہ سے ریاستی حکومت کی دسترس سے باہر تھا۔ جون کا مہینہ گرمی کی شدت سے تپ رہا تھا کہ دن کے ۱۱ (گیارہ) بجے پانچ آدمیوں کا پہلا جتھہ نعرے لگاتا ہوا آیا اور ریلوے لائن عبور کر کے ریاست کی حد میں داخل ہوگیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس جتھے میں دو مسلمان، محمد اسحاق بھٹی اور قاضی عبید اللہ (جن سے فرید کوٹ جیل میں گیانی ذیل سنگھ نے اردو اور قرآن مجید پڑھنا سیکھا تھا) دو سکھ بھائی دیال سنگھ اور لہنا سنگھ اور ایک ہندو چیتن دیو شامل تھے۔ یہاں ہمیں فی الفور گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کی اس تقریب میں بے شمار لوگ جمع تھے جو ریاستی حکومت کے خلاف اور گرفتاری دینے والوں کے حق میں زوردار نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ مسلمان، سکھ اور ہندو ایسے بھی تھے جو چند گز کے فاصلے پر ریلوے سٹیشن کے اندر کھڑے ہماری مخالفت میں تقریریں کر رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب فرید کوٹ کے سکھ حکمران ہراندر سنگھ کو ''اولوالامر'' قرار دے کر اس کی اطاعت کا اعلان فرما رہے تھے۔ ان تقریروں کا ہمارے بعض ساتھی اسی لب ولہجے میں جواب دینا چاہتے تھے، لیکن ہم سب کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے رہے کہ یہ لوگ ہمیں اشتعال دلا کر تحریک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، ہمارا فرض ہے کہ حالات کا پورے صبر وتحمل کے ساتھ مقابلہ کریں اور ہر صورت میں امن وشانتی کی فضا برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔''

اپنی رہائی کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں:

''فرید کوٹ کے داروغہ جیل کا نام عجائب سنگھ تھا۔ بہت شریف اور نرم آدمی تھا، حتی الامکان کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا تھا۔ ایک دن دس بجے کے قریب وہ ہمارے پاس آیا اور کہا: ''مَیں صابن بھیج رہا ہوں، مہربانی کر کے آپ اپنے کپڑے دھولیں۔'' ہم اس پر متعجب ہوئے کیوں کہ آج صابن ملنے والا دن (اتوار) نہیں تھا۔ دوسرے روز دس بجے کے قریب عجائب سنگھ آیا اور کہا: ''مہربانی فرما کر میرے ساتھ چلیے'' وہ ڈیوڑھی میں لے گیا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک گورے چٹے صاحب کھدر پوش وہاں تشریف فرما ہیں۔ ان کے ساتھ ریاست کے چیف سیکرٹری رام سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر یہ دونوں صاحبان کھڑے ہو گئے اور سب سے ہاتھ ملائے۔ کھدر پوش نے چیف سیکرٹری سے کہا: ''آپ تشریف لے جایئے، میں ان سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں سمجھا کہ یہ بھیم سین سچر ہوں گے لیکن انھوں نے بتایا: ''میرا نام سیف الدین کچلو ہے اور میں پنجاب کا کانگریس کا صدر ہوں۔'' میں نے ان سے کہا: ''پنجاب کانگریس کے صدر تو مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔'' انھوں نے بتایا: ''نئے انتخابات میں مولانا داؤد غزنوی صدر نہیں رہے، اب یہ ذمہ داری مجھ پر ڈال دی گئی ہے۔'' ڈاکٹر کچلو نے بتایا: ''باہر تحریک زوروں پر چل رہی ہے، حالات کا جائزہ لینے کے لیے کانگریس کی ہائی کمان نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ ایک دو روز میں پنڈت جواہر لال نہرو یہاں آرہے ہیں، وہ مہاراجا سے گفتگو کریں گے، پرجامنڈل کے مطالبات مان لیے جائیں گے اور آپ لوگوں کو رہا کر دیا جائے گا۔''
کچھ عرصے کے بعد پنڈت نہرو فرید کوٹ آئے، لیکن ریاست میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ وہ بذریعہ ریل آئے بہت بڑا ہجوم ان کے استقبال کے لیے فرید کوٹ کے ریلوے سٹیشن پر جمع تھا۔ وہ ہجوم کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے شہر میں داخل ہونے لگے تو فیروز پوری دروازے پر ایک ہندو مجسٹریٹ کھڑا تھا۔ اس نے ان کو کاغذ دکھایا اور کہا کہ ''شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ آپ اندر نہیں جا سکتے۔'' پنڈت جی نے کاغذ کا وہ پرزہ اس کے ہاتھ سے پکڑا اور اسے پھاڑ کر زمین پر پھینکتے ہوئے کہا: ''ہم اس طرح کے کاغذ کے پرزوں کے ساتھ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔'' پھر ہجوم سے مخاطب ہو کر بولے: بڑھو نوجوانو! اس کے بعد وہ غلہ منڈی گئے اور وہاں جا کر تقریر کی۔
بعد ازاں راجہ فرید کوٹ ہراندر سنگھ نے اپنی کار بھیجی اور پنڈت جی کو اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ وہ وہاں گئے اور دونوں نے باہم بات چیت کی۔ اس کے نتیجے میں ہمیں رہا کر دیا گیا''……

(نقوش عظمت رفتہ ص ۵۵۵، ۵۵۶)

یہ بھٹی صاحب کی دوسری گرفتاری تھی، جب کہ اس سے پہلے بھی وہ ۱۹۳۹ء میں آزادی کے لیے کچھ عرصہ فیروز پور جیل میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل چکے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کے بارے میں مولانا بھٹی لکھتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''۱۴۔اگست ۱۹۴۷ء کو ملک تقسیم ہوگیا تو ۲۱۔اگست ۱۹۴۷ء کو ہم اپنے قدیم مسکن سے نکلے اور قصور آ گئے۔ ایک مہینہ دس دن وہاں رہے، پھر اپنے خاندان کے ساتھ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کی تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب منصور پور آ گئے ہمارے موجودہ گاؤں کو چک ۵۳ گ ب ڈھیسیاں بھی کہا جاتا ہے۔ بہرحال جب ہم گھر سے نکلے تو کوئی چیز ہمارے پاس نہیں تھی۔ نہ کوئی کپڑا، نہ کوئی چھوٹا بڑا برتن۔ میری عربی، اردو، فارسی کی ۳۰۰ کے قریب کتابیں تھیں۔ وہ بھی وہیں رہ گئیں اور وہ سندیں بھی جو مشفق ترین اساتذہ نے انتہائی کرم فرماتے ہوئے، اس کم علم اور بے عمل کو عطا فرمائی تھیں، کتابوں میں رہ گئیں۔''

(خودنوشت سوانح حیات ''گزر گئی گزران'' ص ۲۱)

بھٹی صاحب یہ بیان کرتے ہیں:

''۲۴۔جولائی ۱۹۴۸ء کو کرم فرما اساتذہ (حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ) کے کہنے پر لاہور آ گیا جہاں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کی خدمت میں رہا اور ان کے تنظیمی کاموں میں معاونت کی۔ پھر ۱۹۔اگست ۱۹۴۹ء کو گوجراں والا سے جب ہفت روزہ ''الاعتصام'' جاری ہوا تو اس کا ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندویؒ کو مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد مجھے اس اخبار کا معاون مدیر بنا دیا گیا۔ یہ میری زندگی کا نیا تجربہ اور نیا دور تھا۔ مجھے لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی بہت جلد میرا پیشہ بن گئی۔''

(خودنوشت سوانح حیات ''گزر گئی گزران'' ص ۲۱)

حالات نے کروٹ لی اور ۱۵۔مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا حنیف ندویؒ ریسرچ فیلو کی حیثیت سے ادارہ ثقافت اسلامیہ (لاہور) سے منسلک ہوگئے۔ ان کی جگہ بھٹی صاحب کو ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ آپ ۱۵ سال تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس دور میں بے شمار علماء وزعماء سے میل ملاقات اور گفتگو کے مواقع ملے۔ جن سے آپ نے استفادہ کیا اور اس دوران آپ نے ''الاعتصام'' کے کئی خاص نمبر شائع کیے جن میں فروری ۱۹۵۶ء میں شائع ہونے والا ''حجیت حدیث نمبر'' اور مئی ۱۹۵۷ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں "۱۸۵۷ء (جنگ آزادی) نمبر" قابل ذکر ہیں۔ جو جہاد آزادی کا ایک اہم تحقیقی باب اور برصغیر کی سیاسی دستاویز ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے کئی عید نمبر اور آئین نمبر وغیرہ کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ اخبار "الاعتصام" کے دفتر کے متعلق دلچسپ معلومات دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بڑے سائز کے ۱۶ صفحات کے اخبار کا میں خود ہی خاکروب، خود ہی چپڑاسی، خود ہی کلرک، خود ہی مینیجر اور خود ہی ایڈیٹر تھا، یعنی ان تمام مناصب پر میں اکیلا قابض تھا"

الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے بڑی توفیق عطا فرمائی تھی۔ اسی دوران جنوری ۱۹۵۸ء میں اپنا ذاتی اخبار سہ روزہ "منہاج" جاری کیا جو اپریل ۱۹۵۹ء تک جاری رہا، نیز اس دوران بھٹی صاحب ۵ مئی ۱۹۶۳ء سے باقاعدہ روزنامہ "امروز" میں کئی سال تک مضمون نویسی اور کالم نگاری کرتے رہے۔ اسی طرح روزنامہ پاکستان کے چیف ایڈیٹر مجیب الرحمٰن شامی کے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" میں ایک عرصے تک شخصیات پر سلسلہ تحریر جاری رکھا۔ کچھ عرصہ روزنامہ "پاکستان" میں بھی لکھتے رہے۔ پھر حالات نے ایک اور پلٹا کھایا تو ۳۰۔مئی ۱۹۶۵ء کو اخبار "الاعتصام" کی ادارت سے مستعفی ہو کر چند ماہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنویؒ کے ساتھ مل کر ہفت روزہ "توحید" جاری کیا، مگر ۱۸۔ستمبر ۱۹۶۵ء کو اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ۲۱۔اکتوبر ۱۹۶۵ء کو مشہور تحقیقی ادارہ "ادارہ ثقافت اسلامیہ" نے بغیر کسی درخواست کے ریسرچ سکالر کی حیثیت سے بھٹی صاحب کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ وہ ادارہ ہے جو برصغیر کے معروف محققین کا مرکز تھا جن میں شیخ محمد اکرام، مولانا محمد حنیف ندوی، سید جعفر شاہ پھلواری، رئیس احمد جعفری وغیرہ شامل رہے۔ یہ ایک نیم سرکاری ادارہ تھا، جس میں بھٹی صاحب کو خالص تحقیقی میدان سے واسطہ پڑا۔ آپ کے لیے یہ علم کی نئی وادی تھی جس میں آپ کو قدم رنجہ ہونے کا موقع ملا۔ اس ادارے میں آ کر بھٹی صاحب کے علمی جوہر ایسے کھلے کے میدان تحقیق کے متوالوں کے لیے علم کا ایک دبستان وجود میں آ گیا۔ اس ادارے سے آپ ۳۲ سال وابستہ رہے، اس دوران آپ کے رشحات قلم سے کئی کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ ان میں سے کچھ آپ کے اشہب قلم کی عطر بیزیاں ہیں اور کچھ قدیم کتابوں کا ترجمہ، تحقیق اور تعلیق: مثلاً

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ **الفہرست**: محمد بن اسحاق بن ندیم الوراق البغدادی (متوفی ۳۹۱ھ) کی عربی تالیف ہے جو بہت سے علوم وفنون اوران کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ۹۱۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا آپ نے ترجمہ کیا۔ بے شمار مقامات پر حواشی لکھے اور اشاریہ بنایا، یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے چھپی۔

۲۔ **برصغیر میں علم فقہ**: صفحات ۴۰۰

۳۔ **فقہائے پاک وہند** (دس جلدوں میں) ۳۶۵۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب پہلی صدی ہجری سے لے کر ۱۳ ویں صدی ہجری تک فقہائے کرام کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اپنے موضوع کی یہ واحد کتاب ہے جو برصغیر کے علماء فقہاء کے بارے میں اردو میں لکھی گئی۔ (بعد میں محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے بہ اشتراک کتاب سرائے کے ۲۰۱۳ء میں ۳ ضخیم جلدوں میں اس کتاب کو شائع کیا ہے۔)

اس موضوع پر آپ نے پاکستان کی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب ایس اے رحمٰن صاحب کے مشورے سے قلم اٹھایا تھا۔

۴۔ **برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش**: صفحات ۲۴۴ طبع ۱۹۸۹ء۔ (محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اس کتاب کو ۲۰۰۹ء میں بہترین طباعت کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔)

۵۔ **ارمغان حنیف**: آپ کے استاد مولانا محمد حنیف ندویؒ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ صفحات ۳۷۱ طبع ۱۹۸۹ء۔

۶۔ **اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ** (۱۸۵۷ء تک کے شمالی ہند کے علماء پر مشتمل ہے): یہ ڈاکٹر ایوب قادری صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا، جسے آپ نے ایڈٹ کیا اس پر مقدمہ لکھ کر ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے شائع کرایا۔ صفحات ۲۲۴ طبع ۱۹۸۹ء۔

۷۔ **شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اوران کی علمی خدمات**: یہ ڈاکٹر ثریا ڈار (سابق چیئرمین شعبہ عربی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور) کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے بھٹی صاحب نے ایڈٹ کیا اور اس کی عربی وفارسی عبارتوں کا ترجمہ کیا اور اس پر مقدمہ لکھا اور پھر "ادارۂ ثقافت اسلامیہ" نے شائع کیا۔ صفحات ۳۲۵، طبع ۱۹۹۱ء۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۔ شروحِ صحیح بخاری: یہ محترمہ غزالہ حامد کا ایم اے کا مقالہ ہے جسے بھٹی صاحب نے ایڈٹ کر کے عربی و فارسی عبارتوں کا ترجمہ کیا۔ نیز ان شروحات کا تذکرہ بھی کیا جن کا مقالہ نگار نے ذکر نہیں کیا پھر اس پر مقدمہ لکھا اور ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' نے شائع کیا۔ صفحات ۱۷۵، طباعت ۱۹۹۱ء۔

۹۔ پیغمبرِ انسانیت: رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر مولانا سید جعفر شاہ پھلواروی کی تصنیف ہے، جسے بھٹی صاحب نے ایڈٹ کیا اور عربی عبارتوں کا ترجمہ کر کے ادارہ ثقافت اسلامیہ کو اشاعت کے لیے دیا۔ پھر اس پر مقدمہ لکھ کر شائع کیا۔ صفحات ۵۵۰، طباعت ۱۹۷۵ء۔

۱۰۔ فقہ عمر: مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہرویؒ کا ترجمہ: نظر ثانی اور ایڈیٹنگ کے بعد ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' سے شائع کیا۔ صفحات ۴۰۰، طباعت ۱۹۷۵ء

ماہنامہ 'المعارف' یہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے نشر ہونے والا ماہنامہ رسالہ تھا جس میں خالص تحقیقی مقالات شائع ہوتے تھے۔ بھٹی صاحب اس علمی مجلّے کے ۲۲ سال ایڈیٹر رہے۔ اس دوران آپ نے سینکڑوں اداریے، مضامین، کتابوں پر نقد تبصرے وغیرہ اس رسالے میں لکھے۔

اس طرح ۳۲ سال اس ادارے میں مختلف النوع علمی و تحقیقی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۶۔ مارچ ۱۹۹۶ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے سبک دوش ہو گئے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ملازمت کے ۳۲ سال کے عرصے میں بھٹی صاحب نے ادارے سے ہٹ کر اپنے طور پر جو کتابیں تصنیف فرمائیں اور جو مقالے لکھے، اس کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ جمع و تدوین قرآن: مقالہ برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، طباعت ۱۹۷۶ء۔

۲۔ فضائل قرآن: مقالہ برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، طباعت ۱۹۷۶ء۔

۳۔ مضامین قرآن: مقالہ برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، طباعت ۱۹۷۶ء۔

۴۔ واقعات و قصص قرآن: مقالہ برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، طباعت ۱۹۷۶ء۔

ان مقالات کے علاوہ متعدد موضوعات پر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کی مختلف جلدوں میں پچاس کے قریب مقالات شائع ہوئے۔

''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں تحریر فرمائیں:

۱۔ لسان القرآن جلد سوم: یہ کتاب قرآن مجید کی توضیحی لغت کے متعلق ہے۔ اس کی پہلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور دوسری جلد مولانا محمد حنیف ندویؒ کی تحریر فرمودہ ہے۔ ان کی وفات کے بعد بھٹی صاحب نے اس کتاب کی تیسری جلد تحریر فرمائی۔ صفحات ۳۴۲

۲۔ **چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں:** ......قرآن کریم کی روشنی میں رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ صفحات ۴۳۶ طبع ۱۹۹۹ء۔

۳۔ **میاں فضل حق اوران کی خدمات:** یہ کتاب شخصیات کی ذیل میں آتی ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ صفحات ۲۴۳، طباعت ۱۹۹۷ء۔

۴۔ **نقوش عظمت رفتہ:** مختلف شخصیات کے تذکروں کا مجموعہ، صفحات ۶۴۰، طباعت ۱۹۹۶ء۔

۵۔ **بزم ارجمنداں:** مجموعہ شخصیات کا تذکرہ، صفحات ۶۳۰

۶۔ **کاروان سلف:** تذکرہ ہائے شخصیات ،صفحات ۵۱۰، طباعت ۲۰۰۳ء۔

۷۔ **قافلہ حدیث:** منتخب شخصیات کا دلچسپ تذکرہ۔ صفحات ۶۴۵، طباعت ۲۰۰۳ء۔

۸۔ **اسلام کی بیٹیاں:** بہت سی صاحب عزم تاریخی خواتین کا تذکرہ، صفحات ۵۶۰، طباعت ۲۰۰۳ء۔

۹۔ **قصوری خاندان:** اس کتاب کا تعلق مشہور وکیل اور مجاہد آزادی مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم اور ان کے فرزندان گرامی مجاہد آزادی مولانا محی الدین احمد قصوری (والد معین قریشی سابق نگران وزیراعظم پاکستان) مولانا محمد علی ایم اے قصوری، مولانا احمد علی قصوری اور میاں محمود علی قصوری (سابق وزیر قانون پاکستان اور خورشید قصوری سابق وزیر خارجہ کے والد) کے تذکرے، ملک وملت اور وطن عزیز کے لیے ان کی ناقابل فراموش خدمات پر مشتمل ہے۔ صفحات ۲۰۸، طباعت ۱۹۹۴ء۔

۱۰۔ **برصغیر میں اہل حدیث کی آمد:** صفحات ۳۴۸، طباعت ۲۰۰۴ء۔

۱۱۔ **لشکر اسامہ کی روانگی:** ڈاکٹر فضل الٰہی کی عربی کتاب کا ترجمہ: صفحات ۱۲۶، طباعت ۲۰۰۰ء۔

۱۲۔ **سیدنا ابوبکر صدیقؓ:** سیرت صدیقؓ پر محمد حسین ہیکل مصری کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ۔ صفحات ۶۲۰، طباعت ۱۹۹۸ء۔

۱۳۔ **ریاض الصالحین:** حدیث کی مشہور ضخیم کتاب کا اردو ترجمہ مع حواشی دو جلدوں میں۔

۱۴۔ **ارمغان حدیث:** معاملات سے متعلق سو منتخب احادیث کا مجموعہ مع ترجمہ وحواشی، صفحات ۲۷۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۵۔ **تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ:** سیرت نبوی کی مشہور کتاب ''رحمتہ للعالمین'' اور کئی ایک کتابوں کے نامور مصنف اور سابق ریاست پٹیالہ کے سیشن جج علامہ محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ کے حالات زندگی کا حسین مرقع۔ صفحات ۴۹۶

۱۶۔ **صوفی محمد عبداللہ حالات، خدمات، آثار:** دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے بانی مشہور مجاہد آزادی اور بزرگ حضرت صوفی محمد عبداللہ کی سوانح حیات، صفحات ۴۵۰، طباعت ۲۰۰۵ء۔

۱۷۔ **میاں عبدالعزیز مالواڈہ:** بارایٹ لاء لاہور سے تعلق رکھنے والی برصغیر کی مشہور سیاسی اور سماجی شخصیت میں عبدالعزیز مالواڈہ کا سوانحی خاکہ ہے۔ صفحات ۵۹۲

۱۸۔ **برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن:** اس کتاب میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ان اہل حدیث علماء کا تذکرہ ہے جنھوں نے قرآن مجید سے متعلق خدمات انجام دیں۔ صفحات ۶۹۶، طباعت ۲۰۰۶ء۔

۱۹۔ **حجیت حدیث** (خاص نمبر ہفت روزہ ''الاعتصام''): صفحات: ۳۰۴

۲۰۔ **دبستان حدیث:** برصغیر کے ان اہل حدیث علمائے کرام کا تذکرہ جنھوں نے شروح حدیث یا فتاویٰ پر کام کیا یا تدریسی خدمات انجام دیں۔ بڑا سائز، صفحات ۶۷۴

۲۱۔ **گلستان حدیث:** علمائے کرام کی شخصیات کا مجموعہ، بڑا سائز، صفحات ۵۸۶

۲۲۔ **ہفت اقلیم:** برصغیر کی سات معروف شخصیتوں کے مفصل حالات۔ صفحات ۵۰۱

۲۳۔ **مولانا غلام رسول آف قلعہ میاں سنگھ:** تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات۔ یہ کتاب واگزاری کے بعد مسجد نیلا گنبد کے پہلے خطیب جماعت مجاہدین اور تحریک آزادی کے ایک معروف کردار پر ہے۔

۲۴۔ **مولانا احمد دین گکھڑویؒ:** اسلام کے مناظر اور بہت بڑے عالم دین کے بارے میں۔ صفحات ۳۵۸

۲۵۔ **روپڑی خاندان:** پنجاب کے ایک مشہور علمی خاندان کے بارے میں ہے۔ ساڑھے تین سو کے قریب صفحات ہیں۔

۲۶۔ **برصغیر میں اہل حدیث کی تنظیمی سرگزشت:** جماعت اہل حدیث کی تاریخ کے حوالے سے تقریباً ساڑھے تین سو صفحات۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۷۔ **خطبات استقبالیہ صدارت وخطبات استقبالیہ:** ۱۹۰۶ء سے لے کر آج تک کی مختلف آل انڈیا اور آل پاکستان کانفرنس کے صدارتی واستقبالی خطبات پر مشتمل ہے۔ صفحات ۳۶۸

۲۸۔ **گزر گئی گزران:** مولانا محمد اسحاق بھٹی کی اپنی آپ بیتی ہے، اس میں انھوں نے اختصار سے اپنی زندگی کے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے وضع داری اور قدرے تکلف اور نہایت انکسار سے کام لیتے ہیں، پھر بھی پڑھنے والے کو محسوس ومعلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر مشکلات ومصائب سے گزرے ہیں۔ یہ کتاب ۴۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۹۔ **برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت:** صفحات ۳۳۴، ناشر مکتبہ سلفیہ لاہور۔

۳۰۔ **چمنستان حدیث:** (بسلسلہ تاریخ اہل حدیث) صفحات ۸۰۵

۳۱۔ **برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات:** صفحات ۱۸۲، ناشر دار ابی الطیب گوجراں والا۔

۳۲۔ **تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی:** (حالات، خدمات، خاندان) ناشر مکتبہ اسلامیہ لاہور، صفحات ۴۵۵

۳۳۔ **بوستان حدیث:** تقریباً ۱۱۰ علمائے کرام جن کا تعلق پاک وہند کے علاوہ برطانیہ، سعودی عرب، کویت وغیرہ سے ہے قریباً ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ (زیر طبع)

میرے احاطہ علم میں ان کی یہی تصانیف وتحریرات ہیں ان کے علاوہ بھی ان کا بے شمار کام ہے۔

ان تحریروں کے خلاصہ کے طور پر بھٹی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

- ☆ تصانیف وتراجم
- ☆ اخباری مضامین ومقالات
- ☆ اخباری اداریے وشذرات
- ☆ بہت سی کتابوں پر مقدمہ

یہ تمام تحریریں اگر کتابی سائز میں منتقل کی جائیں تو ۴۰ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہوں۔ ریڈیو کی سینکڑوں تقریروں کے بے شمار صفحات ان کے علاوہ ہیں۔ متعدد کتابوں کی ایڈیٹنگ (ادارات) بھی اس میں شامل نہیں۔ بھٹی صاحب نے کئی کتابوں کے مقدمات اور تقاریظ تحریر کیں (میری بھی ایک کتاب ''اسلام اور جمہوریت'' کا مفصل مقدمہ لکھا) بعض اوقات، مسکراتے ہوئے فرماتے ''یار! ''مقدمہ بازی'' بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ اسی طرح بے شمار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طلبہ کو ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقامات کے لیے تفصیلی مضامین اور مقالے لکھ کر دیے یا ان کی تحریر میں مدد و اعانت کی۔ اب بعض لوگ ان کے مقدمات اور مختلف جرائد کے مضامین کو یکجا کرنے میں مصروف ہیں جن میں حافظ شاہد محمود (گوجراں والا) نمایاں ہیں۔

یہ تھی بھٹی صاحب کی کتابوں کی کچھ تفصیل جو آج الحمد للہ دنیا کے کونے کونے میں پہنچی ہوئی ہیں اور جو قارئین کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔

۲۵۔دسمبر ۱۹۶۵ء (یکم رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ) کو سحری کے وقت ریڈیو پاکستان لاہور سے بھٹی صاحب کی پہلی تقریر نشر ہوئی۔ اس کے بعد ریڈیو پر تقریروں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ کبھی کبھی ایک دن کے مختلف پروگراموں میں تین تین تقریریں بھی ہوئیں۔ کبھی پنجابی پروگرام، کبھی صراط مستقیم، کبھی آیات بینات، کبھی فوجیوں کا پروگرام، کبھی کتابوں پر تبصرے، کبھی سوہنی دھرتی، کبھی کسی مذاکرے میں شمولیت اور کبھی پروگرام۔

ایک مرتبہ ریڈیو پاکستان کی طرف سے ''ہفتہ حدیث'' منایا گیا۔ اس کے ارباب انتظام نے سات مقرروں کو چنا جن میں سے ایک بھٹی صاحب بھی تھے۔ ہر تقریر کا دورانیہ ۳۵ منٹ کا تھا۔ بھٹی صاحب نے ''حدیث اور اسماء الرجال'' کے موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ یہ تقریر متعدد مرتبہ ریڈیو پر نشر ہوئی۔

ایک مرتبہ مسلسل پندرہ روزہ سیرت پروگرام دیا گیا جس میں بھٹی صاحب کو سیرت النبی ﷺ کی مشہور کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کی تلخیص پیش کرنا تھی۔ یہ روزانہ پندرہ منٹ کا پروگرام تھا۔ پھر اسی پروگرام کو اسی انداز سے پنجابی میں پیش کرنے کو کہا گیا۔ اس پروگرام کو اردو پنجابی دونوں زبانوں میں بھٹی صاحب نے بہترین انداز میں پیش کیا۔ ریڈیو پاکستان لاہور نے ''زندہ تابندہ'' پروگرام شروع کیا تو اس کے منتظمین نے بھٹی صاحب سے اصرار کیا کہ وہ اس پروگرام میں اہم فوت شدہ شخصیات کا تذکرہ کریں۔ موصوف نے مسلسل ۴۵ دن پروگرام کیا۔

بھٹی صاحب کو پہلی مرتبہ ۲۷۔جولائی ۱۹۹۲ء کو ٹی وی پر ''بصیرت'' پروگرام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس کے بعد آپ نے ٹی وی پر بھی متعدد پروگرام پیش کیے۔ شرعی عدالت کی طرف سے بھٹی صاحب کو اطلاع آئی کہ وہ آپ کو اہم شرعی مسائل پر مشیر مقرر کرنا چاہتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس سے میرے تصنیفی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

ایک مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئر مین اور بھٹو دور کے وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی مرحوم نے بھٹی صاحب سے ان کے دفتر ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' میں خود آ کر آپ سے کونسل کی رکنیت قبول کرنے کے لیے اصرار کیا۔ یہ وہ عہدہ ہے جس کے حصول کے لیے لوگ واسطے وسیلے ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن بھٹی صاحب کی درویشی کہ آپ نے اپنی علمی مشغولیات کے پیش نظر معذرت کر لی۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی واقعتاً علم وفضل کا گہرا سمندر تھے، ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے انتہائی وقیع علمی کتابوں کا ترجمہ کر کے انھوں نے اپنی زبان دانی کا لوہا منوایا، مدت العمر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور میں تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔ اتنی بڑی علمی شخصیت ہونے کے باوجود ہر قسم کے احساس تفاخر یا غرور علم سے کوسوں دور تھے، تمام عمر انتہائی سادگی سے گزار دی، ''ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا'' صحیح معنوں میں زندگی بھر عمل کیا، ان کی سوانح عمری ''گزر گئی گزران'' پر اس کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ آج کے دور میں چند حروف لکھنے والے علامہ کہلانے لگتے ہیں، بھٹی صاحب صحیح معنوں میں اس کے حق دار تھے، لیکن کسی کو انھیں علامہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی اس لیے کہ انھیں اس طرح کی حرکات قطعاً گوارا نہیں تھیں۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی کی کتابیں اور تحریریں بہت متنوع ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ وسیر پر کتابیں لکھیں فقہا ہندو پاکستان پر ضخیم کتابیں لکھیں۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا، شخصیات پر لکھا تو کئی کتابیں وجود میں آئیں۔

آخری عمر وہ ثقل سماعت کا شکار ہو گئے تھے، لیکن ان کا حافظہ بلا کا تھا، اپنی یادداشت کے زور پر وہ گھنٹوں بلا تکان علمی گفتگو کرنے کا ملکہ رکھتے تھے، طرز زندگی اتنا سادہ تھا کہ اس لحاظ سے وہ آج کے دور کی شخصیت ہی نظر نہیں آتے تھے، ۹۱ ویں سال میں بھی متحرک زندگی گزار رہے تھے، آخری برس بھی ان کی لکھی ہوئی چار کتابیں شائع ہوئیں اور دو زیر طبع ہیں، جب کہ چند ایک پر کام جاری تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت اور فروگزاشتوں سے درگزر فرمائے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وادخلہ الجنۃ الفردوس ووسع مدخلہ۔ آمین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میاں الحمد للہ

(وفات ۱۹۶۰ء)

چھوٹا قد، گٹھا ہوا گداز جسم، سرخی مائل رنگ، چوڑا چہرہ، تیکھے ناک نقش، باریک ہونٹ، چھوٹے چھوٹے سفید دانت، لبوں پر مسکراہٹ، نہایت صالح بزرگ، تہجد گزار اور ذکرِ الٰہی میں مشغول، خوش خصال اور کم سخن، ٹخنوں سے اوپر سفید تہبند، سر پر عمامہ، ہاتھ میں پرانے لوگوں کی طرح اپنے قد کے مطابق عصا، یہ تھے میاں الحمد للہ۔

میاں الحمد للہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ صرف ناظرہ قرآن مجید پڑھے ہوں گے یا شاید تھوڑی بہت اردو پڑھ لیتے ہوں گے۔ انھوں نے بہت سے علما وصلحا کو دیکھا تھا اور ان کی مجلسوں میں شریک رہے تھے۔ غزنوی علما سے بالخصوص بہت متاثر تھے اور حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کے ارادت مندوں میں سے تھے۔

وہ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور ان کا نام امام الدین تھا۔ لیکن مشہور میاں الحمد للہ کے عرف سے تھے اور اس عرف نے ان کے نام پر غلبہ پالیا تھا۔ اصل نام کا کم ہی لوگوں کو علم ہوگا۔ زیادہ تر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ان کا پیدائشی نام الحمد للہ ہے۔

میاں الحمد للہ انھیں اس لیے کہا جاتا تھا کہ ہر بات پر الحمد للہ کہنا ان کا معمول تھا۔ کوئی خوشی کی بات کسی نے بتائی، کوئی غمی کی بات کان میں پڑی، کسی کے متعلق کوئی واقعہ کسی نے ان کے سامنے بیان کیا، تو وہ قدرے بلند آواز سے مسکراتے ہوئے ایک خاص لہجے میں کہتے: الحمد للہ۔

میں نے میاں الحمد للہ کو پہلی مرتبہ اپنے وطن (کورٹ کپورہ) میں اس وقت دیکھا تھا، جب مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں قیام فرما تھے۔ وہ مولانا کے پاس جاتے اور کئی کئی دن وہاں رہتے۔ لوگ ان کی نیکی اور خاص انداز سے بہ کثرت الحمد للہ کہنے کی وجہ سے ان کی مجلس میں آتے اور قدیم دور کے ان علما کے بارے میں ان کی باتیں غور سے سنتے جن کی صحبت میں رہنے کا انھیں شرف حاصل ہوا تھا۔ میری عمر اس وقت دس گیارہ سال کی ہوگی،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بھی بڑی توجہ سے ان کی باتیں سنا کرتا تھا۔

ایک دن وہ مسجد میں اکیلے بیٹھے تھے۔ میں ان کی خدمت میں گیا اور عرض کیا میاں الحمد للہ! کوئی ایسا وظیفہ بتایئے جس سے میرے دل میں پڑھنے کا شوق پیدا ہو اور میں کچھ پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جاؤں۔ میری بات سن کر پہلے تو انھوں نے اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا: الحمد للہ۔۔۔۔ پھر مجھے حصولِ علم کا وظیفہ بتایا۔ فرمایا: ہر نماز کے بعد دس مرتبہ رب زدنی علما، دس مرتبہ لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم اور دس مرتبہ رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی پڑھا کرو۔ میرے خیال میں یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ میں اس وقت سے اب تک زندگی کے بہت سے ادوار سے گزرا ہوں اور کئی قسم کے حالات سے دوچار ہوا ہوں۔ لیکن یہ وظیفہ مجھے یاد رہا۔ میں اب بھی ہر نماز کے بعد یہ وظیفہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، یہ نہایت آسان ہے اور نہایت صالح بزرگ میاں الحمد للہ کا بیان فرمودہ ہے۔ اس وظیفے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بے شمار فوائد سے نوازا اور میری کم علمی، بدعملی اور معصیت کیشی پر اللہ ذوالجلال کی بے پناہ کرم فرمائیوں سے پردہ پڑا رہا۔ الحمد للہ علی ذالک حمدا کثیراً۔

میاں الحمد للہ کے متعلق ہم نے سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرماتا ہے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ہماری ریاست فرید کوٹ کی مشرقی سرحد ریاست نابھہ سے ملتی تھی اور ریاست نابھہ کے ایک قصبے کا نام ''جیتو'' تھا۔ دیسی مہینے ''اساڑھ'' کے آخر میں جیتو میں مویشیوں کی منڈی لگتی تھی، جس میں دور دراز کے بے شمار لوگ مویشیوں کی خرید و فروخت کے لیے آتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے ایک ملنے والے کے ساتھ میاں الحمد للہ بھی جیتو کی منڈی مویشیاں میں پہنچ گئے۔ انھوں نے تین چار کٹے خریدے اور واپسی کے لیے کوٹ کپورے کا قصد کیا۔ یہ سخت گرمی کے دن تھے۔

میاں الحمد للہ کی موجودگی میں ان کے رفیقِ سفر نے بتایا کہ کٹے خرید کر جب وہ جیتو منڈی سے چلے تو گرمی سے برا حال ہو گیا اور دھوپ کی شدت سے کٹے ہانپنے لگے۔ میں نے میاں الحمد للہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کرو تاکہ گرمی ختم ہو، سفر میں ہمیں بھی آرام پہنچے اور کٹے بھی آسانی سے چل سکیں۔ جواب میں میاں الحمد للہ نے کہا جی تو میرا بھی چاہتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ بارش ہو جائے اور ہم آسانی سے اپنا سفر طے کر سکیں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ راستہ ریتلا ہے۔ بارش ہوئی تو گڈوں کے لیے چلنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ زمین میں دھنس جائیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمائے گا اور بارش ہوگی۔ لیکن خطرہ یہ تھا کہ بارش کی وجہ سے ریتلی زمین میں گڈے دھنسیں گے اور ان کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ ان کا ساتھی بیان کرتا ہے کہ میں نے کہا کوئی بات نہیں۔ آپ بارش کی دعا کریں۔ گڈے زمین میں نہیں دھنسیں گے۔

ساتھی کے کہنے سے میاں الحمد للہ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور تھوڑی دیر کے بعد آسمان پر بادل چھائے اور بارش ہونے لگی۔ بارش کے بعد وہی ہوا جس کا ڈر تھا، یعنی گڈوں کا چلنا مشکل ہو گیا۔ وہ منظر اب بھی میرے سامنے ہے جب میاں الحمد للہ کا ساتھی یہ واقعہ بیان کر رہا تھا اور میاں الحمد للہ مسکرا رہے تھے۔

میاں الحمد للہ اس فقیر پر بہت خوش تھے اور میری درخواست پر میرے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ میں نہایت شوق سے ان کی خدمت میں حاضری دیتا اور ان کی باتیں سنتا۔ ان کا چہرہ مہرہ معصومانہ سا تھا اور معصومانہ سا ہی ان کا اسلوبِ گفتگو تھا۔

یہ قیامِ پاکستان سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اب ان سے متعلق قیامِ پاکستان سے بعد کے ایک دو واقعات سنیے!

یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ مہینا غالباً مارچ کا تھا۔ دن کے دس گیارہ بجے ہوں گے۔ میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ یہ اخبار اس وقت گوجرانوالا سے شائع ہوتا تھا۔ اچانک میرے کان میں آواز پڑی ''السلام علیکم۔ الحمد للہ۔ اسحاق سے ملاقات ہوگئی۔'' میں نے دیکھا تو سامنے میاں الحمد للہ کھڑے تھے۔ وہی معصوم سا چہرہ، وہی معصوم سی مسکراہٹ، وہی معصومانہ اندازِ کلام جو قیامِ پاکستان سے پہلے سے ان کے ساتھ مخصوص تھا۔

میں جلدی سے اٹھا اور ان سے بغل گیر ہوا۔

عرض کیا: میاں الحمد للہ آپ کہاں؟

خالص پنجابی میں سیدھے سادے الفاظ میں فرمایا: میں نے بہت لوگوں سے تیرے متعلق پوچھا کہ کوٹ کپورے والا اسحاق مولوی عطاء اللہ بھوجیانی کا شاگرد پاکستان کے کس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاقے میں ہے؟ کس شہر میں ہے؟ اور کیا کام کرتا ہے؟ پوچھتے پچھاتے مجھے پتا چلا کہ مولوی داؤد غزنوی اور گوجراں والا کے مولوی اسماعیل (نے تم کو جماعت اہل حدیث کے اخباروں کا افسر بنا دیا ہے اور گوجراں والا میں مولوی اسماعیل) کی مسجد کے قریب تیرا دفتر قائم کر دیا گیا ہے۔ الحمد للہ۔۔۔ میں نے بتانے والے سے کہا وہ تو چھوٹا سا لڑکا تھا۔ اب جماعت کے اخباروں کا افسر ہو گیا ہے۔ الحمد للہ۔۔۔ آج میں نے تم کو ڈھونڈ لیا ہے اور تیری افسری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے، جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ الحمد للہ۔

میاں الحمد للہ کی یہ سیدھی سادی باتیں چوں کہ مخلصانہ تھیں اور میری تعریف میں تھیں اس لیے میں یہ باتیں سن کر خوشی سے پھول گیا اور تھوڑی دیر کے لیے اپنی ساری کمزوریاں بھول گیا۔ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق معاملہ تھا۔

میں نے پوچھا: آپ کہاں رہتے ہیں؟

مجھے یاد پڑتا ہے، انھوں نے بتایا تھا کہ ہم لوگ نوشہرہ ورکاں (یا کہا اس کے قریب کسی گاؤں) میں آبسے ہیں اور اب میں وہیں سے آرہا ہوں۔

باتیں کرتے ہوئے میاں الحمد للہ نے بتایا کہ انھوں نے اپنے گاؤں میں (یا محلے میں کہا) مسجد تو بنالی ہے اور جمعہ و جماعت کا سلسلہ بھی اس میں شروع کر دیا ہے۔ لیکن مسجد میں پانی کا نلکا نہیں ہے۔ نہ وضو کرنے کے لیے ٹوٹیاں ہیں۔ یہ کام تو کرا دے تو وہاں کے لوگ تجھے دعائیں دیں گے۔ الحمد للہ۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ مولانا محمد حنیف ندوی آگئے۔ چند منٹ بعد مولانا محمد اسماعیل سلفی اور اس وقت کی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب صدر صوفی نذیر حسین صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے ان بزرگانِ عالی قدر سے میاں الحمد للہ کا تعارف کرایا تو میاں الحمد للہ بہت خوش ہوئے کہ اتنے بڑے لوگوں سے انھیں ملاقات کا موقع ملا۔

میں نے محسوس کیا کہ میاں الحمد للہ کو دیکھ کر ان تینوں حضرات کے چہروں پر بھی تاثر کے نشانات ابھرے۔ مسجد کے بارے میں میاں الحمد للہ نے جو کچھ فرمایا تھا میں نے ان سے وہ بھی عرض کیا۔ چناں چہ صوفی نذیر حسین نے اسی وقت پانی کا نلکا اور ضروری سامان دینے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے وہاں پہنچانے کا وعدہ کیا، جس پر عمل بھی ہوا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی صاحب جمعے میں چندے کا اعلان کرنے سے گریز فرماتے تھے۔ لیکن انھوں نے خطبہ جمعہ میں میاں الحمد للہ کا نام لے کر مسجد کے لیے چندے کا اعلان فرمایا اور اس نہایت سستے زمانے میں ساڑھے چار سو سے زائد روپے جمع ہوئے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے گھر لے جا کر میاں الحمد للہ سے دعا کرائی اور ان کی کچھ خدمت بھی کی۔ صوفی نذیر حسین انھیں اپنے مکان پر لے گئے اور چار پانچ روز اپنے پاس رکھا۔ میاں الحمد للہ نے ان حضرات کو اور اس فقیر کو بے حد دعائیں دیں۔ بے شبہ وہ صاحب عمل بزرگ تھے اور ان کے چہرے پر صالحیت کے آثار نمایاں تھے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد میاں الحمد للہ لاہور آئے۔ اس وقت اخبار الاعتصام بھی گوجراں والا سے لاہور منتقل ہو گیا تھا اور اس کی ادارتی خدمات میرے سپرد تھیں۔ ان دنوں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے سسر میاں نور الدین بھی لاہور تشریف لائے تھے۔ یہ دونوں بزرگ حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی سے تعلق ارادت رکھتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ فرماتے تھے۔

میں اس وقت چینیاں والی مسجد کے قریب کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ ایک دن میں شام سے کافی دیر بعد گھر پہنچا تو میاں نور الدین اور میاں الحمد للہ دونوں میرے غریب خانے پر تشریف فرما تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا۔ پتا چلا کہ ان دونوں بزرگوں نے چینیاں والی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی اور وہاں سے مجھے ملنے کے لیے ازراہِ کرم میرے گھر تشریف لے گئے، لیکن مجھے گھر میں نہ پا کر واپس جانے لگے تو میری بیوی نے ان کو روک لیا اور اندر تشریف لانے اور کھانا کھانے کی درخواست کی۔ اس وقت گھر میں اس کے پاس میرا چھوٹا بھائی سعید احمد تھا جو سکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ بیوی نے بتایا کہ اس نے سرسوں کا ساگ پکایا تھا اور مکئی کی روٹی تھی۔ یہی چیزیں ان کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ ساگ کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا کر وہ بے حد خوش ہوئے اور فرمایا یہ اس موسم کا بہترین کھانا ہے جو ہم نے کھایا۔

میرا خیال ہے میاں الحمد للہ کا لاہور میں یہ آخری پھیرا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد وہ وفات پا گئے۔ افسوس ہے ان کی تاریخ وفات میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہی۔

اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری

(وفات ۲۔اگست ۱۹۶۲ء)

۱۹۴۵ء کے اکتوبر میں جمعیت علمائے ہند کے اکابر نے ہندوستان کی بعض سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے سرکردہ رہنماؤں کا ایک اجلاس بلایا تھا۔ یہ اجلاس دہلی میں جمعیت کے مرکزی دفتر میں منعقد ہوا تھا۔ مجھے بھی اس میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی، حالاں کہ نہ میں کسی سیاسی جماعت کا رہنما تھا اور نہ کسی علاقے کا سرکردہ۔۔۔! یہاں یہ یادرہے کہ ''سرکردہ'' کے وہی معنے ہیں جو پنجابی میں ''سرکڈھ'' کے ہیں۔ پنجابی میں کسی بڑے آدمی کا تعارف کراتے ہوئے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے علاقے یا گاؤں یا خاندان کا سرکڈھ ہے، یعنی سرکردہ ہے۔۔۔ بہرحال میں سرکردہ یا سرکڈھ نہیں تھا، میں تو مشرقی پنجاب کی ایک سکھ ریاست (فرید کوٹ) کا رہنے والا تھا، جہاں کسی قسم کی سیاست بازی کرنا اور سیاسی جماعت بنانا ریاستی قانون کی رو سے ممنوع تھا۔ یوں بھی بعض اعتبارات سے ہمارا علاقہ پسماندہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں میرا نام کیسے پہنچا اور میرا پتا کس نے دیا۔ بہرکیف مجھے اس اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی اور میں نہایت خوشی سے اس میں شامل ہوا تھا۔ میرے مسکن سے دہلی شہر تین سو سے زیادہ میل کی مسافت پر تھا اور ایک طرف کے تین روپے کرایہ لگتا تھا۔ بمبئے ایکسپریس جو لاہور سے چلتی تھی، ہمارے ہاں سے گزرتی ہوئی دہلی جاتی تھی اور میں اسی ایکسپریس سے دہلی گیا تھا۔

سچی بات ہے کہ ہم نے اس دعوت نامے کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز قرار دیا تھا اور بہت سے لوگوں کو سرا ونچا کر کے یا سرا وپر کو ''کڈھ کے'' یہ دعوت نامہ دکھایا تھا۔ اس دعوت نامے کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو ''سرکردہ'' بھی سمجھنے لگے تھے اور ''رہنما'' بھی۔۔۔! اگرچہ ہماری کوئی جماعت نہ تھی اور ہم نماز کے لیے بھی جماعت کے زیادہ عادی نہ تھے، لیکن سرکردگی کی سند تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مل ہی گئی تھی، اور وہ بھی کسی چھوٹی موٹی جگہ سے نہیں ملی تھی، جمعیت علمائے ہند کے مرکزی دفتر سے اس کے اکابر علما کی طرف سے عطا کی گئی تھی۔ پھر دلی کی سند اس زمانے میں بہت بڑی سند سمجھی جاتی تھی، جس کے غیر مستحق ہونے کے باوجود ہم مستحق قرار پائے تھے۔

یہ اجلاس تین دن جاری رہا تھا، جس میں ملک کی متعدد معروف شخصیتوں نے شرکت کی تھی، مثلاً بنگال کے مولوی فضل الحق، سندھ کے مولانا بخش سومرو، علی گڑھ کے خواجہ عبدالمجید (جو بعد میں ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رکن اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے) پروفیسر ہمایوں کبیر (جنھیں اس سے کچھ مدت پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا سیکرٹری مقرر کیا تھا، مولانا کے ایک سیکرٹری محمد اجمل خاں تھے جو طویل عرصے تک مولانا سے منسلک رہے) مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابوالوفا شاہ جہان پوری، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عبدالواحد (گوجراں والا)، مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا سید محمد میاں مراد آبادی اور دیگر بہت سے حضرات اجلاس میں شریک تھے اور ان میں اکثر بزرگوں کو میں نے پہلی دفعہ اسی موقعے پر دیکھا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری کی زیارت کا شرف بھی اولیں مرتبہ اسی اجلاس میں حاصل ہوا۔

۱۹۴۲ء سے قبل مفتی کفایت اللہ صاحب جمعیت علمائے ہند کے صدر اور مولانا احمد سعید دہلوی ناظم اعلیٰ تھے۔ یہ دونوں حضرات کئی سال اس منصب پر فائز رہے تھے، لیکن مارچ ۱۹۴۲ء میں جمعیت کا جو اجلاس لاہور میں ہوا تھا، اس میں مولانا سید حسین احمد مدنی اس کے صدر، مولانا سید محمد داؤد غزنوی نائب صدر، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم اعلیٰ اور حاجی محمد صالح (آف علی جان دہلی) ناظم مالیات منتخب کیے گئے تھے، چنانچہ لاہور کے اجلاس میں خطبۂ صدارت مولانا مدنی نے ارشاد فرمایا تھا، جب کہ صدر استقبالیہ مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔ مولانا قصوری اس زمانے میں بیمار تھے اور خطبۂ استقبالیہ کی چند ابتدائی سطریں پڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا پورا خطبہ ان کے صاحب زادۂ گرامی مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب نے پڑھا تھا۔

یہ تو یاد نہیں کہ اس وقت جمعیت علمائے ہند کی پنجاب شاخ کے عہدے دار کون کون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بزرگ تھے، البتہ یہ معلوم ہے کہ ضلع فیروز پور کی جمعیت کے صدر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی تھے جو ان دنوں فیروز پور کی گنبداں والی مسجد میں درس وخطابت کے فرائض سرانجام دیتے تھے اور میں انھی کے ساتھ اس جلسے میں شرکت کے لیے دہلی گیا تھا۔ میری عمر اس وقت انیس بیس برس کی تھی اور میں تمام شرکاے اجلاس سے کم عمر تھا۔

یہاں یہ عرض کردوں کہ پنجاب میں جمعیت قائم تو تھی اور سنا ہے کہ ایک مرتبہ اس کے صدر مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی کو اور ناظم اعلیٰ (غالباً) مولانا عبدالواحد صاحب کو بنایا گیا اور ان دونوں کا تعلق سکونت گوجراں والا سے تھا۔ لیکن اس کی تنظیمی حالت ہمیشہ کمزور رہی۔ لوگ اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتے تھے اور اسے صرف علماے دین کی جماعت سمجھا جاتا تھا، اور یہ بات صحیح بھی تھی۔

جمعیت کے قیام کی پہلی آواز پنجاب سے اٹھی تھی اور یہ آواز مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تھی جو انھوں نے ۱۹۱۹ء میں اس وقت بلند کی تھی، جب اس سے تھوڑا عرصہ بعد امرتسر میں کانگرس، مسلم لیگ اور مجلس خلافت کے اجلاس ہو رہے تھے۔ پھر انھی دنوں وہاں جمعیت علماے ہند کا اجلاس ہوا تھا، جس کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کی تھی اور صدر استقبالیہ مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ جمعیت کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تنظیمیں قائم ہیں، علما کی تنظیم بھی قائم ہونی چاہیے تاکہ یہ متحد رہیں اور آپس کے مسلکی اختلافات کے دائروں میں کمی واقع ہو۔ نیز اس زمانے میں انگریزی حکومت سے عدم تعاون اور ترک موالات وغیرہ کا سلسلہ شروع تھا۔ ترکی کی خلافت کا مسئلہ بھی بے حد اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ ان تمام معاملات میں شرعی نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے علماے کرام کی رائے لینا سب جماعتوں کے نزدیک ضروری تھا۔

پنجاب میں جمعیت قائم ہونے کے باوجود اس کے نظم ونسق کا دائرہ بعض وجوہ سے پنجاب میں زیادہ پھیل نہ سکا، تاہم آزادیٔ ملک کی تحریک میں اس نے بہت حصہ لیا۔ اس سے تعلق رکھنے والے علماے دین نے استخلاص وطن کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کے عوامی جلسے بھی بڑے کامیاب ہوتے تھے اور مقرر ایک سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک بڑھ کر تھے۔ پھر ان علماے کرام کا حلقہ ارادت وعقیدت اور دائرہ تلامذہ بھی نہایت وسیع تھا۔ یہ جہاں جاتے لوگ انتہائی ادب سے پیش آتے، لیکن ان کے سیاسی اثر ورسوخ کا دائرہ محدود اور سمٹا ہوا تھا۔ اب بھی علماے دین کے سیاسی معاملات کی یہی کیفیت ہے۔ دینی مسائل ومعاملات میں تو بے شک لوگ ان سے رجوع کرتے اور ان کی بات مانتے ہیں، لیکن سیاسیات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ علماے کرام کا موضوع نہیں۔۔۔ میرے خیال میں آسانی سے اس نقطۂ نظر کی تغلیط نہیں کی جاسکتی۔

جمعیت علماے ہند کا مرکزی دفتر پرانی دلی کی ایک تنگ سی گلی میں تھا، جس کا نام گلی قاسم جان تھا اور یہ گلی کوچہ بلی ماراں میں تھی۔ اس گلی کی جس بلڈنگ میں یہ دفتر تھا، وہ کافی بڑی اور کئی کمروں پر مشتمل تھی، صحن بھی اچھا خاصا تھا، جس کمرے میں اجلاس ہو رہا تھا، وہ بھی کافی کھلا تھا، چوڑائی میں کچھ کم اور لمبائی میں زیادہ۔۔۔ فرش پر دری اور اس کے اوپر سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں، جسے چاندنی کہا جاتا ہے۔ شرکاے مجلس جن کی تعداد دوسو سے زیادہ ہی ہوگی، خاص ترتیب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ درمیان میں گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے، جہاں صدر جمعیت مولانا سید حسین احمد مدنی اور نائب صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی تشریف فرما تھے۔ ان کے قریب مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بیٹھے تھے۔

میں نے دیکھا کہ ہر شخص کے آگے المونیم کا چمکتا دمکتا ایک ایک حقہ سا پڑا ہے، لیکن یہ تمام حقے نے اور چلم سے محروم ہیں۔ حیرانی ہوئی کہ یہ کیسے حقے ہیں، نہ ان میں سے کسی پر چلم ہے، نہ کسی میں نے ہے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے (جن کے میں بالکل قریب بیٹھا تھا) پوچھا تو وہ مسکرائے۔ فرمایا انھیں اگال دان کہا جاتا ہے۔ دلی اور یوپی کے زیادہ تر لوگ پان کھاتے ہیں، یہ ان کے لیے رکھے گئے ہیں۔ پان کھانے والے حضرات اس کی پیک اور تھوک اس میں پھینکتے جائیں گے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ پان کھانے والوں نے اپنے اپنے بٹوے یا چھوٹے چھوٹے پان دان سامنے رکھے اور پان بنا بنا کر کھانے لگے۔ جب منھ پیک سے بھر جاتا تو دائیں ہاتھ سے اگال دان اٹھاتے اور اسے منہ کے قریب کر کے بائیں ہاتھ سے داڑھی کے بالوں کو پیچھے ہٹاتے اور اس میں لال لال تھوک ڈالنے لگتے۔ اگر کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بزرگ پان چباتے ہوئے کوئی بات ارشاد فرماتے تو ان کی زبان قدرے بدلی ہوئی معلوم ہوتی اور قریب بیٹھے ہوئے آدمی کے منہ پر تھوک کے سرخ سرخ چھینٹوں کی پھوار پڑنے لگتی۔

یہ منظر ہم نے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور پہلی دفعہ ہی اگال دان دیکھا اور اس کا نام سنا تھا۔ سچی بات ہے اس سے سخت کراہت محسوس ہوتی تھی اور بار بار خیال آتا تھا کہ اچھے بھلے معزز لوگ یہ کیا حرکت فرما رہے ہیں۔

بعض علمائے کرام تمباکو کو حرام قرار دیتے ہیں اور سگریٹ نوشی کی شدید مخالفت کرتے ہیں، لیکن اسی تمباکو کو پان میں ڈال کر برسرِ عام کھاتے ہیں۔ یہ عجیب معاملہ ہے کہ تمباکو اگر مٹی کی چلم میں ڈال کر اور پتلے سے کاغذ میں لپیٹ کر پیا جائے تو حرام اور خلافِ شرع، لیکن اگر درخت کے سبز پتے میں ڈال کر کھایا جائے تو حلال اور علاقائی تہذیب اور وطنی ثقافت کا لازمی حصہ۔۔۔!

سرحد کے علمائے کرام برسرِ عام نسوار کھاتے ہیں۔ یہ بھی حقے اور سگریٹ کو حرام ہی قرار دیتے ہوں گے۔۔۔ حرام اور حلال کا معاملہ بھی عجیب ہے، اہلِ فتویٰ جس طرح چاہیں اس کی کل مروڑ دیں، ان کے سامنے بولنے کی کسے جرات۔۔۔!

میرے ایک دوست نے جو کافی عرصہ دلی رہے تھے، اگال دان کے بارے میں ایک دلچسپ لطیفہ سنایا جو واقعہ بھی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ دلی مسجدوں میں اگال دان پڑے رہتے ہیں، جن میں نمازی پان کی پیک اور تھوک پھینکتے ہیں۔ مسجدوں کے خادم ان اگال دانوں کو اچھی طرح نہلا دھلا کر اور چمکا دمکا کر دیواروں کے ساتھ قطار میں رکھ دیتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ پنجاب کے ایک گاؤں کے رہنے والے کچھ دوست دلی گئے اور انھیں ملے۔ نماز کے لیے مسجد میں گئے تو ان کی نظر پہلی صف میں دیوار کے ساتھ خاص ترتیب اور سلیقے سے رکھے ہوئے صاف ستھرے اگال دانوں پر پڑی۔ انھیں دیکھ کر وہ حیران ہوئے کہ معلوم نہیں یہ کیا شے ہے اور اسے یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟

میرے دوست بیان کرتے ہیں کہ نمازی تو نماز پڑھ کر چلے گئے، لیکن یہ لوگ وہیں بیٹھے رہے اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ باتیں کرتے کرتے ان میں سے ایک شخص نے اگال دان اٹھایا اور اسے اِدھر اُدھر سے دیکھنے لگا۔ پھر اچانک اسے الٹا دیا۔ اس نے سفید

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کپڑے پہن رکھے تھے۔ دیکھا تو اس کی جھولی پان کی سرخ سرخ پیک اور قسم قسم کے تھوک سے بھر چکی تھی۔ وہ ناک منہ چڑھاتا ہوا جلدی سے اٹھا اور وضو کرنے والی نالی پر جا کر اسے جھاڑنے لگا۔ پھر مسجد کے خادم سے صابن مانگ کر اسے دیا گیا، جس سے اس نے قمیص دھوئی اور آلائش کو صاف کیا۔

جب وہ اس عمل سے فارغ ہو چکا تو اسے برتن کے نام، اس کے مصرف اور مسجد میں اس کے رکھنے کی وجہ سے آگاہ کیا گیا۔

یہ تو تھا المونیم کے اگال دانوں کا قصہ۔۔۔! سنا ہے، امیر لوگوں کے اگال دان بہت شان دار اور نظر نواز ہوتے ہیں اور امیرانہ شان سے گھروں میں رکھے بلکہ سجائے جاتے ہیں۔ ایک دوست نے اس قسم کے اگال دان کے سلسلے میں یہ لطیفہ سنایا کہ ایک دیہاتی اپنے ایک شہری دوست سے ملنے شہر گیا۔ دیکھا کہ کمروں میں بڑھیا سے بڑھیا قالین بچھے ہوئے ہیں اور ٹھاٹھ کی زندگی بسر کی جارہی ہے۔ جس کمرے میں اسے ٹھہرایا گیا تھا اس میں بھی بہترین قالین بچھا ہوا تھا۔ میزبان صبح کو کہیں جانے لگا تو ملازم کو تاکید کر گیا کہ وہ گھر میں رہے اور مہمان کا خیال رکھے۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔

ملازم، مہمان کے پاس بیٹھا تھا کہ مہمان کو تھوک آیا۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا، وہ کمرے کے ایک کونے میں گیا اور قالین اٹھا کر فرش پر تھوکنے لگا، ملازم نے جلدی سے اگال دان آگے کر دیا۔ اگال دان بہت خوب صورت اور چمک دار تھا، مہمان کے نزدیک وہ کوئی ایسی چیز نہ تھی، جس میں تھوکا جاسکتا ہو۔ اس نے اگال دان سے منہ دوسری طرف کر لیا اور تھوکنے کے لیے بھاگتا ہوا کمرے کی دوسری جانب چلا گیا۔ ادھر بھی ملازم اگال دان لے کر آگے آ کھڑا ہوا۔ اب وہ تیسرے کونے کی طرف لپکا تو ملازم دوڑ کر ادھر آ دھمکا۔ مہمان کا منہ تھوک سے بھرا ہوا تھا، جب اس نے دیکھا کہ کسی طرف بھی تھوکنے نہیں دیا جاتا تو ملازم سے تھوک سے بھرے ہوئے منہ سے سخت لہجے میں کہا:

"اسے پیچھے ہٹاؤ ورنہ اسی میں تھوک دوں گا۔"

بات جمعیت علمائے ہند کے دفتر سے شروع ہوئی تھی جو اگال دان تک جا پہنچی۔۔۔ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے پہلی دفعہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو اسی دفتر میں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جمعیت علماے ہند کے ناظم اعلیٰ تھے اور یہ بہت بڑا منصب تھا، جس پر وہ فائز تھے۔ یوپی اور دلی کے جو علماوزعما اس مجلس میں تشریف فرما تھے، ان میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے صرف دو بزرگ تھے، جن کے آگے اگال دان نہیں رکھے گئے تھے اور جن کے دانت پان کی آلودگی سے محفوظ تھے۔ صاف، سفید اور چمکتے ہوئے۔ وہ تھے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور خواجہ عبدالمجید علی گڑھی!

پنجاب کے کسی شخص نے اگال دان اپنے آگے نہیں رکھا۔ نہ زیادہ پان کھاتے ہیں اور نہ اس مصیبت میں پڑتے ہیں۔

میانہ قد، دبلے پتلے نکھرا ہوا گندمی رنگ، سفید اور سیاہ بالوں پر مشتمل بھری ہوئی داڑھی، یونانی فلسفیوں کی طرح لمبی لمبی بھویں، چمک دار آنکھیں، اسلوب کلام واضح، سفید کھدر کا پاجامہ اور اسی قسم کی بغیر کالر کے قمیص زیب تن۔ خاکی سے کھدر کی شیروانی، سر پر رام پوری طرز کی ٹوپی، تیز طرار اور چاق وچوبند! یہ تھے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ تین دن اجلاس جاری رہا اور یہ روزانہ لباس بدل کر آتے۔ میں نے کسی وقت ان کے پاجامے یا قمیص کی تہ ٹوٹی ہوئی نہیں دیکھی۔

ابتداے شعور ہی سے میری یہ عادت رہی ہے (آپ اسے غلط بھی کہہ سکتے ہیں اور صحیح بھی قرار دے سکتے ہیں) کہ کسی بڑے اور مشہور آدمی کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملے تو اس کے طریق تخاطب، نہج کلام، لباس، شکل وشباہت، کھانے پینے کے انداز، اٹھنے بیٹھنے کے اسلوب اور اس کی حرکات وسکنات کا پورا ''جائزہ'' لیتا ہوں۔ وہ آدمی خواہ کسی بھی قابل ذکر شعبے اور حلقے سے تعلق رکھتا ہو۔ ادیب ہو، شاعر ہو، اخبار نویس ہو، مصنف ہو، مقرر ہو، مذہبی عالم ہو، دینی رہنما ہو، سیاسی قائد ہو۔۔۔ پھر اس سے متعلق یہ سب چیزیں میرے دل میں گھر کر لیتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدانخواستہ میں کوئی ''جائزہ کمیٹی'' ہوں اور میرا مقصد اس پر تنقید کرنا یا کسی کے سامنے اس کے عمل وحرکت کے کسی پہلو کی شکایت کرنا یا رپورٹ دینا ہے، ہرگز نہیں۔ میرا مقصد اس سے کچھ سیکھنا ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی اچھا پہلو ہو تو اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ شکل وصورت تو ظاہر ہے بدلی نہیں جاسکتی، یہ تو وہی رہے گی جو اللہ نے بنادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، لیکن دوسروں کی اچھی عادتیں اور اچھی باتیں تو اختیار کی جاسکتی ہیں اور اختیار کرنی چاہئیں۔

بہ ہر حال ہم نے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو اب سے باسٹھ برس قبل پہلی دفعہ دلی کی اسی میٹنگ میں دیکھا تھا۔

اس میٹنگ میں ملک کے مختلف صوبوں سے بہت سے لوگ آئے تھے۔ بنگال سے بھی متعدد حضرات تشریف لائے تھے، لیکن مجھے ان میں سے دو رہنماؤں کے نام یاد ہیں۔ ایک مولوی ابوالقاسم فضل الحق کا اور دوسرا پروفیسر ہمایوں کبیر کا۔ یہ دونوں اب بھی آنکھوں کے سامنے ہیں۔

مولوی فضل الحق کھلے پائنچے کا پاجامہ پہنے، سر پر ترکی ٹوپی لیے اور شیروانی زیب تن کیے ہوئے تھے۔ دراز قامت، صحت مند وتوانا، کلین شیو، سانولا رنگ، گرج دار آواز، صاف ستھری اردو۔۔۔ انھیں شیر بنگال کہا جاتا تھا۔ ڈیل ڈول، چال ڈھال اور جذبہ وجوش کے اعتبار سے واقعی شیر تھے۔ سیدھی اور دوٹوک بات کرتے تھے۔ اس وقت ان کی جماعت کا نام، جس کے وہ سربراہ تھے، پرجا پردیشک پارٹی تھا اور اسی کے نمائندے کی حیثیت سے وہ اس جلسے میں شریک ہوئے تھے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر جیسا کہ پہلے بتایا گیا، اس میٹنگ سے تھوڑی مدت پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکرٹری مقرر کیے گئے تھے۔ نکلتا ہوا قد اور کچھ لاغر اندام، لباس اور رنگ مولوی فضل الحق سے تقریباً ملتا ہوا۔ ننگا سر اور داڑھی مونچھ صاف۔ وہ کسی مسئلے پر رائے دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور اردو میں تقریر شروع کی۔ لیکن ان کی اردو مولوی فضل الحق کی اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

پروفیسر ہمایوں کبیر اس وقت بے شک اردو زیادہ نہیں جانتے تھے، لیکن علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا آزاد حکومت ہند کے وزیر تعلیمات ومعارف مقرر ہوئے تو ان کے ایک سیکرٹری یہی تھے۔ ان کی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' جو ہمایوں کبیر صاحب کے اصرار پر لکھی گئی تھی، اس طرح مکمل ہوئی تھی کہ ایک طے شدہ وقت پر ہمایوں کبیر روزانہ مولانا کی خدمت میں آجاتے تھے اور مولانا عام طور پر انگریزی میں یا کسی وقت ہمایوں کبیر کے فہم کے مطابق اردو میں اپنا مقصد واضح کر دیتے تھے اور اسے انگریزی میں لکھ کر دوسرے دن مولانا کو دکھا دیتے تھے۔ پھر مولانا کاٹ چھانٹ اور ضروری تغیر وتبدل کے بعد آخری شکل دے کر مسودہ ان کے حوالے کر دیتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکثر بڑے آدمیوں کی خودنوشتیں اسی طرح معرض تحریر میں لائی گئی ہیں کہ انھوں نے کسی لکھنے والے سے اپنی بات بیان کی اور اس نے خاص ترتیب کے ساتھ اسے قلم بند کر دیا۔

جمعیت علماے ہند کے دفتر میں منعقد ہونے والی پہلے دن کی یہ میٹنگ شام کے بعد اختتام کو پہنچی تو مولانا حفظ الرحمٰن نے اعلان کیا کہ مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام تو دفتر میں کیا گیا ہے، لیکن رات کو سونے کے لیے پنجاب ہوٹل میں چند کمرے لیے گئے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر رات کو دس بجے کے قریب تانگے منگوائے گئے اور جو مہمان ہوٹل میں قیام کرنا چاہتے تھے، انھیں وہاں لے جایا گیا۔ مولانا ہر کمرے میں خود گئے اور اپنی نگرانی میں سب کے لیے قیام کا معقول انتظام کیا۔

اتنی لمبی چوڑی بات میں نے بیان کر دی، لیکن یہ بتایا ہی نہیں کہ اس میٹنگ کا مقصد کیا تھا اور جمعیت علماے ہند کے اکابر نے ملک کے مختلف حصوں سے دو سو سے زائد افراد کو کیوں دلی آنے کی دعوت دی تھی۔۔۔؟

بات اصل میں یہ تھی کہ چند روز بعد یعنی ۱۹۴۵ء کے آخر میں ملک گیر انتخابات ہونے والے تھے، جن کی مدت انعقاد میں ۱۹۴۶ء کے ابتدائی دو مہینے بھی شامل تھے۔ اس میں حصہ لینے والی بڑی سیاسی جماعتیں دو تھیں، مسلم لیگ اور کانگرس۔۔۔ ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی بہت سی جماعتیں تھیں جو انتخابات کے میدان میں اترنے کی تیاری کر رہی تھیں۔۔۔ جمعیت علماے ہند نے مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کا اجلاس بلایا تھا اور یہ سب جماعتیں مسلم لیگ کے مقابلے میں ہار گئی تھیں۔

اجلاس سے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے کہ ایک دن مولانا معین الدین لکھوی نے مجھ سے اس مجلس کے انعقاد کا مقصد پوچھا تو میں نے کہا کہ اس کا مقصد اس اہم مسئلے پر غور کرنا تھا کہ باقاعدہ منظم طریقے سے اکٹھے ہو کر کس طرح مسلم لیگ سے شکست کھائی جائے۔

میں تو ریاستی تھا اور ریاستوں میں انتخاب وغیرہ کا کوئی معاملہ نہ تھا، اس لیے ہم اس جھمیلے سے آزاد تھے، البتہ ہم نے انتخاب کا تماشہ خوب دیکھا۔

اس اجلاس کی ایک بات قابل غور ہے، اور وہ یہ کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجلاس لاہور میں قرار دار پاکستان مولوی فضل الحق نے پیش کی تھی، لیکن ۱۹۴۵ء میں وہ مسلم لیگ کے مخالف تھے، معلوم نہیں اس کی وجہ کیا تھی۔

اس سے تقریباً پونے دو سال بعد جون ۱۹۴۷ء میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی زیارت اور ان کے ساتھ براہ راست باتیں کرنے کا موقع ملا۔ ہوا یوں کہ میں اور میرے ایک بزرگ دوست قاضی عبیداللہ (جنھوں نے ۳۰۔جنوری ۱۹۹۲ء کو چک ۳۶ گ ب ضلع فیصل آباد میں وفات پائی) اپنی ریاست فرید کوٹ کے بعض سیاسی مسائل مولانا ابوالکلام آزاد سے بیان کرنے کی غرض سے دہلی کے لیے تیار ہوئے۔ مولانا معین الدین لکھوی نے بھی ہمارے ساتھ جانے کا پروگرام بنالیا۔ اس سے چھ سال قبل ۱۹۴۲ء میں مولانا معین الدین کی شادی دہلی کے ممتاز و مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد دہلوی مرحوم (وفات مارچ ۱۹۴۱ء) کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ ہم دہلی گئے تو ان ہی کے مکان پر ٹھہرے تھے۔ یہ ۲۰۔جون ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ دوسرے دن (۲۱ جون کو) گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم تینوں مولانا حفظ الرحمٰن کو سلام عرض کرنے کے لیے جمعیت علمائے ہند کے دفتر پہنچے۔ ایک صاحب سے مولانا کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہاں تشریف فرما ہیں۔ ہم اجازت لے کر اندر گئے تو دیکھا کہ فرش پر دری بچھی ہوئی ہے اور مولانا گاؤ تکیے پر سر رکھے نیم دراز سے ہیں۔ کھونٹی پر شیروانی لٹک رہی ہے اور تکیے کے قریب ٹوپی پڑی ہے۔

ہم نے السلام علیکم کہا تو شفقت آمیز احترام سے سلام کا جواب دیا اور کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ ان کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور خیر و عافیت کا مبادلہ ہوا تو انھوں نے بتایا کہ وہ چند منٹ پہلے بمبئی سے آئے ہیں اور ابھی گھر نہیں گئے۔ بمبئی اس لیے گئے تھے کہ ان کے ایک کاروباری تعلق دار بمبئی کے رہنے والے تھے۔ ان کا تجارتی مال امریکہ سے بمبئی کے لیے بحری جہاز پر لادا جا رہا تھا کہ قیام پاکستان کا اعلان ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے بمبئی سے مستقل طور پر کراچی منتقل ہونے کا ارادہ کرلیا۔ اب انھوں نے ان کو (یعنی مولانا حفظ الرحمٰن کو) بمبئی سے ٹیلی فون کیا کہ وہ کوشش کر کے ان کا مال بمبئی کے بجائے کراچی پہنچانے کا انتظام کر دیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا نے فرمایا یہ بڑا مشکل اور اہم مسئلہ تھا۔ لیکن انھوں نے اس تاجر کی مدد کو اپنے لیے ضروری قرار دے لیا۔ پہلے دہلی میں حکومت ہند کے وزیر تجارت سے بات کی، پھر بعض دیگر سرکاری شخصیتوں سے رابطہ پیدا کیا۔ بعدازاں بمبئی جانے کا پروگرام بنایا اور اللہ نے کامیابی عطا فرمائی۔ جب یقین ہوگیا کہ ان کا جہاز بمبئی کے بجائے کراچی روانہ ہوگیا ہے تو وہ واپس دہلی کو روانہ ہوئے۔

سیاسی نقطہ نظر سے مولانا ممدوح کو قیام پاکستان سے اختلاف تھا اور وہ برملا اس کا اظہار کرتے تھے، لیکن ان کی یہ بات سن کر سخت تعجب ہوا کہ یہ شخص مسلمانوں کا کتنا بڑا اہم درد ہے اور ان کے مشکل سے مشکل کام کے لیے بھی کمر بستہ ہوجاتا ہے اور پھر اس میں اللہ اسے کامیابی عطا فرماتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایسا کام تھا کہ شاید اس زمانے کا کوئی بہت بڑا مسلم لیگی نہ کر پاتا، لیکن مولانا حفظ الرحمن نے کیا اور جس کا کام تھا، اس سے یہ نہیں کہا کہ آزادی کے بعد میں تو ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں، تم کیوں پاکستان کا عزم کیے بیٹھے ہو۔ کام کرانے والے کو بھی یقیناً یہ خیال نہیں ہوگا کہ مولانا اس سے سیاسی زبان میں بات کریں گے۔

مولانا ممدوح سے میری یہ دوسری اور آخری ملاقات تھی۔

یہاں یہ یاد رہے (جیسا کہ عرض کیا گیا) مولانا موصوف کو میں نے پہلی دفعہ جمعیت علمائے ہند کی اسی مجلس میں دیکھا تھا جس کا گزشتہ سطور میں ذکر ہوا، اور وہیں ان کی چند مختصر باتیں سنی تھیں جو انھوں نے اس میٹنگ کی کارروائی کے دوران ارشاد فرمائی تھیں۔ ان کی کوئی تحریر پڑھنے اور ان کی تصنیف شدہ کسی کتاب کے مطالعہ کا شرف اس وقت تک حاصل نہیں ہوا تھا۔ آزادیٔ وطن کے بعد بعض معاملات سے متعلق دو یا تین مواقع پر ان سے خط وکتابت بھی ہوئی اور ان کی تصنیفات کے مطالعے سے بھی بہرہ اندوز ہوا۔

ایک یا دو خطوں میں ان سے بعض استفسارات کیے تھے، جن کے جواب سے ازراہ کرم انھوں نے نوازا تھا۔ افسوس ہے وہ اہم خطوط محفوظ نہیں رہے۔ ایک خط البتہ موجود ہے، لیکن اس کی حیثیت دوسری ہے۔

جولائی ۱۹۵۵ء میں ہم نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا حجیت حدیث نمبر شائع کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا فیصلہ کیا تھا۔ انہی دنوں مولانا محمد داؤد غزنوی نے اپنے عزیزوں اور پرانے دوستوں سے ملاقات کے لیے میرٹھ اور دہلی جانے کا پروگرام بنایا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے ملیں گے۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ وہ مولانا سیوہاروی سے حجیت حدیث نمبر کے لیے مضمون کی بات کریں۔

دو ہفتے کے بعد مولانا واپس آئے تو فرمایا کہ انھوں نے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے مضمون کے لیے کہا تھا، آپ بھی ایڈیٹر کی حیثیت سے انھیں خط لکھیں اور خط میں میرا حوالہ دیں۔ چناں چہ میں نے اگست کے آخر میں ان سے بذریعہ خط مضمون کی درخواست کی اور مولانا غزنوی کا حوالہ بھی دیا۔ انھوں نے ۱۰۔ ستمبر ۱۹۵۵ء کو میرے خط کے جواب میں مندرجہ ذیل مکتوب ارسال فرمایا۔

مکرم ومحترم ---------------- سلام مسنون۔

مزاج شریف۔

عنایت نامہ صادر ہوا۔ یاد آوری کا شکرگزار ہوں۔ مکرم ومحترم مولانا داؤد غزنوی صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہیے۔ میں نے مولانا موصوف سے آمادگی ظاہر کی تھی کہ ''الاعتصام'' کے لیے کچھ لکھوں گا۔

جو وقت آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ وہ بہت تنگ ہے۔ میرے حالات پچھلے آٹھ برس سے ایسے ہیں کہ کبھی اپنے اخبار یا رسالے کے لیے بھی چار سطریں لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ صبح وشام اسفار۔ اس وقت بھی تین روز کے سفر پر جا رہا ہوں۔ لکھنے پڑھنے کے لیے دماغ کو جس سکون اور یک سوئی کی ضرورت ہے، اس سے محروم ہوں۔ اس لیے بہت افسوس کے ساتھ معذرت پیش کروں گا کہ اس وقت تو مجبور ہی تصور فرمایے۔ ان شاء اللہ کسی فرصت میں لکھ پایا تو ضرور ارسال خدمت کروں گا۔

والسلام
آپ کا مخلص
محمد حفظ الرحمٰن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰۔ستمبر ۱۹۵۵ء

اس مکتوب میں انھوں نے اپنے جس رسالے کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے مراد ندوۃ المصنفین کا ماہانہ رسالہ برھان ہے اور اخبار سے مقصود جمعیت علماے ہند کا ترجمان روزنامہ الجمعیت ہے۔

الاعتصام کا حجیت حدیث نمبر فروری ۱۹۵۶ء شائع ہوا تھا جو ۳۰/۴ ۔۔۔۲۰ سائز کے ایک سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں حجیت واستناد حدیث کے موضوع پر پاکستان اور ہندوستان کے متعدد اصحاب علم اور ارباب قلم کے مضامین ومقالات شائع ہوئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری کا یہ مکتوب بھی اس میں شائع ہوا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی تقریریں سننے والوں کا کہنا ہے کہ وہ بڑی روانی سے بولتے اور نہایت موثر تقریر کرتے تھے۔ لاکھوں کا مجمع ان کے قابو میں ہوتا تھا۔ ہندوستان کے سابق وزیراعظم لال بہادر شاستری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی آواز کی بلندی اور بیان وکلام کے جوش کے ساتھ ساتھ معلوم ہوتا تھا کہ سامعین بھی ایک خاص جذبہ وجوش کے عالم میں بلندی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جب وہ آواز کو آہستہ کرتے تو احساس ہوتا تھا کہ حاضرین جلسہ نیچے کو اتر رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مجمع ان کی آواز کے زیروبم کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور ان کے جذبات مقرر کے جذبات کے ہم رکاب ہوتے تھے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک دفعہ بتایا کہ آزادی سے کئی سال پہلے لاہور میں دلی دروازے کے باہر میدان میں مولانا حفظ الرحمٰن تقریر کر رہے تھے۔ رات کا وقت تھا اور بہت بڑا مجمع ان کی تقریر سن رہا تھا۔ مولانا ندوی نے بتایا کہ وہ بھی اس جلسے میں حاضر تھے اور مجلس احرار کے مرحوم رہنما چودھری افضل حق بھی موجود تھے۔ لوگ ہمہ تن گوش پوری توجہ سے تقریر سن رہے تھے۔ چودھری افضل حق نے پنجابی میں کہا:

"یہ شخص جس جوش اور صفائی اور روانی سے بول رہا ہے اس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے۔ اللہ نے اس کو حیرت انگیز طور پر معلومات سے نوازا اور الفاظ کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا حفظ الرحمٰن ۱۰۔جنوری ۱۹۰۱ء (۱۹۔رمضان ۱۳۱۸ھ) کو سیوہارہ ضلع بجنور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ان کے محلے کا نام ''محلہ مولویاں'' تھا۔والد کا اسم گرامی مولوی حاجی شمس الدین صدیقی تھا جو اپنے علاقے کے اچھے خاصے زمیندار، بے حد نیک، خوش عقیدہ اور علمائے حق کے گرویدہ تھے۔ ریاست بھوپال اور ریاست بیکانیر میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر مامور رہے تھے۔ان کے چار بیٹے تھے۔

ایک مولوی فخر الدین جو ڈپٹی کلکٹر کے منصب تک پہنچے۔

دوسرے مولوی بدرالدین جنھوں نے وکالت پاس کی اور اپنے علاقے اور عہد کے بہت اچھے وکیل ہوئے۔

تیسرے مولوی صلاح الدین جنھیں علم طب پڑھایا گیا اور انھوں نے مولوی حکیم صلاح الدین کے نام سے شہرت پائی۔

چوتھے معزالدین تھے جن کو اللہ نے بڑی عزت وتکریم سے نوازا۔ان کا تاریخی نام ''حفظ الرحمٰن'' تھا اور یہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔

دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام بتول فاطمہ اور چھوٹی کا عظمت النساء تھا۔ بڑی کی شادی مولوی انوار الحسن نائب صوبے دار ریاست گوالیار سے اور چھوٹی کی حافظ محمد ابراہیم سے ہوئی تھی۔ یہ وہی حافظ محمد ابراہیم ہیں جو آزادی کے بعد ہندوستان کے وزیر آب پاشی و برقیات بنائے گئے تھے، اور صدر ایوب کے زمانے میں جب ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پاکستان کا دورہ کیا تھا تو نہری پانی کے سلسلے میں حکومت پاکستان سے گفتگو کرنے کی غرض سے حافظ محمد ابراہیم بھی ان کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کے والد مکرم نے تین بیٹوں کو دنیوی تعلیم دلائی اور وہ اس میں کامیاب رہے، لیکن چوتھے بیٹے (حفظ الرحمٰن) کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا۔اور وہ اس میں بھی کامیاب رہے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں دلائی، پھر مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد میں داخل کرا دیا، چند کتابیں وہاں پڑھیں۔اس کے بعد مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں چلے گئے اور اس زمانے کے درس نظامی کی تکمیل وہیں کی۔ یہ مرحلہ طے ہو چکا تو دارالعلوم دیوبند کا عزم کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وہاں مولانا انور شاہ کاشمیری اور دیگر اساتذہ سے استفادے کے مواقع میسر آئے۔ دیو بند سے فراغت کے بعد وہیں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔

ان کے وعظ وتقریر کی اثر انگیزیوں کی شہرت عالم جوانی ہی میں دور دراز علاقوں میں پہنچ گئی تھی اور لوگ بڑے شوق سے ان کی تبلیغی جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

۱۹۱۸ء یعنی اٹھتی جوانی میں انھوں نے سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی بے پناہ سرگرمیوں کی بنا پر بہت جلد ملک کے معروف وممتاز رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

اس زمانے کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا جذبہ بڑا تیز تھا۔ مدراس کے رؤسا وامرا کی اس باب میں دلچسپیاں خاص طور سے مشہور تھیں۔ وہاں ایک بزرگ سیٹھ یعقوب سکونت پذیر تھے۔ انھوں نے مولانا ممدوح سے مدراس تشریف لے جانے اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرنے کی درخواست کی، چناں چہ اپنے اساتذہ کے مشورے سے ۱۹۲۶ء میں وہ یہ خدمت سرانجام دینے کے لیے مدراس چلے گئے اور کچھ مدت وہاں فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہے۔

۱۹۲۸ء میں دارالعلوم (دیو بند) کے انتظامی معاملات میں شدید کش مکش کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے نتیجے میں مولانا انور شاہ کاشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے وہاں کی سکونت ترک کر کے ڈابھیل جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان بزرگان گرامی قدر کے ساتھ جن لوگوں نے رخت سفر باندھا ان میں مولانا بدر عالم میرٹھی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات کی یہ جوانی کا زمانہ تھا اور یہ مولانا انور شاہ کاشمیری کے لائق وذہین شاگرد تھے جو اس وقت مدرسین کی جماعت میں شامل ہو چکے تھے۔ ڈابھیل وہ گوشہ عزلت تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن اور ان کے رفقائے کرام کی صلاحیتوں میں بڑا اضافہ ہوا اور انھوں نے وہاں خوب تن دہی سے کام کیا۔

۱۹۳۴ء میں مولانا حفظ الرحمٰن کلکتے چلے گئے اور دو سال وہاں اقامت گزیں رہے۔ وہاں انھوں نے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک مستقل تصنیفی ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا۔ ساتھ ہی ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا، جس کا نام برہان رکھا گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۳۸ء میں انھوں نے دہلی میں ’’ندوۃ المصنفین‘‘ کے نام سے تصنیفی ادارہ قائم کیا، جس کا دفتر فیض روڈ (قرول باغ) کی ایک بہت بڑی کوٹھی میں تھا۔ ندوۃ المصنفین کا قیام مندرجہ ذیل حضرات کی رفاقت سے عمل میں آیا تھا۔

۱۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی: رفیق اعلیٰ

۲۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی: ناظم ندوۃ المصنفین

۳۔ مولانا بدر عالم میرٹھی: رفیق

۴۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی: رفیق و ایڈیٹر ماہنامہ ’’برہان‘‘

۵۔ مولانا حامد الانصاری غازی: رفیق

۶۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی: رفیق

یہ اصحاب ستہ یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ان میں سب سے بعد میں سفر آخرت اختیار کرنے والے قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی تھے، جنھوں نے تصنیفی خدمات بھی انجام دیں، میرٹھ کی شاہی مسجد کا منصب خطابت بھی سنبھالے رکھا اور جامعہ ملیہ دہلی میں مسند تدریس پر فائز رہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن غالباً ۱۹۵۵ء میں لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کی ایک کتاب کراچی کے ایک ناشر نے چھاپ لی تھی۔ میں اس وقت اخبار ’’الاعتصام‘‘ کا ایڈیٹر تھا اور میں نے ان کے حق میں لکھا تھا، پھر ناشر نے ان کو کراچی آنے کی دعوت دی اور انھیں کتاب چھاپنے کی رائلٹی دی۔ اس سلسلے میں ’’الاعتصام‘‘ کے دفتر تشریف لا کر ازراہ سارا واقعہ بیان کیا اور فرمایا: ’’میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے اخبار میں لکھ کر میری مدد کی۔‘‘ وہ بھلا زمانہ تھا۔ اخبار میں لکھنے سے لوگوں کا کام ہو جاتا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے اس تصنیفی ادارے میں بڑی محنت اور انہماک وتوجہ سے کام کا آغاز کیا اور محققانہ کتابیں تصنیف کیں، جن کا مختصر الفاظ میں یہاں تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱۔ قصص القرآن: یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور کم وبیش دو ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہر جلد کے مشمولات کچھ اس قسم کے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جلد اول: اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کے انبیائے کرام کے واقعات وحالات معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔

جلد دوم: حضرت یوشع علیہ السلام سے حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے سوانح حیات اوران کی دعوت وتبلیغ کی مکمل تفصیل اس جلد میں بیان کردی گئی ہے۔

جلد سوم: اس جلد میں بعض انبیائے کرام کے سوانح زندگی کے علاوہ متعدد دیگر واقعات قرآنی بیان کیے گئے ہیں، مثلاً اصحاب کہف ورقیم، اصحاب القریہ، اصحاب السبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور قوم یہود، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجنہ، ذوالقرنین اور سد سکندری۔ علاوہ ازیں سبا اور سیل عرم وغیرہ کا محققانہ اور مؤرخانہ اسلوب میں ذکر کیا گیا ہے۔

جلد چہارم: یہ جلد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرتوں کے بیان پر محیط ہے جو قرآن مجید کی روشنی میں ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں۔ اس جلد میں بعض دیگر مباحث بھی آگئے ہیں۔

قصص القرآن اپنے موضوع کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس کی بہت بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ ہر مقام پر اسلاف کے نقطہ نظر کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے اور قرآن کے بعض قصص وواقعات پر جن لوگوں نے کوئی اعتراض کیا یا غلط تاویل سے کام لیا ہے، اس کا دلائل سے جواب دیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہے جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

۲۔ **اسلام کا اقتصادی نظام:** محنت اور سرمایہ کی یا مزدور اور سرمایہ دار کی کش مکش کسی نہ کسی صورت میں یوں تو ہمیشہ جاری رہی ہے، مگر چند سالوں سے اس میں زیادہ ہی شدت پیدا ہوگئی ہے اور اس سلسلے میں سیاسی اور اقتصادی خطوط پر بہت سے مسائل ابھر آئے ہیں، جنھوں نے ساری دنیا کو ایک قسم کے میدان جنگ میں لا کھڑا کیا ہے۔

مولانا حفظ الرحمن نے اس موضوع پر بہت ہی احتیاط اور توازن کے ساتھ اظہار خیال فرمایا ہے۔ انھوں نے اس بنیادی مسئلے میں اسلامی احکام کی بھی وضاحت کی ہے اور موجودہ نظاموں کو بھی پیش نگاہ رکھا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو میں اس موضوع کی یہ ایک جامع اور مدلل کتاب ہے۔

۳۔ **اخلاق اور فلسفہ اخلاق:** اخلاقیات کو اسلام کے جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی میں ایک اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔مولانا سیوہاروی نے اس ضخیم کتاب میں اس موضوع پر بسط وتفصیل سے بحث کی ہے۔اس میں سابق انبیاے کرام کے اقوال وارشادات اور عمل وکردار کا تذکرہ بھی کیا ہے، اسلام کے احکام بھی بیان کیے ہیں اور حکماے اسلام نے اخلاقیات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کی تفصیل بھی درج کی ہے، مثلاً امام رازی، امام غزالی، مولانا رومی، حافظ ابن قیم، شیخ سعدی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ ہم نے جس نہج سے اس مسئلے کو ہدف نظر ٹھہرایا ہے، اس کی صاف ستھرے انداز میں وضاحت کی ہے۔

۴۔ **البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین:** اس کتاب میں فاضل مصنف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خطوط ومکاتیب جمع کردیے ہیں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کے امراوسلاطین کے نام تحریر فرمائے۔فاضل مرتب نے ان کا پس منظر اور ضروری تشریحات اس طرح پیش کی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق دعوت وتبلیغ نکھر کر قارئین کے سامنے آجائے اور علماو مبلغین اسے اپنے لیے اسوہ اور نمونہ بنا سکیں۔

۵۔ **نور البصر فی سیرۃ خیر البشر:** اس کتاب کا دوسرا نام ''سیرت رسول کریم'' ہے اور اسی نام سے معروف ہے۔اس میں نبی صلی اللہ علیہ سلم کی سیرت طیبہ بیان کی گئی ہے۔یہ کتاب انھوں نے قیام ڈابھیل کے زمانے میں لکھی تھی۔

۶۔ **حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان:** یہ بعض فقہی مسائل سے متعلق مناظرانہ رنگ کی کتاب ہے جو انھوں نے ابتدائی زمانے میں لکھی تھی اور ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) میں یٹیین پریس مدارس میں چھپی تھی۔اب یہ کتاب نایاب ہے، البتہ ہمارے محترم دوست جناب محمد عالم مختار حق صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔لیکن اس کتاب کی تصنیف کے فوراً ہی بعد مولانا حفظ الرحمٰن فرقہ وارانہ نزاعات سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی تدریس کا زمانہ ۱۹۳۸ء میں ختم ہوگیا تھا اور اس کے بعد انھوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔یہ سلسلہ صرف دس سال (۱۹۴۸ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک) چلا۔ اس کے بعد حالات یکسر بدل گئے اور انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

وہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر (۱۹۱۸ء) میں سیاست کے میدان میں اترے، پھر تمام زندگی اس دشت کی سیاحی میں گزار دی۔ آزادی سے قبل حریت وطن کی تحریکوں میں ان کا بہت بڑا کردار ہے۔ وہ کئی سال ملک کی مختلف جیلوں میں قید رہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر مصائب کے جو لگاتار ریلے آئے ان سے وہ انتہائی متاثر ہوئے۔ جہاں ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کو کوئی تکلیف پہنچی، وہاں ان کا جانا اور مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہونا ضروری قرار پایا۔ ان کا زیادہ تر وقت سفر میں گزرتا تھا۔ وہ جمعیت علماے ہند کے ناظم اعلیٰ، ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر، اپنے ملک کے ممتاز مذہبی وسیاسی رہنما اور سب کے ہم درد و خیر خواہ تھے۔

ہمارے دوست اسماعیل ضیا (سابق ایم۔ پی۔ اے) جو گوجراں والا سے تعلق رکھتے تھے، ۱۹۶۰ء میں دہلی گئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی کی جامع مسجد اور اس کے ارد گرد کے علاقے میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اس کے اظہار کے لیے وہ جمعیت علماے ہند کے دفتر گئے اور مولانا حفظ الرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابتدائی رسمی کلمات کے بعد عرض کیا: ''مولانا! یہاں مسلمانوں کی حالت۔۔۔''

مولانا نے اس سے آگے کچھ بولنے نہیں دیا اور واقعتاً ہاتھ جوڑ کر فرمانے لگے۔ بھائی! خدا کے لیے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجیے۔ اگر ہمارے لیے کچھ ہم دردی آپ رکھتے ہیں تو جا کر اپنی حکومت سے کہہ دیجیے کہ ہندوستانی مسلمانوں، بالخصوص نوجوانوں کے لیے پاکستان کے بارڈر بند کر دے۔ یہاں سے جو مسلمان نوجوان کسی بھی شعبے میں تعلیم حاصل کرتا ہے، وہ پاکستان کا رخ کرتا ہے۔ وہاں پہلے سے کسی کا خالو، کسی کا ماموں، کسی کا چچا یا پھوپھا کسی اچھے عہدے پر موجود ہے۔ اس کو اپنی نوجوان لڑکی کے لیے رشتہ درکار ہے اور ہندی مسلم نوجوان کو اچھا روزگار۔۔۔ ہندوستان سے مسلم نوجوان پاکستان چلے جاتے ہیں۔ دونوں کی مراد بر آتی ہے۔ ہندوستانی نوجوان کو ملازمت کے ساتھ اچھے خاندان کی لڑکی بطور بیوی مل جاتی ہے۔ ادھر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستانی افسر کو تہذیب وتمدن کے اعتبار سے اپنے ہی رنگ میں رنگا ہوا داماد ہاتھ میں آجاتا ہے۔

''ان حالات میں آپ کو ہندوستان میں ٹھیلے والے، کباب والے اور بے روزگار نوجوان ہی ملیں گے۔۔۔ پھر سوچیے یہاں مسلمانوں کی بہتری کے لیے جدوجہد کون کرے گا؟''

تھوڑی دیر مجلس میں کچھ خاموشی رہی اسماعیل ضیا نے مولانا سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو آپ کی تصویر اتار لی جائے۔ فرمایا: ''اتار لو بھائی تصویر۔'' پھر وہ وہاں سے چلنے لگے تو فرمایا: ''مولانا اسماعیل صاحب کو اور مولانا عبدالواحد صاحب کو میرا سلام کہنا۔'' ضیا صاحب نے کہا: ''آپ کے ایک اور ساتھی بھی گوجراں والا میں رہتے ہیں ان کو آپ نے سلام نہیں کہا۔'' فرمایا: ''کون؟'' ضیا صاحب نے جواب دیا: ''مولانا محمد چراغ؟'' فرمایا: ''وہ ہمارے کام کے نہیں رہے۔''

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے یہ اس لیے کہا کہ مولانا محمد چراغ مرحوم جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے تھے، اور جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جمعیت علماے ہند اور انگریزی حکومت سے آزادی کے حصول کی جنگ لڑنے والوں کی شدید مخالفت کی تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن سنجیدہ فکر اور پُر خلوص ذہن کے عالم دین اور سیاست دان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ان پر انتہائی اعتماد کرتے تھے۔ سیاسی معاملات کے علاوہ دینی اور مذہبی معاملات میں بھی اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں کہیں جھگڑا پیدا ہو جاتا تو مولانا آزاد عام طور سے فریقین کو ان کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے اور خود مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی اس قسم کے جھگڑے نمٹانے کی طرف توجہ دلاتے۔ اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

یوپی کے شہر مراد آباد کے اہل حدیث اور احناف میں بعض مسائل سے متعلق اختلاف کی وجہ سے نزاع پیدا ہوگیا تھا۔ مولانا ابومسعود قمر بنارسی نے ۵۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو حضرت مولانا آزاد کی خدمت میں ایک خط لکھا اور رفع نزاع کے لیے ان سے مشورہ طلب کیا۔

مولانا آزاد نے ان کو جواب دیا کہ آپ کا خط مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو بھیج دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ان سے گفتگو کی جارہی ہے۔ مولانا آزاد نے ان کو لکھا کہ ''مولوی حفظ الرحمٰن اور دیگر ارکان جمعیت العلما اگرچہ حنفی المسلک ہیں اور دیوبندی ہیں اور اپنے تشدد میں دوسروں سے کم نہیں ہیں، لیکن وہ ایک لمحے کے لیے پسند نہ کریں گے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہل حدیث سے نزاع وجدال رکھیں یا انھیں مساجد سے روکیں۔ شرک اور بدعی رسوم کی مخالفت میں بہرحال وہ اہل حدیث سے قریب ہیں، اس لیے یہ اندیشہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے دانستہ کوتاہی ہوگی۔''

یہ نزاع آمین بالجہر، رفع یدین اور تکبیرات عیدین وغیرہ کے بارے میں تھا۔ مولانا آزاد کا مقصد تھا کہ ''ایک مسجد میں دونوں فریق نماز پڑھیں، آمین بالجہر کرنے والے بھی اور آمین بالاخفا پر عمل کرنے والے بھی۔۔۔! جب تک یہ سلسلہ قائم نہیں ہوگا، فتنہ انگیزی کا دروازہ بند نہیں ہوگا''۔ مولانا کے نزدیک ''یہ عدالت کے فیصلے سے نہیں ہوسکتا، یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ علمائے احناف آگے بڑھیں اور قول وعمل سے اس کی تائید کریں۔''

مولانا ابومسعود قمر بنارسی کے خط کا ذکر آیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ مولانا ابومسعود قمر بنارسی کون تھے اور دراصل کہاں کے رہنے والے تھے۔ سنیے!

آج سے کم وبیش سوا سو سال قبل پنجاب کے ضلع گجرات کے ایک قصبے (کنجاہ) میں ہندوؤں کی کھتری برادری کے ایک شخص کا نام کھڑک سنگھ تھا۔ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام انھوں نے مول سنگھ رکھا۔ مول سنگھ نے کچھ تعلیم حاصل کی تو گوجراں والا میں پوسٹ ماسٹر کے طور پر ملازم ہوگئے۔ ملازمت کے دوران میں اسلام کا مطالعہ شروع کیا تو دل میں جذبۂ حق نے کروٹ لی اور اسلام کی تعلیمات پر غور کرنے لگے۔ اس اثنا میں کسی کام سے لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں مولانا عبیداللہ مالیرکوٹلوی سے ملاقات کا موقع ملا۔

مولانا عبیداللہ مالیرکوٹلوی ریاست پٹیالہ کے ایک مقام ''پایل'' میں منشی کوڑے مل کے گھر پیدا ہوئے تھے اور والدین نے ان کا نام اننت رام رکھا تھا۔ پھر وہ مسلمان ہوگئے تھے اور اپنا نام عبیداللہ رکھ لیا تھا۔ وہ بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کا ذریعہ بنے تھے۔ تحفۃ الھند کے نام سے انھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء میں فوت ہوئے۔

مول سنگھ نے ان کی گفتگو سنی تو بڑے متاثر ہوئے اور پہلی ہی ملاقات میں مول سنگھ سے محمد سعید ہوگئے۔ ان کے والد کھڑک سنگھ کو اس انقلاب ماہیت کا پتا چلا تو بھاگتے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گوجراں والا پہنچے اور بیٹے کو پکڑ کر سیدھے ہردوار لے گئے۔ دیکھ بھال کے لیے ان کے چھوٹے بھائی گوپال سنگھ بھی ان کے ساتھ تھے۔

اب محمد سعید کو دوبارہ حلقہ زنار میں کس دیا گیا تھا اور مول سنگھ کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ ہردوار میں انھیں مالا جپنے اور گائیں چرانے کا حکم ہوا۔ انھوں نے گائیں تو اپنے چھوٹے بھائی گوپال سنگھ کے حوالے کیں اور خود مالا لے کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم کا ورد شروع کر دیا۔ پھر موقعہ پا کر وہاں سے بھاگے اور دیوبند پہنچ گئے۔ وہاں کے دارالعلوم میں داخلہ لیا اور نصاب کے مطابق حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ وہاں علوم متعارفہ ومجوزہ کی تحصیل کی، لیکن کتب حدیث کا آغاز کیا تو بعض مسائل میں اساتذہ سے کچھ اختلاف ہوا اور تشریح احادیث میں ان کی رائے سے شاگرد کی رائے مطابقت نہ کر سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں سے نکال دیے گئے اور دہلی آ کر حضرت میاں سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ ان سے تفسیر وحدیث کی تکمیل کی اور سند سے بہرہ یاب ہوئے۔

کھڑک سنگھ کو بھی بیٹے کی سرگرمیوں سے دلچسپی تھی، چنانچہ جس زمانے میں وہ میاں صاحب سے تفسیر وحدیث کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، کھڑک سنگھ نے میاں صاحب کو خط لکھا کہ میں نے اپنے بیٹے کو نازونعمت سے پالا ہے، اس کو نظر عنایت میں رکھیے گا۔

یہ خط پڑھ کر میاں صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تکمیل علم کے بعد ان کو مولانا محمد ابراہیم آروی نے اپنے ہاں ''مدرسہ احمدیہ آرہ'' میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ کچھ عرصہ وہاں رہے۔ اس کے بعد بنارس تشریف لے گئے۔ وہاں اپنا مدرسہ جاری فرمایا۔ وہ بہت بڑے عالم وفاضل اور محقق ومصنف تھے۔ بنارس کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ۱۸۔ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ (۲۷۔ نومبر ۱۹۰۴ء) کو بنارس میں وفات پائی۔

مولانا ابومسعود قمر بنارسی انہی مولانا محمد سعید بنارسی کے فرزند ارجمند تھے۔۔۔ یہ غالباً پانچ بھائی تھے۔

۱۔ مولانا عبدالرحمٰن بنارسی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ مولانا محمد ابوالقاسم بناری۔

۳۔ مولانا ابومسعود قمر بناری۔

۴۔ قاری احمد سعید۔

۵۔ مولانا عبدالاخر۔

مولانا محمد سعید بنارسی کے یہ چاروں بیٹے بڑے لائق اور فاضل بزرگ تھے۔ ان میں سے مولانا ابومسعود قمر بناری اور قاری احمد سعید کے ساتھ میری خط وکتابت رہی ہے۔ میرے الاعتصام کے زمانۂ ادارت میں یہ دونوں بھائی اس کے خریدار اور قاری تھے اور مجھ سے ان کا سلسلۂ مراسلت جاری رہتا تھا۔

مولانا ابوالقاسم بنارسی نے ہندوستان کے علمی اور سیاسی حلقوں میں بہت شہرت پائی۔ ان کا تعلق کانگرس اور جمعیت علماے ہند سے تھا۔

انھوں نے ۲۵۔نومبر ۱۹۴۹ء (۴۔صفر ۱۳۶۹ھ) کو اپنے وطن بنارس میں وفات پائی۔

یہ چند باتیں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا ابومسعود قمر بنارسی کے سلسلے میں سطح ذہن پر ابھریں اور یہاں درج کردی گئیں تاکہ قارئین کرام ان حضرات سے تھوڑا بہت متعارف ہوسکیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے، آمین۔

آزادیٔ وطن کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، مسلسل محنت اور بھاگ دوڑ سے ان کی صحت بہت کمزور ہوگئی تھی۔ زندگی کے آخری دور میں انھیں پھیپھڑے کا سرطان ہوگیا تھا۔ وہ دہلی اور بمبئی کے ہسپتالوں میں ماہر معالجوں کے زیر علاج رہے۔ احباب اور مخلصین کے اصرار سے علاج کے لیے امریکہ بھی گئے، لیکن صحت یاب نہ ہوئے اور ۲۔اگست ۱۹۶۲ء (۳۰۔صفر ۱۳۸۲ھ) کو ان کا انتقال ہوگیا۔

انالله وانا اليه راجعون

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایم ایم شریف

(وفات ۱۱۔دسمبر ۱۹۶۵ء)

۲۱۔اکتوبر ۱۹۶۵ء کو جب میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوا، اس وقت ادارے کے اکیڈمک ڈائریکٹر ایم ایم شریف (میاں محمد شریف) تھے۔

رئیس احمد جعفری مرحوم مجھے میاں صاحب کے کمرے میں لے گئے اور کہا: ''یہ ہیں اسحاق صاحب، جن کے بارے میں کل آپ سے بات ہوئی تھی۔''

میاں صاحب کھڑے ہو کر نہایت تپاک سے ملے اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی میرے ساتھ بیٹھے۔اب ایک طرف وہ بیٹھے تھے۔دوسری طرف رئیس صاحب تھے اور درمیان میں میں بیٹھا تھا۔ مجھے آج پہلی مرتبہ میاں شریف صاحب سے ملنے، ان کی باتیں سننے اور ان سے ہم کلام ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔۔۔چھوٹی چھوٹی سفید مونچھیں، داڑھی صاف، گندمی رنگ، گول چہرہ، جس پر بڑھاپے کے آثار قابض ہو چکے تھے۔سر ننگا بالکل چاندی۔آنکھوں پر نظر کی عینک۔میانہ قد، انگریزی لباس میں ملبوس۔دھیمے اور میٹھے انداز میں بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔ذریعۂ اظہار اردو، لیکن لہجے میں پنجابیت کی جھلک۔۔۔!یہ تھے ایم ایم شریف۔!

فرمایا: ''رئیس صاحب اور دوسرے رفقائے ادارہ سے کل میں نے بات کی تھی کہ ہمیں ادارے میں ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو حدیث وفقہ سے تعلق رکھتا ہو اور اس موضوع کی مختلف کتابوں پر اس کی نظر ہو، انھوں نے فوراً آپ کا نام لیا اور میں نے ان سے کہا وہ آپ سے آج ہی رابطہ پیدا کریں اور یہاں آنے کے لیے کہیں، تاکہ میں آپ سے بات کرکے ادارے سے منسلک ہونے کی دعوت دوں۔میرے تمام ساتھیوں نے کہا ہے آپ ادارے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔''

اس قسم کی باتیں انھوں نے اس قدر نرمی سے کیں کہ مجھے شرم آنے لگی اور اپنے علم وفضل کا تمام ''سرمایہ'' جسے ''محدود'' کہنا بھی محدودیت کے منافی ہے، اکٹھا ہو کر آنکھوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ سوچا معلوم نہیں میاں صاحب اور دیگر رفقائے ادارہ کی توقع پر میں پورا اترتا ہوں یا نہیں، اس لیے کہ من آنم کہ من دانم۔ ہر شخص بشرطیکہ اپنے بارے میں بہت زیادہ خوش فہمی یا غلط فہمی کے مرض میں مبتلا نہ ہو، اپنی استعداد سے خوب آگاہ ہوتا ہے اور اس کے اندر سے ہر وقت آواز آتی رہتی ہے۔ ایاز قدر خود بشناس۔

میاں صاحب کی باتیں سن کر سوچنے لگا کہ انھیں کیا جواب دوں۔ ذہن پر زور ڈالا تو صرف یہ الفاظ سوجھے: ''میں عالم فاضل تو نہیں ہوں: البتہ اہل علم کی مجلسوں میں حاضر ہونے کا متمنی اور ان سے استفادہ کرنے کا خواہاں ہر وقت رہتا ہوں۔ اس لیے صرف یہی عرض کرسکتا ہوں کہ آپ نے میری جو ذمے داری بیان فرمائی ہے وہ میرے ذوق کے مطابق ہے اور اسے نباہنے کی پوری کوشش کروں گا۔ جس معاملے میں کوئی مشکل پیش آئے گی ادارے کے رفقائے کرام سے رجوع کروں گا، مجھے یقین ہے یہ حضرات میری رہنمائی فرمائیں گے۔'' میں نے سوچ سوچ کر اور ٹھہر ٹھہر کر فضا میں جھانکتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

میاں صاحب نے فرمایا: ''بس میں یہی چاہتا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ کام کرنے کی منظوری دے دیں۔''

رئیس صاحب میرے مہربان تھے۔ بولے: ''میاں صاحب ہم انھیں جانتے ہیں، یہ ہمارے لیے نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ بہت محنت اور توجہ سے کام کرنے والے آدمی ہیں۔''

اب میاں صاحب نے شفقت آمیز اسلوب میں فرمایا: ''اسحاق صاحب! ہم لیگل کمیٹی کے سب ارکان کو تین تین سو روپے ماہانہ دیتے ہیں، تین سو ہی آپ کو پیش کرسکیں گے۔''

اس کے بعد انھوں نے شیخ محمد منیر (مرحوم) کو بلایا، جو میرے پہلے سے واقف تھے اور کہا وہ مجھے نامۂ تقرری (Appointment Letter) لکھ دیں اور ٹائپ کر کے اس پر دستخط کرالیں۔

اب ساڑھے دس بج چکے تھے اور چائے کا وقت ہوگیا تھا۔ میاں صاحب نے سب رفقائے ادارہ کو بلایا اور معمول کے مطابق ان کے کمرے میں چائے پی گئی۔ چائے کے دوران میاں صاحب نے ان سے کہا: ''اسحاق صاحب آج سے ہمارے ساتھ ادارے میں کام کریں گے۔''

یہ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے، جس پر ۴۲ برس کا طویل عرصہ بیت چکا ہے۔ اس کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بتیس برس ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ رہا اور بحمد للہ اپنے محدود علم ومطالعہ کے مطابق خدمات سرانجام دیتا رہا۔ نہ اس وقت علم کا کوئی زعم تھا، نہ اب ہے۔ اس وقت بھی طالبِ علم تھا، اب بھی طالب علم ہوں اور روز بروز طلبِ علم کی خواہش بڑھتی جاتی ہے۔ بس یہی میرا سرمایۂ علم ہے۔

وہ ایوب خاں کا عہد حکمرانی تھا اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر ایم ایم شریف صاحب سے رابطہ کر کے اس وقت کی مرکزی حکومت کے وزیر قانون نے ادارے میں ایک ایسا شعبہ قائم کیا تھا، جس کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ وراثت، حضانت، طلاق، خلع، ہبہ، شفعہ وغیرہ مسائل پر قرآن وحدیث اور فقہ کی روشنی میں غور کرے اور اپنی کارکردگی کی اطلاع ہر مہینے حکومت کو دے۔ اس سے پہلے عائلی قوانین نافذ ہو چکے تھے، لیکن اس شعبے کو ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسے اپنی تحقیق کے مطابق کام کی رفتار کو آگے بڑھانا تھا۔ اس میں حکومت کے نافذ کردہ عائلی قوانین کے کسی حصے کی مخالفت ہوتی ہو یا موافقت، اس سے قطعاً کوئی غرض نہ تھی۔

اس شعبے کا نام لیگل کمیٹی تھا۔ اس میں دو بیرسٹر (عبدالشکور سلام اور چودھری محمد عارف) ایک ڈاکٹر سخاء اللہ (جنھوں نے عربی کے کسی موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھی) اور ایک شاہ محمد جعفر پھلواروی کام کرتے تھے۔ پانچواں مجھے رکھا گیا تھا۔ شاہ صاحب لیگل کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ پیر، منگل، بدھ، یعنی ہفتے میں تین دن شام کو پانچ بجے کے بعد ہماری میٹنگ شروع ہوتی تھی اور تین گھنٹے جاری رہتی تھی۔ بڑا عجیب دور تھا۔ میٹنگ میں علمی باتوں کے ساتھ ساتھ لطیفوں اور شعروشاعری کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ جناب عبدالشکور سلام صاحب بعد میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور پھر سپریم کورٹ کے جج ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان وفاقی محتسب مقرر کیے گئے۔ چودھری محمد عارف ہائی کورٹ کے جج ہوئے اور بعدازاں سپریم کورٹ کے جج بنائے گئے۔ ان سے کبھی ملاقات کا موقع ملتا ہے تو اکتالیس برس پہلے کے واقعات پر بھی گفتگو ہوتی ہے لطائف وظرائف کا سلسلہ بھی چلتا ہے اور ادب وشعر کا معاملہ بھی زیر بحث آتا ہے، بالکل اسی طرح بے تکلفی سے باتیں ہوتی ہیں، جس طرح اس دور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ہوتیں تھیں۔

میاں شریف صاحب عادات واطوار میں اسم بامسمیٰ تھے اور خاص طور سے میرے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوشی کی بات یہ ہے کہ علمی معاملات میں انھوں نے مجھ پر جلد ہی اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آتے ہی اس کی لائبریری سے رسم وراہ پیدا کر لی تھی اور مختلف موضوعات کی کتابیں دیکھتا رہتا تھا۔ شام کی میٹنگ کے لیے بھی مجھے زیر بحث مسئلے سے متعلق مواد اکٹھا کرنا ہوتا تھا۔ میاں صاحب اکثر مجھے لائبریری میں کچھ نہ کچھ پڑھتے اور کسی نہ کسی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ اس سے انھیں غلط فہمی یا خوش فہمی ہوئی کہ میں ''صاحب نظر عالم'' ہوں۔ اس اعتبار سے تو میں واقعی ''صاحب نظر'' تھا کہ کتابیں مجھے نظر آ رہی تھیں اور ''عالم'' بھی تھا کہ مجھے علم تھا کہ الماریوں میں یہ کتابیں پڑی ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ وہی تھا جو تھا اور اب تک وہی ہوں جو ہوں۔

ایک دن میں لائبریری میں بیٹھا تھا کہ دفتر کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: میاں صاحب آپ کو ٹیلی فون پر یاد کر رہے ہیں۔

میں نے تعجب سے پوچھا: ''ٹیلی فون پر؟ وہ تو تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے میں تھے۔''

اس نے کہا: چند منٹ پیشتر وہ کہیں باہر چلے گئے تھے۔ وہیں سے آپ کو ٹیلی فون کیا ہے۔

میں ٹیلی فون پر گیا تو آواز آئی۔ ''میں شریف بول رہا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے کارپوریشن کے دفتر ٹاؤن ہال آیا تھا، وہیں سے آپ کو ٹیلی فون کیا ہے۔ آپ یہ بتائیے۔ الفہرست کوئی کتاب ہے؟''

اسے حسن اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ مجھے معلوم تھا الفہرست نام کی ایک کتاب ہے اور یہ بھی پتا تھا کہ کس موضوع کی ہے اور کس کی تصنیف ہے۔ اب میرے اور میاں صاحب کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:

الفہرست نام کی کوئی کتاب ہے؟''

جواب دیا: ''جی ہاں! الفہرست کتاب ہے۔''

''کس زبان میں ہے؟''

''عربی زبان میں!''

''ہماری لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے؟''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''جی نہیں، ہماری لائبریری میں نہیں ہے۔''

''کس موضوع کی کتاب ہے؟''

''یہ کتاب بہت سے موضوعات وعنوانات پر محیط ہے۔ آپ اسے علوم وفنون اور تصنیفات ومصنفین کے انسائیکلوپیڈیا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔''

''کس کی تصنیف ہے؟''

''محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق کی۔''

''یہ کس دور کا شخص ہے؟''

''چوتھی صدی ہجری کا۔''

''اس کا اصل وطن کون سا تھا؟''

''بغداد۔''

''آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟''

''جی نہیں!''

''اس کا اردو میں ترجمہ ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔''

''آپ ترجمہ کر سکیں گے؟''

''اس سوال کا جواب تو کتاب اچھی طرح دیکھ کر ہی عرض کر سکتا ہوں۔''

جب ان کے سوالات ختم ہو گئے تو میں نے پوچھا: ''آپ کو اس کتاب اور اس کے بارے میں اتنی معلومات کی کیا ضرورت پیش آئی؟''

فرمایا: ''میں یہاں ایک کام سے آیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ایک دوست کے کمرے میں آیا جو کارپوریشن میں ایک اچھے خاصے منصب پر فائز ہیں اور علم اور اہل علم سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اثنائے گفتگو میں الفہرست کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کا اردو ترجمہ کرا کے ادارہ ثقافت اسلامیہ کو شائع کرنا چاہیے۔''

تقریباً پون گھنٹے کے بعد میاں صاحب دفتر آئے اور مجھے یاد فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو کہا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ کہیں سے یہ کتاب تلاش کرو اور لائبریری کے لیے خرید لو۔ شام کو میں لوہاری دروازہ کے اندر شیخ مبارک علی کی دکان پر گیا اور شیخ احمد علی سے اس کتاب کے بارے میں پوچھا، کتاب ان کے پاس موجود تھی جو میں نے پچیس روپے میں خرید لی۔ مصر کی چھپی ہوئی تھی۔ کتاب گھر لے گیا اور رات کو اس کے مختلف مقامات دیکھتا رہا۔ پتا چلا کہ اکثر مقامات خالصتاً فنی نوعیت کے ہیں اور بہت مشکل ہیں اور ساتھ ہی انتہائی مختصر بھی ہیں۔ دوسرے دن کتاب میاں صاحب کو دکھائی تو فرمایا: اس کا ترجمہ شروع کر دو۔

یہ نومبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میں نے ترجمہ شروع کر دیا۔ بے شمار مقامات پر حواشی لکھے اور اشاریہ بنایا۔ ترجمہ، حواشی، اشاریہ، کتابت پروف ریڈنگ اور طباعت کے مراحل ساڑھے تین سال میں طے ہوئے، جب کہ میاں صاحب کی وفات پر بھی اتنا ہی عرصہ گزر چکا تھا۔ جون ۱۹۶۹ء میں کتاب شائع ہوئی جو کم وبیش ساڑھے نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

میاں صاحب کے متعلق چند اور باتیں سنانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ آیئے یہ باتیں بھی سن لیجیے۔ میرے علاوہ نہ کوئی میاں صاحب پر لکھے گا اور نہ یہ باتیں کسی کے علم میں آئیں گی۔

ہماری لیگل کمیٹی کی میٹنگ کبھی نماز مغرب سے پہلے کبھی بعد میں شروع ہوتی تھی اور کافی دیر جاری رہتی تھی۔ بعض دفعہ مغرب کے بعد میاں صاحب بھی تشریف لے آتے اور زیر بحث موضوع سے متعلق ہماری باتیں سنتے۔ وہ کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ السلام علیکم کہہ کر بیٹھ جاتے اور اپنے آپ کو صرف سماع تک محدود رکھتے۔ ان کی آمد پر ہم احتراماً کھڑے ہونے کی کوشش کرتے، لیکن وہ روک دیتے اور قبل اس کے کہ ہم کھڑے ہوں وہ بیٹھ جاتے۔ فرماتے: آپ اپنی گفتگو جاری رکھیں تکلف میں نہ پڑیں۔

ان کی عادت تھی کہ جس دن آتے، ہمارے لیے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز لے آتے۔ ایک دن گنڈیریاں لے کر آئے۔ بولے: ''میں بوڑھا آدمی ہوں، میرے دانت کام نہیں کرتے اور گنڈیریاں کھا نہیں سکتا، آپ حضرات کے لیے لایا ہوں۔'' کسی دن مونگ پھلی، کسی دن چلغوزے اور کسی دن ریوڑیاں لے آتے۔ مونگ پھلی اور چلغوزے کھانے میں خود بھی شرکت کرتے، البتہ ریوڑیاں نہیں کھا سکتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ آئے اور بیٹھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں جہاں انھوں نے خیال کیا کہ پہلی بات ختم ہوگئی ہے اور نئی شروع ہونے والی ہے، فرماتے: بس آج اتنا ہی کافی ہے۔ اب باتیں کرو اور کچھ لطیفے سنو اور کچھ سناؤ۔ انھیں لطیفے سننے کا بھی شوق تھا اور سنانے کا بھی۔

ایک دن اچانک تشریف لائے اور آتے ہی ہمارا سلسلۂ کلام ختم کرادیا۔ کچھ پرانی باتیں سنانے لگے۔ اثنائے کلام میں سر فضل حسین کا ذکر آگیا۔ وہ بھٹی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ میاں صاحب نے کہا: ''فضل حسین میں رنگڑوں کی سی اکڑفوں تھی اور یہ عادت اس برادری میں پائی جاتی ہے، جس سے ان کا تعلق تھا۔ پھر فوراً پینترا بدلا اور بولے ''لیکن اسحاق صاحب سے معذرت چاہتا ہوں، وہ رنگڑ نہ تھے، بھٹی راجپوت تھے اور ہر برادری میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھائی یا برائی کو کسی خاص برادری کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔''

ادارہ ثقافت اسلامیہ کی موجودہ بلڈنگ ۱۹۵۰ء میں جب ادارے کے نام الاٹ ہوئی، ایک منزلہ تھی۔ خلیفہ عبدالحکیم کے زمانے میں یک منزلہ ہی رہی۔ میاں محمد شریف کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے ۱۹۶۱ء میں اس پر دو منزلیں اور تعمیر کرائیں اور یہ عمارت تین منزلہ ہوگئی۔ اس کے علاوہ بہت بڑا اسٹور تعمیر کرایا تاکہ اس میں ادارے کی مطبوعات خاص ترتیب اور سلیقے سے رکھی جائیں۔

میاں صاحب نے ادارے میں تنخواہوں کے متعلق سرکاری قواعد وضوابط کے مطابق گریڈ سسٹم شروع کیا۔ ہاؤس رینٹ، میڈیکل ایڈ، کنوینس الاؤنس وغیرہ باقاعدہ دیا جانے لگا۔ بنیادی تنخواہ میں پراویڈنٹ فنڈ جاری ہوا اور گریڈ کے مطابق سالانہ ترقیاں ہونے لگیں۔

یوں تو میاں صاحب تمام رفقائے ادارہ کا احترام کرتے اور ہر شخص کی خوبیوں کے معترف تھے، لیکن شاہ محمد جعفر پھلواروی اور رئیس احمد جعفری سے بالخصوص تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مولانا حنیف ندوی اور شاہد حسین رزاقی سے مراسم وتعلقات کی نوعیت قدرے مختلف تھی۔ بشیر احمد ڈار صاحب سے معاملہ خاموشی کا سا تھا۔ فرمایا کرتے تھے ندوی صاحب بہت مشکل زبان لکھتے ہیں۔

ان کی اردو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ شاہ صاحب اور جعفری صاحب کی زبان آسان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جو بلا تکلف پڑھی اور سمجھی جا سکتی ہے۔

میاں صاحب کا اصل موضوع فلسفہ تھا، مولانا بھی فلسفی تھے اور میاں صاحب کے پیشرو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بھی فلسفے کے بہت بڑے عالم تھے، لیکن ان میں ایک فرق تھا۔ میاں صاحب کا تعلق جدید مغربی فلسفے سے تھا۔ عربی کتابوں کے قدیم فلسفے سے انھیں چنداں لگاؤ نہ تھا۔ خلیفہ صاحب اور مولانا حنیف ندوی کا فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدید دونوں سے برابر کا تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب فلسفے کی قدیم عربی کتابوں اور ان کے مصنفین سے پوری طرح آگاہ تھے اور ان کے ناموں کا صحیح تلفظ کرتے تھے، جب کہ میاں صاحب ان میں سے بعض کا صحیح تلفظ نہیں کر پاتے تھے۔ مثلاً وہ ابن تیمیہ کو ''ابن تیمیہ'' بکسرت کہتے تھے، جس پر کئی دفعہ ''ابن تیمیاں'' کا شبہ گزرتا تھا۔ جب وہ یہ لفظ بولتے۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے، لیکن اپنے لائق تکریم معمر ڈائریکٹر کو صحیح لفظ نہ بتا سکتے۔ یہ جرأت کا کام تھا اور ایک خاص قسم کا حجاب سا تھا جو اظہار سے روکتا تھا۔ ہم کئی مرتبہ ان کے سامنے ''ابن تیمیہ'' بفتح ت کہتے تاکہ وہ تصحیح کر لیں، لیکن انھوں نے اس پر کبھی غور نہیں فرمایا۔

ایک دن رئیس صاحب نے کہا کہ اگر انھوں نے اب لفظ تیمیہ بولا تو میں کہہ دوں گا آپ اس کا تلفظ غلط کرتے ہیں۔ صحیح تلفظ یہ ہے۔ میں نے عرض کیا، اس تلفظ نے ان کی زبان پر اس قدر غلبہ پا لیا ہے کہ ان کے نزدیک یہی صحیح ہے۔ اگر انھوں نے یہ سمجھ بھی لیا کہ وہ غلط بولتے ہیں، تو بھی ان کی زبان پر صحیح لفظ نہیں آئے گا۔ جس طرح وہ کام چلا رہے ہیں چلانے دیجیے۔

ان دنوں مولانا حنیف ندوی عقلیات ابن تیمیہ لکھ رہے تھے۔ ایک روز میاں صاحب نے ان سے کہا جتنے صفحات لکھے جا چکے ہیں، وہ آپ کتاب کے لیے کاتب کو دے دیجیے۔ لکھتے بھی جایئے اور ساتھ ساتھ کتابت بھی کراتے جایے تاکہ ادھر مسودہ ختم ہو اور ادھر کتابت مکمل ہو جائے۔ مولانا مسودہ کاتب کو دینے لگے تو اس پر میاں صاحب کی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے چند مقامات سے مسودہ پڑھا تو بولے: ''اس کی زبان بہت مشکل ہے۔ اسے کون سمجھے گا۔''

مولانا نے قدرے خفگی سے فرمایا: ''ضروری نہیں کہ جس چیز کو آپ نہ سمجھ سکیں اسے کوئی بھی نہیں سمجھ سکے گا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میاں صاحب مولانا کی بہت عزت کرتے تھے اور لوگوں کے سامنے ان کو اپنے عہد کے بہت بڑے عالم و محقق قرار دیتے تھے، لیکن محفل کو ذرا متحرک رکھنے کے لیے مولانا سے کوئی نہ کوئی ایسی بات بھی کہہ دیتے تھے جس سے وہ کسی قدر طیش میں آجاتے تھے، چناں چہ عقلیات ابن تیمیہ کا مسودہ دیکھتے ہوئے میاں صاحب نے ان سے کہا: ''اس کے کتنے ہی مقامات میری سمجھ میں نہیں آئے۔'' اس وقت رئیس صاحب اور شاہ صاحب بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا۔ میاں صاحب نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بائیں آنکھ سے اشارہ کیا اور مولانا سے کہا: ''ندوی صاحب اگر آپ یہ کتاب آسان زبان میں لکھ دیتے تو کیا حرج تھا؟''

مولانا جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، یہ الفاظ سن کر اور غصے میں آگئے۔ ان دنوں میاں صاحب کے کہنے پر جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے ایک کتابچہ لکھا تھا، جس کا نام تھا ''بچے پالنا''۔

مولانا نے فرمایا: ''اب میں ایک آسان کتاب لکھوں گا، جس کا نام ہوگا ''مرغی پالنا''۔

میاں صاحب موڈ میں تھے بولے: ''یہ کتاب بھی آپ آسان زبان میں نہیں لکھ سکیں گے۔'' ساتھ ہی کہا: ''میں شبلی کو سمجھ لیتا ہوں، ابوالکلام کو سمجھ لیتا ہوں، سید سلیمان ندوی کو سمجھ لیتا ہوں، آپ خدا جانے کس زبان میں لکھتے ہیں، میں اسے پڑھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔''

مولانا نے فرمایا: ''میں وہی زبان لکھتا ہوں جو شبلی، ابوالکلام اور سید سلیمان ندوی کی ہے۔ افسوس ہے، میرے پاس نہ علم کے انجکشن ہیں، نہ اردو سمجھنے کے جو آپ کو لگا سکوں۔''

میاں صاحب نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پھر آنکھ سے اشارہ کیا اور کہا: ''میں اردو خوب سمجھتا ہوں، طویل عرصے تک علی گڑھ رہا ہوں اور وہاں میرا تعلق اردو بولنے والوں سے تھا۔'' مولانا نے کہا علی گڑھ رہنے سے کیا ہوتا ہے، وہاں تو جاہل بھی رہتے ہیں اور اردو بولتے ہیں۔ اردو صرف بولنے سے نہیں آتی، پڑھنے سے آتی ہے اور پڑھنے کی آپ کو عادت نہیں۔''

میاں صاحب نے دوران گفتگو میں ہماری طرف دیکھتے ہوئے دوسری دفعہ آنکھ ماری تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

پلا مار کے بجھا گئی دیوا
اکھ نال گل کر گئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میاں صاحب ہنس پڑے۔ رئیس صاحب اور شاہ صاحب پنجابی کا یہ لوک گیت سمجھ نہیں پائے۔ مولانا خاموش ہو گئے۔ (یعنی میری محبوبہ آئی، دوپٹے کے پلو سے دیا بجھایا اور مجھے آنکھ سے اشارہ کیا کہ ادھر آؤ)

میاں صاحب کبھی موج میں ہوتے تو اس قسم کی باتیں شروع کر دیتے تھے۔ ایسے مواقع پر وہ دوسرے کی بات پر اگرچہ کتنی ہی سخت ہوتی، خفا نہیں ہوتے تھے۔ جس طرح وہ خود کھل کر بات کرتے تھے، اسی طرح دوسرے سے بھی اسی قسم کے جواب کی توقع رکھتے تھے۔

میاں صاحب کو مولانا کے مرتبۂ علمی کا پورا اعتراف تھا اور اگر کوئی علمی مشکل پیش آتی تو وہ مولانا کو ہی یاد فرماتے تھے۔ انھیں وہ ''ندوی صاحب'' کہا کرتے تھے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اہم علمی مباحث میں مولانا ہی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ میاں صاحب نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بعض حاضر الوقت مسائل کے سلسلے میں مذاکرات کا اہتمام کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی اس مذاکرے میں مدعو تھے اور وہ باقاعدہ تشریف لاتے اور زیر بحث مسئلے کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے تھے۔ کئی دن یہ مجلس مذاکرہ جاری رہی۔ مولانا حنیف ندوی ان دنوں بیمار تھے۔ نہ دفتر آ سکتے تھے اور نہ ان مذاکرات میں حصہ لے سکتے تھے۔ جلسے کی آخری مجلس کے انعقاد سے ایک دن پہلے مولانا مودودی نے بعض مسائل کے بارے میں چند نکات پیدا کیے اور فرمایا کل کے آخری اجلاس میں ان نکات پر بحث ہونی چاہیے۔ جلسہ دوسرے دن کے لیے برخاست ہوا تو میاں صاحب نے رفقائے ادارہ سے کہا کل کے اجلاس میں ندوی صاحب کا آنا بہت ضروری ہے، چناں چہ انھوں نے کل کا موضوع اور مودودی صاحب کے نکات لکھ کر دو تین آدمیوں کو مولانا ندوی صاحب کی خدمت میں بھیجا اور فرمایا کل وہ ہر صورت میں تشریف لائیں اور مولانا مودودی کے پیش کردہ نکات پر بحث میں حصہ لیں۔

دوسرے دن اجلاس سے کچھ پہلے گاڑی بھیج دی گئی اور مولانا ندوی تشریف لے آئے۔ دواؤں کی شیشیاں اور پڑیاں یعنی اپنا ''اسپتال'' ساتھ لے کر آئے۔ پروگرام کے مطابق مولانا مودودی کی تقریر ختم ہوئی تو ندوی صاحب کو وقت دیا گیا۔ انھوں نے مودودی صاحب کے پیش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کردہ نکات کا ایک ایک کر کے تجزیہ کیا اور ساتھ ساتھ ان پر اعتراضات وارد کرتے گئے۔ ندوی صاحب بات ختم کر چکے تو مودودی صاحب نے فرمایا ''مولانا حنیف ندوی نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھایا ہے اور مجھے فلسفیانہ اصطلاحوں میں الجھا دیا ہے۔''

مولانا حنیف ندوی کا اسلوبِ کلام مولانا مودودی کے اندازِ گفتگو سے مختلف تھا۔ ظاہر ہے تحقیقی و علمی انداز دعوتی انداز سے جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں میاں شریف کا دورِ نظامت وہی تھا جو ملک میں ایوب خاں کا عہدِ صدارت تھا۔ ایوب خاں ان کے شاگرد تھے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جب میاں صاحب صدر شعبہ فلسفہ تھے، ایوب خاں ان سے پڑھتے رہے تھے۔ اس تعلق کی بنا پر وہ میاں صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس زمانے کی حکومت پاکستان کے بہت سے اہل کار جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں اہم مناصب پر فائز تھے، یا تو میاں صاحب کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں شامل تھے، یا ویسے ہی انھیں مستحق توقیر گردانتے تھے۔ بعض اصحاب اختیار اس بنا پر ان کی تکریم کرتے تھے کہ وہ صدر کے استاد ہیں۔

ایک مرتبہ میاں صاحب نے ارادہ کیا کہ صدر ایوب خاں کو ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آنے کی دعوت دی جائے۔ اس کے لیے صدر کو اسلام آباد میں ٹیلی فون کیا تو ان کے سیکرٹری نے اٹھایا۔ میاں صاحب نے سیدھے اور صاف لفظوں میں کہا: ''لاہور سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ڈائریکٹر ایم ایم شریف بول رہا ہوں، ایوب خاں سے میری بات کرا دو۔''

سیکرٹری حیران کہ یہ کون شخص ہے جو صدر مملکت کو ٹیلی فون کر رہا ہے اور ان سے ہم کلام ہونے کے آداب سے بے خبر ہے۔ اتنی جرأت مندانہ بے تکلفی سے تو کوئی بھی صدر سے بات کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ سیکرٹری نے دوبارہ نام پوچھا، تو بولے: ''بیٹے! میرا نام ایم ایم شریف ہے۔ میں ایوب خاں کا استاد ہوں اور ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرا نام انھیں بتاؤ گے تو وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو میں ملاقات کے وقت ان سے کہہ دوں گا کہ فلاں وقت میں نے ٹیلی فون کیا تھا اور تمھارے سیکرٹری نے تمھیں اطلاع نہیں دی۔ پھر اگر تم سے باز پرس ہوئی تو اس کے ذمے دار تم خود ہی ہو گے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ الفاظ سن کر سیکرٹری صاحب کچھ گھبرائے۔ انھوں نے صدر سے رابطہ قائم کیا تو صدر نے نہایت ادب سے میاں صاحب کو سلام کیا۔ خیر خیریت پوچھی اور ٹیلی فون پر یاد فرمانے کی وجہ معلوم کرنا چاہی۔

کچھ عرصے کے بعد صدر ایوب خاں ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے۔ مغربی پاکستان کے گورنر نواب امیر محمد خاں اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب صدر کو دفتر کے مختلف حصے دکھائے جارہے تھے، تو صدر صاحب اور میاں صاحب آگے آگے تھے۔ ان کے عملے کے لوگ، ادارے کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ارکان جسٹس ایس۔ اے رحمان، خواجہ بشیر بخش، ڈاکٹر محمد جہاں گیر خان اور رفقائے ادارہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ بھٹو صاحب نوجوان تھے۔ اگرچہ آتے ہی میاں صاحب سے ان کا تعارف کرادیا گیا تھا، مگر میاں صاحب نے خاص توجہ سے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ جب بھٹو صاحب آگے بڑھتے اور صدر صاحب کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے تو میاں صاحب ہاتھ آگے بڑھاتے اور یہ الفاظ کہہ کر انھیں روک دیتے: ''برخوردار ذرا پیچھے رہو''۔۔۔ وہ مسکرا کر پیچھے ہٹ جاتے۔ دوسرے حضرات کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آجاتی۔ اوپر کی منزل میں رفقائے ادارہ کے کمرے دیکھنے گئے تو اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ سٹور میں کتابیں دیکھنے گئے تو بھی میاں صاحب نے ''برخوردار ذرا پیچھے رہو۔'' کہہ کر بھٹو صاحب کو پیچھے ہٹادیا۔ لائبریری میں آئے تو اس وقت بھی یہی معاملہ ہوا۔

اب میاں صاحب سے کسی نے کان میں کہا: ''یہ پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو ہیں۔''

یہ سن کر میاں صاحب چونکے۔ بولے: ''معاف کیجیے گا، میں بوڑھا آدمی ہوں۔ آپ کو پہچان نہیں سکا۔ یوں بھی ہمارے معاشرے میں بڑے اور بوڑھے آدمی نوجوانوں کے لیے خطاب کے وقت بیٹے یا برخوردار کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بعض مجلسوں میں شامل ہونے سے انھیں روک بھی دیتے ہیں۔ اسے وہ اپنا بزرگانہ حق سمجھتے ہیں، جو ہمارے معاشرے کی روایت بن چکا ہے۔ عمر کے اعتبار سے آپ کو بیٹا یا برخوردار کہنا میرا حق ہے۔

بھٹو صاحب نے کہا: میاں صاحب میں نے اپنے بارے میں یہ انداز تخاطب طویل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عرصے کے بعد سنا ہے۔ آپ نے مجھے یہ الفاظ کہے تو کئی سال پہلے کا زمانہ یاد آ گیا، اور میں انتہائی خوش ہوا۔ میں بعض اوقات اس لیے بھی آگے بڑھتا تھا کہ آپ مجھے یہ الفاظ کہیں۔ جن صاحب نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ میں وزیر ہوں، انھوں نے میری خوشی کے وہ لمحات چھین لیے ہیں جب آپ کہتے تھے! ''برخوردار ذرا پیچھے رہو۔''

میاں صاحب کے بارے میں چند اور دلچسپ باتیں بھی سنتے جایئے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں میں تو ادارے سے منسلک نہیں تھا، لیکن مجھے ادارے کے لوگوں نے بتایا کہ میاں صاحب اپنے اہل و عیال کو لے کر مری چلے گئے تھے۔ نقدی اور زیورات وغیرہ بھی ساتھ لے گئے تھے اس لیے کہ اثنائے جنگ میں لاہور میں رہنا وہ اپنے لیے مناسب نہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں یہاں ان کی جان کو بھی خطرہ تھا اور مال و دولت کو بھی۔! لیکن جاتے ہوئے دفتر کے لوگوں کو نصیحت فرمائی اور تسلی دی کہ گھبرانے اور ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ دشمن تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم ہر حال میں ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو۔ روزانہ دفتر آؤ اور باقاعدہ کام کرو۔ تمھارے لیے دفتر کی حاضری نہایت ضروری ہے۔ اگر آپ نہ آئے تو لوگ سمجھیں گے تم ڈر گئے ہو۔ مضبوط رہو اور اپنا کام جاری رکھو۔ اپنے آپ پر خوف طاری کر لینا اور دشمن سے ڈر کر گھروں کو چھوڑ دینا اور دفتروں میں نہ آنا مردوں کا شیوہ نہیں۔ میں عارضی طور پر مری جا رہا ہوں۔ جنگ ختم ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔ تم نوجوانوں اور بہادروں کی طرح یہاں رہو، اور کسی کی پروا نہ کرو۔

پھر مری سے روزانہ ٹیلی فون کرتے اور دفتر کے لوگوں کو حوصلہ دلاتے کہ لاہور میں تمھارا بال بھی بیگا نہ ہوگا۔ حوصلہ رکھو، یہیں رہو اور ڈٹے رہو۔ کسی طرح کی بزدلی کا مظاہرہ نہ کرنا۔ لاہور محفوظ شہر ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ اس شہر میں بیٹھے ہو۔ مری خطرے میں ہے۔ راول پنڈی اور اسلام آباد بھی خطرے میں ہیں۔ مجھے تمھارا بہت خیال رہتا ہے، اسی لیے روزانہ ٹیلی فون کرتا ہوں۔ اگر میں بوڑھا نہ ہوگیا ہوتا تو لاہور کبھی نہ چھوڑتا۔ اسی شہر میں رہتا۔ یہ بہت بارونق شہر ہے اور جی دار لوگوں کا شہر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دن ٹیلی فون کیا کہ پاک فوج بڑی بہادر فوج ہے۔ اس کے ہم پر اتنے احسانات ہیں کہ ہم شمار نہیں کر سکتے۔ اس کی مدد کرنا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا ہمارا فرض ہے۔ تم لاہور میں فوج کے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرو، انھیں کہو کہ وہ ٹرک لے کر آئیں اور جن کتابوں کی انھیں ضرورت ہے، ہمارے سٹور سے لے جائیں، ہماری مطبوعات فوج کے لیے حاضر ہیں۔

بہر حال میاں صاحب مری کی پناہ گاہ میں بیٹھے، ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ارکان و رفقا کو برابر تلقین فرماتے رہے کہ اپنا دل مضبوط اور قدم ثابت رکھیں، ڈٹے رہیں اور کسی کی پروانہ کریں۔ پھر از راہ کرم یہ تسلی بھی دیتے رہے کہ میں نے تم کو چھوڑا نہیں، جوں ہی جنگ ختم ہوئی اور خطرہ ٹلا، میں تمھارے پاس آجاؤں گا اور پھر پہلے کی طرح روزانہ ملاقات ہوا کرے گی اور اکٹھے ہو کر دشمن کو للکاریں گے۔ پھر دیکھیں گے ہمارا وہ کس طرح مقابلہ کرے گا۔ اس میں مقابلے کی بالکل ہمت نہیں رہے گی۔ تم پہلے کی طرح ہر روز وقت پر باقاعدہ چائے بھی پیا کرو اور بسکٹ بھی کھایا کرو۔ میری عدم موجودگی میں اپنے معمولات کو ترک نہ کرنا۔

میاں صاحب کے ان حوصلہ افزا الفاظ سے ارکان ادارہ خوب محظوظ ہوتے۔

میاں صاحب بعض چیزیں جلد بھول جاتے تھے اور ان کے بھولنے کے بعض واقعات لائق شنید ہیں۔

ایک مرتبہ ان کے ڈرائیور نے بتایا کہ ایک دن میاں صاحب کسی کام سے انارکلی گئے۔ گاڑی دھنی رام روڈ پر میو اسپتال کے دروازے کے قریب کھڑی کی اور جہاں جانا تھا وہاں پیدل گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں بیٹھے اور پھر پیدل چلتے چلتے گھر آگئے۔ نہ انھیں گاڑی کا خیال رہا اور نہ کسی نے ان سے گاڑی کے بارے میں پوچھا۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور کو آواز دی اور کہا: ''گاڑی لاؤ، فلاں جگہ جانا ہے۔'' اس نے کہا: ''گاڑی تو آپ لے گئے تھے اور واپس لے کر نہیں آئے۔'' بولے: ''میں تو پیدل آیا ہوں، اگر گاڑی پر گیا ہوتا تو واپس اسی پر آتا۔'' ڈرائیور سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے تم کہیں گاڑی لے گئے اور وہیں چھوڑ آئے۔'' پندرہ بیس منٹ جھگڑا ہوتا رہا۔ چابی دیکھی تو میاں صاحب کے کوٹ کی جیب میں تھی۔ پھر یاد آیا گاڑی دھنی رام روڈ پر کھڑی کی تھی۔ اب اپنے خاص انداز سے مسکرائے اور گاڑی لینے کے لیے ڈرائیور کو بھیجا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دن آتے ہی دفتر کے ایک شخص محمد منیر شیخ سے اپنے کچھ ذاتی کاغذات طلب کیے اور کہا: کل میں نے جو کاغذات تمھیں دیے تھے، وہ جلدی لاؤ، میں نے بنک میں جمع کرانے ہیں۔

منیر نے کہا: مجھے تو آپ نے کل کاغذات نہیں دیے۔

میاں صاحب نے فرمایا: دیے تھے، تم نے گم کر دیے ہیں۔۔۔ گھر میں بیگم کو ٹیلی فون کر دیا کہ منیر نے میرے فلاں ضروری کاغذات کہیں گم کر دیے ہیں۔

منیر بے چارہ سخت پریشان کہ میاں صاحب خواہ مخواہ اسے ملزم قرار دے رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو کاغذات میاں صاحب کے اس اخبار میں پڑے تھے جو وہ گھر سے لائے تھے اور اپنی دانست میں انھوں نے اخبار میں سنبھال کر رکھے تھے۔

ایک دن منیر کو بلایا اور کسی کام کے بارے میں ہدایات دیں۔ چند منٹ بعد پھر بلایا اور فرمایا: میرا قلم کہاں ہے؟ باتیں کرتے کرتے تم قلم لے گئے ہو۔

منیر نے کہا: نہ میں نے آپ کا قلم دیکھا، نہ لیا۔

پھر ذرا سخت لہجے میں بولے: تمھارے سوا اس کمرے میں کوئی نہیں آیا۔ قلم تم ہی لے گئے ہو۔

ادھر اُدھر میز پر پڑے ہوئے کاغذات میں دیکھا لیکن قلم نہ ملا۔

منیر نے کہا: قلم تو آپ کی جیب میں لگا ہوا سامنے نظر آ رہا ہے۔

فرمایا: یہ تو بال پوائنٹ ہے۔ میرا تو پارکر کا قلم ہے۔

اس اثنا میں دفتر کے کئی آدمی وہاں آ چکے تھے اور میاں صاحب سب کو بتا رہے تھے کہ منیر میرا قلم لے گیا ہے۔ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ میری جیب میں بال پوائنٹ ہے اور میرا پارکر کا قلم ہے۔

سب نے کہا: دیکھیے تو سہی، جیب میں کیا ہے۔ دیکھا تو وہی قلم تھا جس کی تلاش ہو رہی تھی اور ان کے بقول جسے منیر لے گیا تھا۔ سب ہنس پڑے اور خود میاں صاحب بھی مسکرانے لگے۔

ایک مرتبہ میاں صاحب نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ایک نوجوان عارف ذبیح کو ملازم رکھا۔ اس کے ذمے کسی موضوع پر ریسرچ کرنا تھا۔ دو یا تین سال میں وہ کوئی کام نہ کر پایا تو میاں صاحب نے اسے ملازمت سے علیحدہ کرنا چاہا، لیکن وہ اڑ گیا۔ دفتر کے ایک کمرے میں اس کی رہائش تھی۔ نہ کمرہ چھوڑتا تھا، نہ دفتر سے نکلتا تھا۔ میاں صاحب بہت پریشان ہوئے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بالآخر بڑی منت سماجت سے اس کو دفتر سے نکالا۔

میاں صاحب سے اگر کوئی سخت لہجے میں بات کرتا جب بھی ہنس پڑتے اور سختی کا جواب سختی سے نہ دیتے۔ ایک مرتبہ دفتر کے ایک چپراسی ریاض احمد کو کسی کام کے لیے کہا۔

اس نے جواب دیا: دوسرے چپراسی مرگئے ہیں، ان میں سے کسی کو اس کام کے لیے کہہ دو۔

میاں صاحب یہ الفاظ سن کر ہنس پڑے اور کسی دوسرے چپراسی سے کہہ کر وہ کام کرایا۔

میاں شریف صاحب جو ذاتی طور پر نہایت شریف آدمی تھے، یعنی اسم با مسمیٰ لاہور کی ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے، جسے باغبان پورہ کی ''میاں فیملی'' کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے بہت سے افراد نے ملکی سیاسیات ومعاملات میں بڑی شہرت پائی۔ سر میاں محمد شفیع وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بنے، جسٹس شاہ دین کو متحدہ پنجاب کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا، میاں افتخار الدین نے ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لیا اور قید وبند کی منزلیں طے کیں۔ کئی سال پنجاب کی کانگرس کمیٹی کے صدر رہے۔ بیگم شاہ نواز نے مسلم لیگ کے سٹیج پر تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ میاں عبدالرشید قیام پاکستان کے بعد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہوئے۔

میاں محمد شریف اسی خاندان میں ۳۰۔ مارچ ۱۸۹۳ء کو باغبانپورہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ حصولِ علم کا آغاز باغبانپورہ میں کیا۔ پھر شیراں والا گیٹ کے ہائی سکول میں داخل ہوئے اور میٹرک کا امتحان سنٹرل ماڈل سکول میں پاس کیا۔ بعدازاں علی گڑھ کے ایم۔اے۔او کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ پھر کیمبرج یونیورسٹی گئے اور وہاں ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی۔ ان کا موضوع فلسفہ تھا۔ ۱۹۱۷ء میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تین سال بعد ۱۹۲۰ء میں جب اس کالج کو مسلم یونیورسٹی بنا دیا گیا تو وہاں شعبہ فلسفہ کے پروفیسر اور چیئرمین مقرر کیے گئے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور کئی مرتبہ قائم مقام پرو وائس چانسلر بنائے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں انڈین فلسفہ کانگریس کے صدر چنے گئے۔ کئی دفعہ مختلف علمی مجالس کے ارباب انتظام کی دعوت پر یورپ کے بعض ملکوں میں گئے اور مقالے پڑھے۔ آسٹریلیا اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیلون کی چند تحقیقی انجمنوں کی طرف سے بھی دعوت نامے آئے اور ان میں شرکت کی۔

قیام پاکستان کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ملازمت ترک کر کے اپنے آبائی شہر لاہور آ گئے۔ ۱۹۵۱ء میں گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر نے پنجاب یونیورسٹی انکوائری کمیشن مقرر کیا تو میاں صاحب کو اس کا سیکرٹری بنایا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں ان کو اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کا منصب پیش کیا گیا۔ اس زمانے میں لاہور میں ایک ہی اسلامیہ کالج تھا اور وہ تھا ریلوے روڈ والا اسلامیہ کالج۔۔۔ ۱۹۵۶ء تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ اپنے دور پرنسپلی میں ۱۹۵۴ء میں انھوں نے ''پاکستان فلسفہ کانگریس'' قائم کی۔ یہ خالص علمی مجلس ہے، جو علوم عقلیہ سے میاں صاحب کے تعلق کی یادگار ہے۔ مئی ۱۹۵۹ء میں وہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر بنائے گئے۔

فلسفہ کانگرس کی طرف سے مارچ ۱۹۶۵ء میں متعدد ملکی اور غیر ملکی مفکرین کے علمی مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا جو ''نذر شریف'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ میاں صاحب کے لیے اصحابِ تحقیق کا بہترین خراج عقیدت ہے۔ اس میں ایک مضمون مولانا محمد حنیف ندوی کا ہے، جو میاں صاحب نے خاص طور پر ان سے لکھوایا تھا۔

میاں صاحب کے فلسفیانہ کارناموں اور علمی شاہکاروں میں ہسٹری آف مسلم فلاسفی (تاریخ فلسفہ اسلامی) کی تالیف و تدوین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور نہایت خوب صورت طریقے سے مغربی جرمنی سے شائع ہوئی ہے۔ پہلی صدی ہجری سے موجودہ دور کے اسلامی فلسفے کی یہ ایک مستند تاریخ ہے۔ مختلف اسلامی ملکوں میں اس وقت جو نئی تحریکات چل رہی ہیں اور جدید رجحانات پرورش پا رہے ہیں، اس کی تفصیل بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ کتاب بہت سے عنوانات و ابواب پر مشتمل ہے اور دنیائے علم کے مشہور ترین ۱۵۶ اصحاب تحقیق کے اشتراک و تعاون کا نتیجہ ہے۔ اس کی ایک جلد میاں شریف صاحب کے خود اپنے فلسفیانہ افکار کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

علاوہ ازیں اسلامک اینڈ ایجوکیشنل سٹڈیز مسلم تھاٹ، انس اوریجن اینڈ اچیومنٹس۔ اقبال اینڈ ہز تھاٹ...... سٹڈیز ان استھیٹکس اور مسلمانوں کے افکار بھی ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میاں صاحب کو شعروشاعری سے بھی تعلق تھا۔ کسی زمانے میں وہ اردو میں شعر کہتے رہے تھے۔ ان کے کلام کا کچھ حصہ جو بعض رسالوں میں کسی دور میں چھپا تھا، محفوظ تھا۔

وہ بڑے مستعد اور باہمت آدمی تھے۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے دفتر تشریف لاتے اور آتے ہی کام میں مشغول ہو جاتے۔ دفتر کے چھوٹے بڑے تمام لوگوں سے کھل کر بات کرتے اور بے تکلفی سے پیش آتے۔ خوش مزاج، خوش لباس اور خوش اخلاق۔ سب کے ہمدرد اور سب کے خیر خواہ۔

بعض اوقات ان کے اندر شعر سننے کا جذبہ کروٹ لیتا تو کسی سے سنانے کی فرمائش کرتے۔ نعت کے لیے مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی کو یاد فرماتے۔ وفات سے چند روز پہلے کی بات ہے کہ دفتر میں چائے کا دور چل رہا تھا اور میاں صاحب نے فرمائش کر دی۔ شاہ صاحب نے سرشادی لال کے بھتیجے و داماد آرزو سہارن پوری کا کلام سنایا جو مسلمان ہو گئے تھے۔ آرزو کی زندگی کے کچھ حالات بھی بیان کیے۔ میاں صاحب بہت متاثر ہوئے اور فرمایا، اس شاعر کے جس قدر حالات مل سکیں اور اس کا جتنا کلام فراہم ہو سکے، یک جا کر کے ماہنامہ ''ثقافت'' میں چھاپ دینا چاہیے۔ (ثقافت اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ تھا۔ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے اس کا نام بدل کر ''المعارف'' رکھ دیا تھا)۔ افسوس ہے شاہ صاحب آرزو کے حالات اور کلام کی جمع و تدوین اور اشاعت کا اہتمام نہ کر سکے۔ میاں صاحب کی وفات کے بعد ایک دو دفعہ انھیں اس طرف توجہ دلائی گئی تو فرمایا: ''جب وہی باقی نہ رہا جس نے آرزو کے حالات و کلام کو یک جا کرنے کی آرزو کی تھی، تو اب ہمیں بھی اس کی آرزو نہ رہی۔''

میاں صاحب غذا، دوا اور روزانہ کے معمولات میں بہت محتاط تھے، لیکن پڑھنے لکھنے اور دفتر کے کام کاج کی محنت میں بالکل محتاط نہ تھے۔ ستر بہتر سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے، اور جوانوں کی طرح چاق چوبند، چست اور تیز تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہر کام بروقت اور صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ رفقائے دفتر اور گھر کے لوگ انھیں زیادہ محنت سے روکنے کی کوشش کرتے، لیکن وہ کسی کی نہ مانتے، بدستور مصروف کار رہتے۔

ان کے ایک بے تکلف دوست محبوب عالم صاحب تھے، جو علی گڑھ سے ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ وہ انٹرنیشنل ہوٹل کے قریب مال روڈ کی کوٹھی نمبر ۹۰ میں رہتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ان کی بہت آمدورفت تھی۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق ٹرسٹ قائم کیا تھا اور اس ٹرسٹ کی طرف سے ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" بھی جاری کر رکھا تھا اور ملتان روڈ پر لاہور سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر مانگا منڈی کے قریب نیا علی گڑھ سکول بھی کھولا تھا۔ اس کی شان دار عمارت میاں صاحب کے مشورے سے بنائی گئی تھی۔ میاں صاحب تعمیرات کے اتنے بڑے ماہر تھے کہ بعض اوقات بڑے بڑے انجینئر ان کے سامنے عاجز آجاتے تھے۔ میاں صاحب کے کہنے سے محبوب عالم صاحب تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کا دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ میں لے آئے تھے۔

۱۰۔ دسمبر ۱۹۶۵ء کو نیا علی گڑھ سکول کی عمارت کا افتتاح ہونے والا تھا۔ اس دن محبوب عالم صاحب نے تمام رفقائے ادارہ کی پُرتکلف دعوت کی اور ہم لوگوں کو لاہور سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر اس عمارت میں لے گئے۔ میاں صاحب کو بھی وہاں لے جانا چاہتے تھے اور خود میاں صاحب بھی جانے کے لیے بے قرار تھے، لیکن اس دن وہ ادارے میں ایک صوفے پر لیٹے ہوئے تھے، کہا: آج میری طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے میں اتنی دور نہیں جاسکتا۔ رفقائے ادارہ سے کہا، آپ ضرور جائیں۔ ہم بارہ بجے کے قریب محبوب عالم صاحب کی دو گاڑیوں پر سوار ہو کر دفتر سے روانہ ہوئے۔ ہمارے جانے کے بعد ایک بجے میاں صاحب اپنے گھر چلے گئے۔

سوا تین بجے تک ہم نیا علی گڑھ سکول میں رہے، کھانا کھایا اور اس کی عمارت دیکھی۔ چار بجے ہنسی خوشی واپس آگئے۔ صبح کا اخبار دیکھا تو اس اندوہناک خبر پر نظر پڑی کہ رات گیارہ بج کر چالیس منٹ پر پروفیسر ایم۔ ایم شریف حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔

ان کی وفات ۱۰ اور ۱۱۔ دسمبر ۱۹۶۵ء کی درمیانی شب کو ہوئی۔ صبح دفتر پہنچے تو دفتر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ تمام رفقائے ادارہ کے مشورے سے مرحوم کے سوگ میں تین دن کے لیے دفتر بند کر دیا گیا اور ہم سب لوگ میاں صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ اسی دن شام کو چار بجے مرحوم کو ان کے آبائی قبرستان باغبانپورہ میں دفن کر دیا گیا۔۔۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

☆☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ قمرالدین

(وفات ۵۔اپریل ۱۹۶۸ء)

۱۶۔دسمبر ۱۹۶۳ء کو مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے رحلت فرمائی۔ ان کی رحلت سے کچھ عرصہ پیشتر ان سے ملاقات کے لیے حکیم عبداللہ صاحب (روڑی والے) تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے۔ دراز قامت، گٹھا ہوا گداز جسم، چوڑا چہرہ، گندمی رنگ، خشخشی سفید داڑھی، لبوں پر مسکراہٹ، شلوار قمیص پہنے ہوئے، سر پر قراقلی ٹوپی۔ معلوم ہوا یہ شیخ قمرالدین ہیں جو موچی دروازے کے اندر ایک گلی میں رہتے ہیں اور حکیم صاحب کے رشتے دار (یا دوست) ہیں۔ غالباً حکیم صاحب کا قیام بھی شیخ قمرالدین کے ہاں تھا۔

شیخ قمرالدین ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء میں لاہور کے ایک دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی حافظ تاج الدین اور دادا کا نام نامی حاجی نور احمد تھا۔ حاجی نور احمد کی اولاد میں حفاظ قرآن خاصی تعداد میں تھے۔

شیخ قمرالدین نے چھوٹی عمر میں اندرون موچی دروازہ میں جنرل مرچنٹ کی حیثیت سے کاروبار کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں کا بڑا شہرہ تھا۔ شیخ قمرالدین بھی ان سے عقیدت رکھتے تھے، چناں چہ مولانا ظفر علی خاں کے نام کی رعایت سے انھوں نے اپنی دکان کا نام ''ظفر ہاؤس'' رکھا اور بڑی محنت سے اپنے کاروبار کو وسعت دی۔ اسلام اور مسلمانوں کے لیے مولانا ظفر علی خاں کا ذہن نہایت زرخیز تھا اور اس سلسلے میں وہ بڑے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ''اسلامی بازار'' کے نام سے تحریک شروع کی جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کی جس علاقے میں چند دکانیں ہوں اس علاقے کو ''اسلامی بازار'' کے نام سے موسوم کیا جائے۔ جن لوگوں نے اس تحریک میں مولانا کا ساتھ دیا، ان میں شیخ قمرالدین بھی شامل تھے۔

دین کی دعوت واشاعت سے شیخ صاحب کو بے حد دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے مسلمانوں کے گھروں میں آویزاں کرنے کے لیے آیات قرآنی سے مزین طغرے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قطعات خوب صورت انداز میں شائع کیے۔ یہ طغرے اور قطعات بہت پسند کیے گئے۔ اسی دور میں انھوں نے سورہ یٰسین مترجم شائع کی۔

دین سے تعلق اور شغف پیدا کرنے والی کتابوں میں سے انھوں نے سب سے پہلے حلیم سعید پاشا کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ ''اللہ کی بادشاہت'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ ترجمہ مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب نے کیا تھا۔ نہایت خوب صورت اور رواں دواں ترجمہ۔۔۔ دوسری کتاب ''دیدار الٰہی'' شائع کی۔ اس کے علاوہ علامہ خلیل عرب مرحوم کی ایک صاحب زادی رقیہ مرحومہ کی کتاب ''تعمیر انسانیت قرآن وحدیث کی روشنی میں'' شائع کی۔

شیخ قمر الدین کا ارادہ قرآن مجید کی اشاعت وطباعت کا تھا، چناں چہ ۱۹۴۸ء میں ان کو دوسری دفعہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی تو واپسی سے کچھ مدت بعد انھیں تفسیر ''تفہیم القرآن'' کی اشاعت کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ اور بھی متعدد کتابیں شائع کیں۔

ابتدائی زندگی میں شیخ قمر الدین کو جن حضرات سے دلی لگاؤ پیدا ہوا، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ مولانا آزاد کی قائم کردہ تنظیم ''حزب اللہ'' میں شامل ہوئے۔ حزب اللہ کے قیام سے کچھ عرصہ بعد مولانا آزاد لاہور تشریف لائے اور میاں عبدالعزیز مالواڈہ بارایٹ لا کی کوٹھی پر ٹھہرے تو ان کے ہاتھ پر بے شمار لوگوں نے بیعت کی۔ بیعت کرنے والوں میں نوجوان شیخ قمر الدین بھی شامل تھے۔ اس زمانے میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ کی کوٹھی یکی دروازہ سرکلر روڈ پر تھی۔ طویل عرصے تک یہ کوٹھی برصغیر کے علما وزعما کا مرکز بنی رہی۔ اب یہ مالواڈہ کمپلیکس میں بدل گئی ہے اور میاں عبدالعزیز کے وارث لاہور کے مختلف مقامات میں سکونت پذیر ہوگئے ہیں۔

شیخ قمر الدین نے تین حج کیے۔ پہلا حج ۱۹۳۰ء میں، دوسرا ۱۹۴۸ء اور تیسرا اور آخری حج ۱۹۵۶ء میں کیا۔ پہلے حج کے موقعے پر ان کی ملاقات ارض حجاز میں افغانستان کے معزول اور جلا وطن حکمران امیر امان اللہ خان سے ہوئی۔ اس وقت وہ اٹلی میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور وہیں سے حج بیت اللہ کے لیے آئے تھے۔

دوسرے حج کے موقعے پر ان کی ملاقات بیت اللہ شریف کے امام محترم شیخ ابومحمد سمیع کے ہاں مصری عالم شیخ حسن البنا شہید سے ہوئی۔ وہ اس وقت جلا وطن ہو کر مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقامت گزیں تھے۔ ان کو جماعت اسلامی اور مولانا مودودی سے متعلق شیخ صاحب ہی نے بتایا تھا اور پاکستان میں وہ جس انداز سے اسلام کی خدمت کر رہے تھے، اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا تھا۔

شیخ صاحب نے تیسرا حج مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کے بعض رفقاے کرام کے ساتھ کیا۔ حج سے واپسی کے بعد شیخ صاحب شرق اوسط کے بعض ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے براستہ ایران پاکستان آئے۔

شیخ قمرالدین نے آغاز زندگی ہی میں اعمال خیر کی انجام دہی کو اپنا اصل نقطۂ نظر قرار دے لیا تھا، جس پر وہ تمام عمر کاربند رہے۔ وہ نیک خاندان کے نیک فرد تھے اور نیکی کے ماحول میں انھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں اور اسی ماحول میں ان کی زندگی کے شب و روز گزرے۔ علماے کرام سے انھیں ہمیشہ تعلق رہا اور وہ ان کی مجلسوں میں حاضری دیتے رہے۔ ان علماے کرام اور زعماے ملت میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، حکیم عبداللہ روڑی والے، مولانا مسعود عالم ندوی، ملک نصراللہ خان عزیز، مولانا امین احسن اصلاحی اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ وہ اپنے عہد کی ہر بڑی شخصیت اور اپنے دور کے ہر عالم دین سے ملنے کی کوشش کرتے اور ان سے استفادے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے ''تعمیر انسانیت'' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر غالباً مولانا کوثر نیازی تھے۔

شیخ قمرالدین نے ۵۔ اپریل ۱۹۶۸ء کو لاہور میں وفات پائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی اولاد نرینہ ایک بیٹے ہیں، جن کا نام شیخ سعید اللہ ہے۔ اردو بازار میں ''مکتبہ تعمیر انسانیت'' کے نام سے اسلامی کتابوں کی نشرواشاعت ان کا اصل کام ہے اور اس میں ماشاء اللہ وہ کامیاب ہیں۔ خوش اخلاق اور ملنسار۔ دعا ہے عالی ہمت باپ کی طرح شیخ سعید اللہ ہمیشہ کار خیر میں مصروف رہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاجی محمد اسحاق حنیف

(وفات ۷۔ستمبر ۱۹۶۹ء)

۱۹۴۸ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر کی حیثیت سے میں لاہور میں آیا تو ایک دن صبح آٹھ بجے کے قریب مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے ایک جماعتی کام سے مجھے حاجی محمد اسحاق حنیف کے ہاں جانے کے لیے فرمایا۔ حاجی صاحب مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن اور اس کے بانی ارکان میں سے تھے، لیکن میں نے اب تک نہ انھیں دیکھا تھا اور نہ مجھے ان کے مکان اور اس کے محلِ وقوع کا پتا تھا۔

مولانا نے ان کے مکان کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ گنپت روڈ سے انار کلی میں داخل ہوں گے تو سامنے ایک روڈ ہے۔ اس سے آگے کی سڑک کو اسپتال روڈ کہا جاتا ہے۔ یہ روڈ ختم ہوگی تو دائیں جانب اسپتال کا بڑا دروازہ نظر آئے گا۔ اس کے سامنے کے چوراہے سے دو سڑکیں نکلتی ہیں، ایک کا نام ریلوے روڈ ہے اور ایک کا نسبت روڈ۔ آپ ریلوے روڈ پر جایے اور چند قدم چل کر دائیں جانب کی گلی میں گھوم جایے جس پر گاندھی سکوائر کی تختی نصب ہے۔ اس گلی کے آخر میں بائیں جانب حاجی محمد اسحاق حنیف کا مکان ہے۔ اس علاقے کو ''گاندھی سکوائر'' کہا جاتا ہے۔

حاجی صاحب کے مکان کے متعلق مولانا غزنوی کی نشان دہی میرے لیے بالکل صحیح نشانِ راہ ثابت ہوئی اور میں کسی سے پوچھے بغیر آسانی سے ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ اگرچہ ابھی تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، لیکن انھیں میری تقرری کا علم تھا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور خیر وعافیت پوچھی۔ میانہ قامت، گندمی رنگ، آنکھوں پر نظر کی عینک، سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے، چھوٹی سیاہ داڑھی، چھتیس سینتیس سال کے خوش اندام جوان۔ بات چیت میں سنجیدگی کا عنصر غالب اور شائستگی کا پہلو نمایاں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میرے تقسیم ملک سے قبل کے وطن کے بارے میں پوچھا اور چائے پلائی۔ یہ حاجی محمد اسحاق حنیف سے اولیں ملاقات تھی جو آگے چل کر ہماری باہمی دوستی کی مضبوط بنیاد ثابت ہوئی۔

اب تھوڑی دیر کے لیے یہاں حاجی صاحب کے بارے میں گفتگو کا سلسلہ روک کر آپ کو ایک اور واقعہ سناتے ہیں۔

تقسیم ملک سے قبل چھوٹی عمر میں ہم نے لاہور کے جن ناشرانِ کتب کے نام مختلف کتابوں کے صفحات اول پر پڑھے تھے، ان میں سکھ ناشروں کے نام بھی تھے اور یہ ناشر قرآنِ مجید بھی شائع کرتے تھے۔ سکھ ناشروں میں ایک ناشر تھے، عطر سنگھ گلاب سنگھ اور دوسرے تھے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز! ان ناشران کتب (یعنی عطر سنگھ گلاب سنگھ اور ایس سنت سنگھ اینڈ سنز) میں سے ایک کا پتا تھا۔ نسبت روڈ لاہور۔ لفظ ''نسبت روڈ'' میں نے پہلی دفعہ پڑھا تو خیال گزرا کہ یہ غلط چھپ گیا ہے صحیح لفظ بسنت روڈ ہوگا، کسی سڑک کا نام ''بسنت روڈ'' تو ہوسکتا ہے جو بسنت سنگھ یا بسنت رام یا بسنت لال کی طرف منسوب ہو، ''نسبت روڈ'' نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ نسبت کوئی نام ہی نہیں بنتا۔ بہت عرصے تک یہ بات ذہن میں رہی۔ یہاں تک کہ جب مولانا غزنوی نے حاجی محمد اسحاق حنیف کے مکان کا پتا بتاتے ہوئے، ''نسبت روڈ'' فرمایا تو پھر بھی ذہن میں یہی سوال ابھرا کہ لفظ ''نسبت'' ہے یا بسنت''؟ اس کے ساتھ یہ بھی خیال آیا کہ مولانا کا تعلق لاہور سے ہے، یہ تو اس سڑک کا نام غلط نہیں بول سکتے۔

اب نسبت روڈ میرے لیے علاقہ غیر نہیں رہا تھا، بے شمار دفعہ اس پر سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ کسی زمانے میں اس سڑک پر ایک ہوٹل ہوتا تھا، جس کا نام ''ترک ہوٹل'' تھا۔ بہت لوگ اس ہوٹل میں آتے تھے۔ بعض ادیب اور اخبار نویس بھی اس میں بیٹھتے تھے۔ قسم قسم کی ادبی اور سیاسی بحثیں اس ہوٹل میں ہوتی تھیں۔ میں بھی بعض دفعہ شام کے وقت ادھر کا رخ کرتا اور مختلف لوگوں کی مختلف باتیں سنتا تھا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اسے ''نسبت روڈ'' کیوں کہا جاتا ہے۔

حالات نے کروٹ لی اور میں اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر ہوگیا۔ ''الاعتصام'' کے تبادلے میں بہت سے اخبارات اور رسائل آتے تھے، پاکستان سے بھی اور ہندوستان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مختلف مقامات سے بھی۔ ہندوستان کے اخبارات ورسائل بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔اب بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ میرے پاس وہاں سے جو رسالہ یا اخبار آتا ہے پورے غور سے اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک روز دہلی سے ایک ہفت روزہ اخبار آیا، جس کے ایک مضمون کا عنوان تھا، ''نسبت رائے'' یہ مضمون پڑھا تو پتا چلا کہ یہ ایک ہندو کا نام تھا اور یہ سڑک اسی کے نام سے منسوب ہے یہی مضمون دہلی کے اس ہفت روزے کے حوالے سے لاہور کے ایک روزنامے میں بھی شائع ہوا تھا۔ جب میں نے یہ مضمون روزنامے میں دیکھا تو ذہن میں آیا کہ میری طرح شاید اس کے ایڈیٹر کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اسے ''نسبت روڈ'' کیوں کہا جاتا ہے، اسی لیے اس نے یہ مضمون شائع کیا ہے۔

بے خبری بھی عجیب شے ہے جو بعض اوقات دلچسپ لطیفے پیدا کرتی ہے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذہن صحیح صورتِ حال سے باخبر ہونے کے باوجود اسے ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس لیے اس پر طویل مدت سے بے خبری نے قبضہ جما رکھا ہوتا ہے۔ اس سے قبضہ چھڑانا اور اسے بے دخل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

قارئین کو اپنی بے خبری سے باخبر کرنے کے بعد اب پھر حاجی محمد اسحاق حنیف کی طرف آتے ہیں۔۔۔ حاجی صاحب ممدوح امرتسر کے ارائیں خاندان کے فرد تھے جو ۱۹۱۰ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۰ء کی تعیین میں اس لیے کر رہا ہوں کہ ۱۲، ۱۳، ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی چوتھی کانفرنس بہ صدارت علامہ خلیل عرب گوجراں والا میں منعقد ہوئی تھی۔ ہم اس میں شمولیت کے لیے لاہور سے گوجراں والا گئے تو مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی نے مجھے اور حاجی صاحب کو حکم دیا کہ ہم لاہور جائیں اور فلاں فلاں اعلانات اخبارات میں شائع کرائیں اور کل صبح کو وہ اخبارات لے کر گوجراں والا آجائیں۔ یہ شام کا وقت تھا۔ ہم گوجراں والا سے روانہ ہونے لگے تو حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری (مرحوم) بھی ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہم مغرب سے تھوڑی دیر بعد لاہور آئے اور سیدھے چائنیز میں گئے۔ ارادہ یہ تھا کہ یہاں سے چائے پی کر اخبارات کے دفاتر میں جائیں گے۔ بہت سال ہوئے چائنیز بھی ختم ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ کافی ہاؤس تھا، اس کا بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نام ونشان مٹ گیا ہے۔ چائنیز میں حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری نے حاجی صاحب سے پوچھا کہ آپ کی کیا عمر ہوگی؟ کچھ لمحے وہ خاموش رہے، پھر جواب دیا: چھیالیس برس......!

اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱۹۱۰ء بنتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ بالکل صحیح ہوگا، اس لیے کہ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے (جیسا کہ آگے آرہا ہے) امرتسر سے ایک ماہنامہ رسالہ ''مبلغ'' جاری کیا تھا۔ ان کے ایک پرانے ساتھی کے بقول اس وقت ان کی عمر چوبیس پچیس برس ہوگی۔

حاجی صاحب نے امرتسر میں وہاں کی انجمن اسلامیہ کے ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن کن اساتذہ سے کی؟ اس کا کچھ پتا نہیں۔ انھوں نے خود بھی اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ ان کا اردو کا خط (ہینڈ رائٹنگ) بہت اچھا تھا، انگریزی کا خط بھی صاف تھا۔

وہ امرتسر کے کھاتے پیتے ارائیں خاندان کے فرد تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ امرتسر کی سبزی منڈی میں فروٹ اور سبزیوں کے آڑھتی تھے اور ان کا یہ پیشہ تھا۔ علاوہ ازیں نیکی اور شرافت میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ علمائے دین سے خاص طور پر ان کے قریبی روابط تھے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب سے بے حد معتقدانہ مراسم تھے۔

حاجی صاحب کو اپنے خاندان کے باقی افراد کی بہ نسبت یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ ہر فکر و خیال کے لوگوں سے رسم وراہ رکھتے تھے۔ مسلک اہل حدیث کے حامل ہونے کی بنا پر اہل حدیث علما و عوام سے تو ان کے تعلقات تھے ہی، اس کے علاوہ دوسرے فقہی مسالک کے زعما و خواص سے بھی ان کے میل جول کا سلسلہ کافی وسیع تھا۔

سیاسی نقطہ نظر سے وہ نیشنلسٹ تھے، اس لیے اس رجحان کے حاملین سے ان کے مراسم زیادہ تھے، لیکن مسلم لیگی حضرات سے بھی وہ کھلے دل سے ملتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کی سیاست صرف فکر و خیال کی حد تک تھی، عملی سیاست سے ان کا کوئی علاقہ نہ تھا۔

پہلا حج انھوں نے قیام پاکستان سے کئی سال پہلے سترہ (۱۷) سال کی عمر میں کیا تھا، اس وقت تک ان کے والد گرامی نے فریضۂ حج ادا نہیں کیا تھا، اس لیے بیٹے کو باپ سے پہلے حج کرنے میں کچھ تامل تھا۔ بعض علما سے فتویٰ حاصل کیا گیا تو اطمینان قلب ہوا اور سعادتِ حج سے بہرہ مند ہوئے۔ دوسرا حج قیام پاکستان کے کئی سال بعد کیا تھا۔ اس موقع پر والدہ مکرمہ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہلیہ محترمہ کو بھی ساتھ لے کر گئے تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے، سبھی اس کی بارگاہ میں پہنچ گئے ہیں۔

امرتسر بہت سی قوموں، بہت سی برادریوں اور بہت سے افکار و خیالات کے حامل لوگوں کا شہر تھا۔ وہ سکھوں کا بہت بڑا مذہبی مقام ہے، اس اعتبار سے اس کو ''گوروؤں کی نگری'' کہنا چاہیے۔ اہل حدیث کا بھی وہ ایک مرکز تھا، جس میں غزنوی خاندان کے علما واکابر فروکش تھے۔ حضرت مولانا احمد اللہ وہاں اقامت گزیں تھے، جنھیں رئیس امرتسر کہا جاتا تھا۔ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سکونت پذیر تھے جو اپنے علم وعمل اور اتباع سنت میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کا مسکن بھی وہی تھا جو بہت بڑے مناظر تھے اور انھوں نے اس دور کے برصغیر کے بہت سے غیر مسلم مناظروں سے اسلام کی حقانیت کے موضوع پر مناظرے کیے اور اللہ نے کامیاب فرمایا۔ علاوہ ازیں ان کے پورے برصغیر کے اہل علم میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ جنوری ۱۹۰۳ء میں مرزا غلام احمد قادیانی سے مناظرے کے لیے قادیان گئے۔ اس سے پہلے کوئی عالم مرزا غلام احمد سے مناظرے کے لیے وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ اولیں بزرگ تھے جو مرزا غلام احمد سے پنجہ آزمائی کے لیے قادیان پہنچے۔ لیکن مرزا صاحب کو ان کے مقابلے میں آنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ یہ مرزا صاحب کا اعترافِ شکست تھا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی طرف سے متفقہ طور پر مولانا کو ''فاتح قادیان'' کا لقب دیا گیا تھا۔ ''فاتح قادیان'' کے الفاظ ایک بڑے تختے پر خوب صورت طریقے سے لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے۔ ان الفاظ کا اسلوبِ تحریر کچھ ایسا تھا کہ انھیں دائیں اور بائیں دونوں طرف سے پڑھا جاتا تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی موت کا واقعہ بھی مولانا ثناء اللہ صاحب سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اس طرح کہ مرزا صاحب نے ۱۵۔ اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک اشتہار شائع کرایا، جس میں اللہ سے التجا کی کہ:

> ''مجھ میں اور ثناء اللہ میں سچا فیصلہ فرما اور جو تیری نگاہ میں حقیقت میں مفسد اور کذاب ہے، اس کو صادق کی زندگی میں دنیا سے اٹھا لے یا کسی اور نہایت سخت آفت میں جو موت کے برابر ہو، مبتلا کر۔ اے میرے پیارے مالک تو ایسا ہی کر۔''

چناں چہ مرزا غلام احمد قادیانی اپنی اس دعا یا بددعا سے ٹھیک تیرہ مہینے گیارہ دن بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۶۔مئی 1908ء کو ہیضے میں مبتلا ہو کر لاہور میں بمقام بیت الخلا مر گئے (''نبوت'' کی ساری زندگی میں لے دے کر ان کی یہی ایک دعا تھی جو قبول ہوئی) اور حضرت مولانا ثناء اللہ نے اس سے چالیس سال بعد ۱۵۔مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔

مرزا صاحب کو سب پہلے مباہلے کا چیلنج بھی امرتسر ہی کے ایک اہل حدیث عالم دین مولانا عبدالحق غزنوی نے دیا تھا۔

مرزا صاحب کے خلاف ایک ضخیم کتاب بھی اسی شہر کے ایک عالم مولوی عبداللہ معمار نے ''محمدیہ پاکٹ بک'' کے نام سے لکھی تھی جو بہت پڑھی گئی اور بے حد مقبول ہوئی۔

مشہور دیوبندی عالم مفتی محمد حسن کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ دور ماضی کے متعدد مسلمان نامور سیاسی رہنماؤں اور مقرروں کا مسکن بھی یہی شہر سے تھا، جن میں مولانا سید داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، مولانا بہاء الحق قاسمی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ حاجی محمد اسحاق حنیف اپنے شہر کے ان تمام چھوٹے بڑے لوگوں سے جو قیام پاکستان کے بعد آگئے تھے، تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے، ان میں ادیب، شاعر، خطیب، سیاسی لیڈر، ڈاکٹر، کاروباری حضرات ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ مسلکی لحاظ سے ان میں اہل حدیث بھی تھے، دیوبندی اور بریلوی حنفی بھی تھے، شیعہ بھی تھے اور منکرین حدیث بھی۔ سب سے معاشرتی اور سماجی مراسم قائم رکھنا ان کی بہت بڑی خوبی تھی۔

تقسیم ملک سے قبل امرتسر سے کئی اخبارات ورسائل شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں خود حاجی صاحب نے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا جس کا نام انھوں نے ''مبلغ'' رکھا تھا۔ یہ ماہنامہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کتنا عرصہ جاری رہا اور اس میں کن حضرات کے مضامین چھپتے تھے۔ البتہ ۲۰۰۱ء میں مجھے اپنے عزیز دوست علی ارشد کے کتب خانے میں فروری ۱۹۳۶ء کے ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کی جلد اوّل کا شمارہ نمبر۲ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے صفحہ ۷۳ پر ''تنقید و تبصرہ'' کے عنوان سے ذیل سطور مرقوم ہیں۔

''مبلغ۔۔۔ یہ دینی معلومات کا ایک مفید مجموعہ ہے، جس کو ہر مہینے جناب محمد اسحاق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صاحب حنیف امرتسر سے شائع کرتے ہیں۔ قیمت سالانہ ڈیڑھ روپے۔ حجم عام تقطیع کے دو جزء۔ اس مرتبہ حج نمبر ہمارے سامنے ہے، جس میں حج، مناسک حج اور سفر حج کے متعلق مفید معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ ملنے کا پتا: مہتمم رسالہ مبلغ۔ حقانی بک ڈپو۔ امرتسر۔''

''طلوع اسلام'' اس وقت دہلی سے ہمارے مرحوم دوست سید نذیر نیازی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور علمی مضامین کا خوب صورت مجموعہ تھا۔ اس کے بعد یہ رسالہ معروف منکر حدیث غلام احمد پرویز کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اب اس کے صفحات سے علمیت کا عنصر غائب ہوگیا ہے اور اس پر انکار حدیث نے قبضہ جمالیا ہے۔

میرے حاجی صاحب سے زیادہ مراسم اپریل ۱۹۴۹ء میں ہوئے۔ وہ اس طرح کہ مئی ۱۹۴۹ء کے آخری ہفتے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا تو اس کے صدر مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کو اور صدر استقبالیہ مولانا محمد حنیف ندوی کو بنایا گیا تھا۔ کانفرنس کے متعلق اخبارات میں خبریں دینے، لوگوں کو اس میں شرکت کے لیے خطوط لکھنے اور اشتہارات وغیرہ چھپوانے کا کام ناظم دفتر کی حیثیت سے میرے سپرد تھا۔ ایک دن حاجی صاحب دفتر آئے تو میں مطبوعہ دعوت نامے لفافوں میں بند کر کے ان پر لوگوں کے ڈاک کے پتے لکھ رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گئے اور دعوت نامہ پڑھنے لگے۔ جن حضرات کو شرکت کے لیے دعوت نامے بھیجنا مقصود تھا، میں نے ان کی ایک طویل فہرست بنا رکھی تھی، حاجی صاحب نے وہ فہرست دیکھی اور مجھے کہا:

''آپ لفافوں میں مطبوعہ دعوت نامے ڈالتے جایئے، میں فہرست دیکھ کر پتے لکھتا جاؤں گا۔''

اس طرح بہت سا کام تھوڑے وقت میں ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے معمول بنالیا کہ روزانہ دفتر آتے اور دفتری کام میں میری مدد کرتے۔ کئی دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے دن انھوں نے راولپنڈی کے اپنے ان عزیزوں اور تعلق داروں کے پتے لکھے تھے جو میری تیار کردہ فہرست میں درج نہیں تھے۔

اس زمانے میں سائیکل چھ پیسے گھنٹے کے حساب سے کرائے پر ملتا تھا، اور اگر پورے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دن کے لیے لینا ہو، جس میں رات بھی شامل تھی تو ایک روپیہ وصول کیا جاتا تھا، لیکن ہم نے ایک مہینے کے لیے پچیس روپے کرائے پر سائیکل لیا۔ حاجی صاحب کے پاس اس زمانے میں گاڑی نہیں تھی، وہ تانگے پر جمعیت کے دفتر (شیش محل روڈ) آتے تھے۔ میں نے ان کو سائیکل چلاتے نہیں دیکھا، لیکن اگر ہم دونوں نے کہیں جانا ہوتا تو سائیکل پر جاتے تھے۔ سائیکل میں چلاتا تھا، حاجی صاحب میرے ساتھ ہوتے تھے۔ کانفرنس ۲۸، ۲۹۔ مئی ۱۹۴۹ء کو ہونا تھی، ہم نے سائیکل ۳۰۔ مئی تک لی تھی۔ اس اثنا میں کئی دفعہ ہم دونوں بعض مقامات میں سائیکل پر گئے۔ وہ نماز جمعہ مسجد مبارک میں پڑھتے تھے اور پہلی صف میں بیٹھتے تھے۔ میں بھی وہیں پڑھتا تھا۔ کانفرنس کے انعقاد تک ہم اکٹھے نماز جمعہ کے لیے مسجد مبارک جاتے رہے۔ مسجد مبارک کے خطیب مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔

ان ہی دنوں حضرت مولانا محمد ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان سے کانفرنس کی صدارت کے لیے عرض کرنا مقصود تھا۔ سیالکوٹ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد حنیف ندوی، حاجی محمد اسحاق حنیف اور ان سطور کا راقم گئے تھے۔

حاجی صاحب کے ساتھ لاہور سے باہر میرا یہ پہلا سفر تھا۔

بہر حال عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ اس کانفرنس میں چند روز اکٹھے کام کرنے کی وجہ سے میرے اور حاجی صاحب کے مراسم بہت گہرے ہوگئے تھے۔

حاجی صاحب ذاتی طور سے میل جول رکھنے کے فن سے آگاہ تھے۔ وہ مرکزی جمعیت کے تاسیسی اجلاس میں بھی شامل تھے اور پھر انھیں مجلس عاملہ کا رکن بھی نامزد کر لیا گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد انھیں ناظم نشر واشاعت منتخب کر لیا گیا تھا۔

۱۹۔ اگست ۱۹۴۹ء کو گوجراں والا سے مولانا محمد حنیف ندوی کی ادارت میں اخبار ''الاعتصام'' کا پہلا شمارہ چھپا تھا۔ اس کے اجرا سے پانچ مہینے بعد فروری ۱۹۵۰ء میں مجھے معاون مدیر کی حیثیت سے گوجراں والا بھیج دیا گیا تھا۔ ان ہی دنوں ایک کاروباری سلسلے میں حاجی صاحب گوجراں والا گئے اور تین چار دن وہاں رہے۔ ان کا قیام میرے کمرے میں تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے گاڑی لی۔ ان کے ڈرائیور کا نام عبدالکریم تھا اور وہ حاجی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صاحب کے تمام دوستوں اور تعلق داروں کو جانتا تھا اور سب کی عزت کرتا تھا۔ اگر ہم میں سے فوری طور پر کسی کو کہیں جانا ہوتا تو عبدالکریم سے کہتے، وہ حاجی صاحب سے پوچھے بغیر گاڑی نکالتا اور ہمیں ہماری منزل مقصود پر لے جاتا۔

۱۹۵۴ء میں ''الاعتصام'' گوجراں والا سے لاہور منتقل ہوگیا تھا۔ اب روزانہ شام کے بعد حاجی صاحب سے ہماری ملاقات ہوتی تھی۔ ان کا تعلق چناب ٹیکسٹائل ملز لائل پور سے تھا۔ میں کئی دفعہ وہاں بھی ان کے ساتھ گیا۔ چناب ٹیکسٹائل ملز جڑاں والا سے لائل پور روڈ پر دائیں جانب تھی۔ حاجی صاحب نے مل کے سامنے بائیں جانب ایک کوٹھی کرائے پر لی تھی۔ وہ بعض اوقات لاہور سے اپنے دوستوں کو وہاں لے جاتے تھے۔ ان کے لاہور کے دوستوں میں مولانا محمد حنیف ندوی، خواجہ صادق کاشمیری (جو لائل پور کے روزنامہ ''غریب'' کے نمائندے تھے اور مرحوم شورش کاشمیری کے برادر نسبتی تھے) اور ان سطور کا راقم شامل تھے۔

اپریل (۱۹۵۵ء) کے پہلے ہفتے میں لائل پور میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تیسری کانفرنس مولانا اسماعیل غزنوی کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس کے صدر استقبالیہ مولانا محمد صدیق لائل پوری تھے۔ اسی کانفرنس کے موقعے پر جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ان دنوں حاجی صاحب لائل پور میں تھے اور کانفرنس میں شرکت کرنے والے متعدد علمائے کرام کے قیام کا انتظام انھوں نے اپنی کوٹھی میں کیا تھا۔ کانفرنس لائل پور کے دھوبی گھاٹ (عیدباغ) میں ہوئی تھی۔ حاجی صاحب کی کوٹھی اس مقام سے کافی دور تھی۔ مہمانوں کو حاجی صاحب کی گاڑی سے وہاں پہنچایا جاتا اور کانفرنس کے مقام انعقاد میں لایا جاتا تھا۔ اس طرح ان کی گاڑی مہمان علمائے کرام کے لیے وقف ہوگئی تھی۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے یوں تو تمام ارکان سے حاجی صاحب کا تعلق تھا اور وہ سب کا احترام کرتے اور سب ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتے تھے، لیکن کسی زیادہ اہم معاملے کے سلسلے میں فیصلہ کن مرحلے پر پہنچنے کے لیے وہ بالعموم مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا عطاء اللہ حنیف سے مشورہ کرتے تھے۔ جماعتوں میں ایسا ہوتا ہے، بعض ارکان ذہنی اعتبار سے باہم زیادہ قریب ہوتے ہیں اور کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہو تو وہ ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے سے مشاورت کے ساتھ چلتے ہیں اور دوسرے ارکان کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کر کے انھیں اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

حاجی صاحب جمعیت کی مجلس شوریٰ میں واضح بات کرتے اور صاف ستھرے انداز میں اپنا ماضی الضمیر دوسروں کو پہنچاتے تھے۔کسی سے اتفاق یا اختلاف کے موقع پر وہ الفاظ کے استعمال میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔مجلسی گفتگو میں نہ کسی کا دل دکھاتے تھے، نہ کسی کو ذہنی پریشانی میں مبتلا کرتے تھے۔ وہ کاروباری شخص تھے اور عام بات چیت اور میل جول میں وہی انداز اختیار کرتے تھے جو ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے کاروباری شخص کو اختیار کرنا چاہیے۔کسی سے لڑنا جھگڑنا اور کھینچا تانی کرنا ان کی عادت میں داخل نہ تھا۔

حاجی صاحب دوستوں کے دوست، فراخ حوصلہ اور کشادہ دست تھے۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ لائل پور (فیصل آباد) میں جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا تو انھوں نے اس کی کافی مالی مدد کی۔ اپنے دوستوں سے بھی اس سے تعاون کی اپیل کی۔ وہ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں سے تھے۔ جمعیت کی مجلس عاملہ میں انھوں نے جامعہ میں ''ثنائی ہال'' تعمیر کرانے کی تجویز پیش کی جو بہ اتفاق منظور ہوئی۔لیکن بعد میں اس ہال کا نام بدل دیا گیا تھا۔

۲۔ حاجی صاحب ہمیشہ مرکزی جمعیت کی طرف دست تعاون بڑھاتے رہے، اس کی کانفرنسوں کے انعقاد کے لیے بالخصوص معاونت کرتے تھے۔

۳۔ کراچی یا کسی اور مقام سے کوئی اہل حدیث عالم لاہور آتے تو کسی ہوٹل میں ان کے اعزاز میں عصرانے کا اہتمام کرتے،جس میں بہت سے اہل حدیث اور غیر اہل حدیث علما وزعما کو شرکت کی دعوت دی جاتی۔

۴۔ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی انھوں نے مختلف مواقع پر خاص طور سے مدد کی اور اس کو مالی بحران سے نکالنے کے لیے کوشاں رہے۔

۵۔ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں ایک مرتبہ مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ سے فارغ ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر شام کو بذریعہ بس لاہور کے لیے روانہ ہوئے جس بس میں حاجی صاحب سوار تھے، اس میں اور بھی کئی رکن سوار تھے، حاجی صاحب نے سب کا کرایہ خود ادا کیا۔

۶۔ بہت سے مستحقین کی وہ خفیہ طور سے مدد کرتے تھے۔ رفاہی اور جماعتی اداروں سے ان کے تعاون کی بہت سی مثالیں ہیں۔ بلاشبہ وہ کھلے ہاتھ اور کھلے دل کے آدمی تھے۔

میرا اور مولانا محمد حنیف ندوی کا سالہا سال یہ معمول رہا کہ ہم روزانہ شام کو انارکلی کی سیر کرتے اور کسی ہوٹل (بالعموم دہلی مسلم ہوٹل) میں چائے پیتے اور ہر موضوع کی باتیں کرتے تھے۔ ہمارے ملنے والے بھی وہاں آجاتے تھے۔ حاجی صاحب کی دکان اس ہوٹل کے سامنے نظام ہوٹل کے متصل تھی۔ ہم وہاں ضرور آتے تھے۔ حاجی صاحب سے بہت سی باتیں کی جاتیں، جماعتی بھی اور سیاسی بھی۔ دینی مسائل پر بحث ہوتی اور لطیفے چلتے۔ حاجی صاحب کو لطیفے سننے اور سنانے کا بہت شوق تھا۔ مولانا ابویحیٰی امام خاں نوشہروی بھی وہاں آجاتے۔ کبھی کبھی استاد محترم مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب بھی تشریف لے جاتے۔ بعض اوقات شورش کاشمیری مرحوم بھی اس مجلس میں آشامل ہوتے۔ مولانا اسماعیل غزنوی نیا بازار کے قریب ''گنج گھر'' میں رہتے تھے اور بیمار تھے، بیماری اور کمزوری کے باوجود کبھی کبھار ان کا پھیرا بھی ہوجاتا۔ اس طرح ایک اچھی خاصی محفل جم جاتی تھی اور چائے چلتی تھی۔ سردی کے موسم میں دکان پر حاجی صاحب عام طور سے شیشے کے گلاس میں چائے منگواتے اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چائے پیتے کہ اس طرح ہاتھوں کو گرمی پہنچتی ہے۔

موسم سرما میں شام کے وقت انارکلی میں ایک ریڑھی والا آیا کرتا تھا۔ ریڑھی پر مٹی کی ایک بھٹی رکھی ہوتی تھی، جس میں وہ موٹی موٹی شکرقندی بھونتا تھا۔ حاجی صاحب کی دکان کے سامنے وہ ریڑھی لے آتا اور چھری سے شکرقندی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر اس میں مسالہ ڈالتا اور جتنے آدمی وہاں بیٹھے ہوتے، ان کے حساب سے کاغذ میں ڈال کر شکرقندی لاتا اور میز پر رکھ دیتا۔ حاجی صاحب اسے پیسے دیتے اور وہ آگے نکل جاتا۔ سردیوں میں یہ اس کا ہر روز کا معمول تھا۔

یوں تو وہاں بہت سے معاملات پر باتیں ہوتی تھیں لیکن زیادہ تر باتوں کا تعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہل حدیث علمائے کرام سے ہوتا تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کا تذکرہ تو کسی نہ کسی عنوان سے روزانہ چلتا تھا۔ کبھی مولانا محمد حنیف ندوی ان کی کوئی بات سنا دیتے، کبھی حاجی صاحب اور کبھی کوئی اور صاحب ان کا کوئی واقعہ بیان فرما دیتے۔ ایک دن ہم نے مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی سے کہا (جنھیں ہم خاں صاحب کہا کرتے تھے) کہ مولانا سے متعلق جو باتیں یہاں بیان کی جاتی ہیں، آپ روزانہ لکھ لیا کریں۔ اس طرح مولانا سے متعلق ان واقعات پر مشتمل ایک اچھی خاصی کتاب ہو جائے گی۔ حاجی صاحب نے کہا کہ اس کتاب کی اشاعت کا انتظام کر لیا جائے گا۔ مولانا ابویحییٰ امام خاں صاحب نے ازراہ کرم ہماری یہ تجویز پسند فرمائی۔ چناں چہ مجلس برخاست ہونے کے بعد وہ گھر جاتے اور سونے سے پہلے مولانا امرتسری کے بارے میں مجلس میں بیان کردہ واقعات ضبط تحریر میں لے آتے اور تیسرے چوتھے دن وہ واقعات مجلس میں سنا دیتے۔ اس طرح ان کی اچھی خاصی معلوماتی کتاب ہوئی جو نقوش ابوالوفا کے نام سے چھپی۔

شام سے پہلے حاجی صاحب چائنیز جانے کی کوشش ضرور کرتے۔ زیادہ معمول یہ تھا کہ پہلے شیخ بشیر (پف مشین والے) کے پاس کمرشل بلڈنگ جاتے، پھر ان کو ساتھ لے کر چائنیز کا رخ کرتے۔

ایک دن مولانا محمد حنیف ندوی، حاجی صاحب، شورش کاشمیری اور میں چائنیز گئے۔ سیڑھیاں چڑھنے لگے تو حاجی صاحب اور مولانا آگے تھے۔ میں اور شورش پیچھے۔ شورش نے ذرا آگے ہو کر ایک ہاتھ مولانا کے کندھے پر رکھا اور ایک حاجی صاحب کے کندھے پر۔ پھر کہا: دونوں طرف نمازی اور حاجی درمیان میں پاجی۔!

حاجی صاحب ارائیں تھے اور قدرتی طور پر انھیں اپنی برادری سے محبت تھی۔ ارائیوں کی میٹنگوں میں بعض دفعہ مجھے اور مولانا حنیف ندوی کو لے جاتے اور میٹنگ کے شرکا سے کہتے یہ اپنے آدمی ہیں اور بہت پڑھے لکھے ہیں۔ اگر وہاں ہمارا کوئی ارائیں واقف ہوتا تو وہ ہمیں دیکھ کر ہنس پڑتا اور میٹنگ کے بعد کہتا بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ بھی آرائیں ہو گئے۔

وہ نہایت دلچسپ آدمی تھے۔ ایک دفعہ ۶ یا ۷ محرم کو رات کے آٹھ بجے کے قریب مولانا محمد حنیف ندوی کو، فاروق قریشی کو، خواجہ صادق کاشمیری اور مجھے موچی دروازے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اندر نثار حویلی (چوک نواب صاحب) لے گئے۔ یہ شیعہ حضرات کا مرکز ہے۔ وہیں سے نو محرم کی رات کو گھوڑا نکالا جاتا ہے۔ وہاں کوئی ذاکر مجلس پڑھ رہے تھے، ہم سب سے آگے جا کر بیٹھ گئے۔ میں شیعہ صاحبان کی کسی مجلس میں پہلی دفعہ گیا تھا اور پہلی دفعہ ان کا اندازِ مجلس خوانی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں میرے چند جاننے والے شیعہ حضرات بھی موجود تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر بڑے متعجب ہوئے۔ ہم مجلس خوانی کے دوران ہی باہر نکلے تو مجھے جاننے والے شیعہ بھی باہر آ گئے۔ پانی اور چائے وغیرہ پینے کو کہا، لیکن ہم نے شکریہ ادا کیا اور باہر آ گئے۔

دوسری رات اسی وقت حاجی صاحب مجھے ایڈورڈ روڈ پر لے گئے اور کہا وہاں فیروز پوریوں کا امام بارہ ہے، جس میں مولانا مظہر علی اظہر مجلس پڑھتے ہیں۔ ہم نے ان کی مجلس سنی، پھر ان سے ملاقات کی۔ مولانا مظہر علی اظہر پرانے احراری اور بہت بڑے سیاسی مقرر تھے۔

روزانہ شام کے بعد حاجی صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔ لمبی نشست کے بعد نو بجے کے لگ بھگ پہلے میں اور حاجی صاحب مولانا ندوی ان کو ان کے گھر (چوک بھونڈ پورہ مزنگ) چھوڑنے جاتے۔ اس کے بعد وہ مجھے چھوڑنے کے لیے بھاٹی دروازے آتے۔ میں اس زمانے میں نور محلہ اندروں بھاٹی دروازے رہتا تھا۔ اگر میں ایک یا دو دن ان سے کسی وجہ سے نہ مل سکتا تو وہ ہمارے گھر پہنچ جاتے۔

رات کو دس بجے کے قریب وہ بالعموم خواجہ صادق کاشمیری کے گھر جاتے اور ان سے گپ شپ ہوتی۔ خواجہ صاحب لاہور میں لائل پور (فیصل آباد) کے روزنامہ ''غریب'' کے نمائندے تھے اور ان کا مکان گوال منڈی میں گندہ انجن کے قریب تھا۔

ایک دن حاجی صاحب کی دکان پر مولانا محی الدین لکھوی کے متعلق بات ہوئی تو کہا چلیے ان سے ملنے چلتے ہیں۔ رات کے آٹھ یا نو بجے کا وقت ہوگا۔ میں، مولانا محمد حنیف ندوی، فاروق قریشی اور حاجی صاحب لاہور سے روانہ ہوئے اور دیپال پور کے قریب ان کے گاؤں (تارا سنگھ) پہنچے، جس کا نام انھوں نے پہلے مرکز الاسلام پھر اللہ آباد رکھا تھا۔ کافی دیر ان سے باتیں ہوئیں۔ رات ہی کو وہاں سے چل پڑے اور فجر سے پہلے لاہور آ گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ حاجی صاحب کو مولانا ثناء اللہ امرتسری سے بہت تعلق تھا۔ یہ تعلق مولانا کی وفات کے بعد ان کے پوتوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ مولانا داؤد غزنوی کی وفات کے وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب امیر مولانا محی الدین لکھوی تھے۔ مولانا غزنوی کی وفات سے ایک مہینا تین دن بعد ۱۹۔ جنوری ۱۹۶۴ء کو مرکزی جمعیت کے نئے عہدے داروں کا انتخاب ہوا تو حاجی صاحب نے تجویز پیش کی کہ جمعیت کا نائب امیر دوم مولانا ثناء اللہ کے پوتے مولانا رضاء اللہ ثنائی کو بنایا جائے۔ چناں چہ ان کی یہ تجویز منظور ہوئی اور مولانا رضاء اللہ ثنائی کو نائب امیر دوم منتخب کیا گیا اور وہ اپنی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔

حضرت حافظ عبداللہ روپڑی مرحوم ومغفور کے ایک چھوٹے بھائی حافظ عبدالرحمٰن کمیرپوری تھے جو تقسیم ملک کے بعد پاکستان آئے تو اپنے دوسرے اعزہ واقارب کی طرح ماڈل ٹاؤن میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہاں انھوں نے اپنا کاروبار شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی مسجد اہل حدیث بنائی اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے دینی مدرسہ جاری فرمایا۔

حاجی صاحب سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ایک دن شام کے بعد حاجی صاحب مجھے حافظ عبدالرحمٰن کمیرپوری کے یہاں لے گئے۔ حافظ صاحب نہایت خوش ہوئے، اپنا مدرسہ دکھایا اور مسجد دکھائی۔ اپنے کاروبار کے متعلق بھی بتایا۔ حافظ عبدالرحمٰن کمیرپوری نے ۹۔ مارچ ۲۰۰۰ء کو وفات پائی۔

حاجی صاحب کہیں آنے جانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے اور لوگوں سے ملنا اور تعلقات قائم کرنا اور نباہنا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ ایک دن ہم نے حسب معمول مسجد مبارک میں جمعے کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد کہا: آئیے مسجد قدس کا چکر لگائیں۔ وہاں حافظ عبدالقادر اور دوسرے حضرات سے ملیں گے۔ ہم وہاں گئے تو جمعہ پڑھ کر لوگ مسجد سے باہر نکل رہے تھے اور حافظ عبدالقادر صاحب کے چھوٹے بھائی حافظ احمد صاحب نے دونوں ہاتھوں سے ایک بڑا سا رومال پکڑ رکھا تھا اور لوگ اس میں مسجد کے لیے پیسے ڈال رہے تھے۔ حافظ احمد صاحب نے ہمیں دیکھا تو بلند آواز سے کہا ماشاء اللہ دو اسحاق آ گئے۔ ہمارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوست آگئے۔ ہمارے مہربان آگئے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے رومال سے پیسے نکالے اور ایک شخص کو پیسے دیتے ہوئے کہا، لو ان مہربانوں کے لیے بوتلیں لاؤ۔

حاجی صاحب نے کہا: ہم چندے کے پیسوں کی بوتلیں نہیں پییں گے۔ اپنی جیب سے پیسے نکالیے اور بوتلیں منگوایے۔

حافظ احمد دلچسپ آدمی تھے، مسجد اور وہاں کے مدرسے کا انتظام ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ بولے: حاجی صاحب فکر نہ کریں، اطمینان سے بوتل پییں۔ میں اپنی جیب سے پیسے دوں گا۔

اس اثنا میں حافظ عبدالقادر بھی تشریف لے آئے اور پھر ان سے باتیں ہونے لگیں۔ حافظ صاحب کے بارے میں جو کچھ میں جانتا ہوں، اس کا تذکرہ اس مضمون میں کیا گیا ہے جو حافظ عبدالقادر روپڑی سے متعلق میری کتاب (کاروانِ سلف) میں مندرج ہے۔ یہ تمام حضرات وفات پا چکے ہیں۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے آمین۔

علمائے دین سے مل کر حاجی صاحب خوش ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے ان کو کسی قسم کی خدمت کا موقع ملتا تو انھیں مزید خوشی ہوتی۔ ایک مرتبہ لاہور میں جامعہ اشرفیہ کا اجلاس ہوا، جس میں کراچی سے مولانا احتشام الحق تھانوی تشریف لائے تھے اور رات کو نیلا گنبد کی مسجد میں ان کی تقریر تھی۔ تقریر کے بعد وہ کراچی اپنی اہلیہ محترمہ کو ٹیلی فون کرنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں ٹیلی فون بہت کم لوگوں کے گھر میں ہوتے تھے۔ حاجی صاحب انھیں اپنے مکان پر لے گئے اور کراچی کے لیے کال بک کرائی۔ مولانا کی اہلیہ محترم کا نام مجھے یاد پڑتا ہے ''حسنہ'' تھا۔ انھوں نے میرے خیال میں یہ ہی نام لے کر ان سے گفتگو کی تھی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم دیوبندی عالم تھے اور بہت اچھے مقرر اور واعظ وخطیب تھے۔

انارکلی میں حاجی صاحب کی دکان کے قریب مولانا محمد ابراہیم کی مسجد تھی۔ مولانا بڑے وجیہ اور قد آور تھے۔ مسجد سے متصل ان کی رہائش تھی۔ دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ شام کے بعد عام طور سے وہ حاجی صاحب کی دکان پر آجاتے اور علمائے کرام کے بہت سے واقعات سناتے۔ اگر دو چار دن کا ناغہ پڑ جاتا تو انھیں بلا لیا جاتا۔ وہ سیاسیات میں مجلس احرار سے وابستہ تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد حنیف ندوی کا وہ بہت احترام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے تھے۔ ہمارے مہربان تھے۔ ان سے متعلق مضمون اس مجموعے میں شامل ہے۔ ان کے صاحب زادے میاں عبدالرحمٰن ہمارے عزیز دوست ہیں۔

حاجی صاحب کا قصہ چھڑا ہے تو ان سے متعلق بہت سی باتیں ذہن میں گھومنے لگی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی چوتھی کانفرنس گوجراں والا میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں شرکت کے لیے ہم وہاں پہنچے تو حاجی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ہمارا قیام کہاں ہوگا اور دو تین راتیں کہاں بسر ہوں گی؟ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم ایسی جگہ قیام کریں جہاں لوگوں کی زیادہ بھیڑ نہ ہو۔ میں نے کہا: آپ پریشان نہ ہوں، سب کچھ ہو جائے گا۔ چناں چہ میں نے اپنے دوست خواجہ محمد یوسف سے بات کی اور ہمارا قیام ان ہی کے ہاں رہا۔ ہم چار آدمی تھے مولانا محی الدین احمد قصوری، حاجی صاحب، فاروق قریشی اور میں......! مقامی انتظامیہ کی طرف سے قیام کے لیے وہاں جو انتظام کیا گیا تھا، وہ بہت اچھا تھا۔ لیکن حاجی صاحب چاہتے تھے کہ کوئی ایسی جگہ ہونی چاہیے، جہاں آپس میں بات چیت کرنے میں کسی قسم کا تکلف نہ ہو۔

کانفرنس سے فارغ ہو کر ہم گوجراں والا سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو میں، حاجی صاحب، مولانا محمد حنیف ندوی اور فاروق قریشی، حاجی صاحب کی گاڑی میں سوار تھے۔ پانچواں ان کا ڈرائیور عبدالکریم تھا۔ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مرید کے پہنچے تو اچانک سیلاب آگیا اور گاڑی پانی میں گھر گئی۔ میں اور فاروق قریشی گاڑی سے اترے، شلواریں اوپر چڑھائیں اور گاڑی کو دھکا لگانے کا عمل شروع کیا۔ سیلاب میں لحہ بہ لحہ تیزی آرہی تھی اور گاڑی کے پورے پہیے پانی کی زد میں آگئے تھے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ دیر دھکے کا سلسلہ جاری رہا۔ خشکی پر آئے تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ رات کا وقت، چاروں طرف اندھیرا، سیلاب کا تیز پانی، سانپ اور بعض موذی چیزیں بھی اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ پھر پانی تیز ہو جائے تو گاڑی کو ڈرائیور کے قابو سے باہر کر دیتا ہے۔ اللہ نے ہم کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھا۔

۱۴۔ اپریل ۱۹۵۴ء کو سعودی عرب کے سابق حکمران شاہ سعود بن عبدالعزیز پاکستان کے دورے پر آئے تو مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ایک وفد لاہور سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیادت میں ان کے استقبال کے لیے کراچی گیا۔ یہ وفد مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھا۔

۱۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، قائد وفد

۲۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی، ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث

۳۔ مولانا محی الدین احمد قصوری، رکن مجلس عاملہ مرکزی جمعیت

۴۔ مولانا محمد علی قصوری، رکن مجلس عاملہ مرکزی جمعیت

۵۔ شیخ محمد اشرف، تاجر کتب لاہور

۶۔ میاں عبدالمجید ناظم مالیات مرکزی جمعیت

۷۔ جناب عبدالرؤف قریشی

۸۔ حاجی محمد اسحاق حنیف۔ ناظم نشر و اشاعت مرکزی جمعیت

کراچی جا کر ان حضرات نے جن زعمائے اہل حدیث کو اپنے ساتھ شامل کیا، ان کے اسمائے گرامی یہ تھے۔

۱۔ علامہ خلیل عرب

۲۔ شیخ عبدالوہاب خلف الرشید شیخ عطاء الرحمٰن دہلوی

۳۔ مولانا محمد یونس دہلوی

۴۔ میاں عبدالعزیز عباز اینڈ کمپنی

وفد کے کل سولہ ارکان تھے جو شاہ سعود کی آمد کے موقعے پر ان کے استقبال کے لیے کراچی کے فضائی مستقر پر موجود تھے اور جنھوں نے وہاں ان سے ملاقات کی تھی۔ پھر اس سے دو دن بعد انھوں نے باقاعدہ شاہ سعود سے ملاقات کی اور کچھ دیر ان سے مصروفِ گفتگو رہے۔

یہ تمام حضرات اپنی اپنی باری سے سفر آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ان میں سے عبدالرؤف قریشی نے جولائی ۲۰۰۰ء میں وفات پائی۔ وہ کاروباری سلسلے میں امریکہ میں تھے۔ سترہ سال کے بعد لاہور آئے تھے۔ ہوائی جہاز سے اتر کر اپنے گھر (راج گڑھ) جانے کے لیے کار پر سوار ہوئے۔ ابھی گھر نہیں پہنچے تھے کہ جین مندر کے قریب، جہاں سے ان کا گھر زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر ہوگا، اچانک ان پر دل کا دورہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑا اور اسی وقت گاڑی میں وفات پا گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

پی پی ایل ایک مشہور اور مضبوط ادارہ تھا جو میاں افتخار الدین اور ان کے بعض رفقا کی کوشش سے جاری ہوا تھا۔ پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل ونہار اس ادارے کی طرف سے شائع ہوتے تھے۔ ایوب خاں نے مارشل لا نافذ کیا تو اس ادارے کو اپنی حکومت کی تحویل میں لے لیا تھا۔ حاجی صاحب کچھ عرصہ پی پی ایل کے چیئرمین رہے تھے۔

حاجی صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، علمائے دین کے قدردان، جماعت اہل حدیث کے خدمت گزار، امورِ خیر کی انجام دہی میں تیز گام، دوستوں کے ہمدرد اور یاروں کے یار تھے۔ توازن اور اعتدال سے بات کرتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ جماعت کے بعض جلسوں میں انھیں سٹیج سیکرٹری بنایا گیا تو انھوں نے یہ فریضہ خوب صورتی سے انجام دیا۔ نہ کسی مقرر کے تعارف میں مبالغے سے کام لیا اور نہ کسی کے متعلق کسی نوع کے ذہنی تحفظ کا ثبوت دیا۔ ہر شخص کو وہی مقام دیا جس کا اسے مستحق سمجھا۔ سٹیج سیکرٹری شب جلسوں کا بہت نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ اس میں کسی کا تعارف کراتے ہوئے الفاظ کے استعمال میں بے حد احتیاط کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ ضلع لاہور کی جمعیت اہل حدیث کی دو روزہ کانفرنس بیرون موچی گیٹ میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کا انھیں صدر استقبالیہ بنایا گیا تھا اور انھوں نے اس میں خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا۔ یہ خطبہ اخبار ''الاعتصام'' میں شائع ہوا تھا۔

وہ وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ہر سطح کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے۔ بنیادی طور پر وہ کاروباری شخص تھے اور اچھے کاروباری کو جن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے، وہ اوصاف ان میں پائے جاتے تھے۔ صاف اندازِ بیان اور صاف اسلوبِ حیات کے مالک......!

ایوب خاں نے بی ڈی سسٹم ایجاد کیا یعنی بنیادی جمہوریتوں کے نام پر انتخابات کرائے تو حاجی صاحب نے بھی اس میں حصہ لیا اور اپنے حلقے میں کامیابی حاصل کی۔ پھر چیئرمینی کا الیکشن لڑا، اس میں بھی کامیاب ہوئے۔ چیئرمین کی حیثیت سے عائلی اختلافات کے مقدمے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے پاس آتے تھے اور وہ اختیارات کی حدود میں رہ کر ان کے فیصلے کرتے تھے۔

۱۹۶۸ء کے مئی کا مہینا تھا۔ میں تین بجے کے لگ بھگ دفتر سے گھر آیا اور کھانا کھا کر ابھی فارغ ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر نکلا تو حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کھڑے تھے۔ میں نے عرض کیا اندر تشریف لایے اور پانی پیجیے۔ فرمایا میں اندر نہیں آؤں گا، تم جلدی سے باہر آؤ۔ سڑک پر حاجی محمد اسحاق حنیف اور مولانا محمد رمضان (سابق ناظم اعلیٰ جمعیت اہل حدیث، لاہور شہر) کھڑے ہیں۔ تمھیں ساتھ لے کر اوکاڑے مولانا معین الدین لکھوی کے پاس جانا ہے۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ باہر آیا تو حاجی صاحب اور مولانا محمد رمضان سے پوچھا مولانا معین الدین سے کام کیا ہے؟ فرمایا گاڑی میں بیٹھو، راستے میں بتائیں گے۔

یہ ایک جماعتی کام تھا اور اس فقیر کی وساطت سے وہ مولانا معین الدین سے کرانا چاہتے تھے۔

ہم اوکاڑے پہنچے، مولانا موجود تھے، لیکن مریدوں میں گھرے ہوئے تھے۔ پانی وغیرہ پلانے کے بعد کام کی نوعیت پوچھی۔ میں انھیں علیحدگی میں لے گیا اور کام سے متعلق تفصیل بتائی۔ نیز عرض کیا کہ کل چار بجے آپ لازماً لاہور حاجی صاحب کے مکان پر تشریف لائیے۔ انھوں نے آنے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن کچھ اور لوگوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ معین الدین لکھوی عین وقت پر پہنچے۔ گفتگو ہوئی اور مسئلہ اسی طرح حل ہوگیا جس طرح حاجی صاحب چاہتے تھے اور جس طرح میں نے مولانا سے کہا تھا۔

اس پر یہ تینوں حضرات (مولانا عطاء اللہ صاحب، مولانا محمد رمضان اور حاجی صاحب) نہایت خوش ہوئے اور اس فقیر کو دعائیں دیں۔

حاجی صاحب کا لباس سفید شلوار قمیص اور سردیوں میں گرم شیروانی تھا، جس کے بٹن بند ہوتے تھے۔ سر پر چھوٹی دیوار کی کالے رنگ کی قراقلی ٹوپی۔ موسم گرما میں کبھی کبھی کسی خاص موقعے پر ٹھنڈی شیروانی بھی پہن لیتے تھے۔

اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ فلاں صاحب ملاقات کے لیے گھر آرہے ہیں تو بعض دفعہ وہ نہایت سادگی سے اپنے مکان کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتے اور آنے والے صاحب کا انتظار کرتے۔

اب ہم چلتے چلتے ان کی دینوی زندگی کے آخری دن تک پہنچ گئے ہیں۔ ۱۹۶۹ء کے ستمبر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی سات تاریخ تھی۔ پیر کا دن تھا اور نو بجے کا وقت۔ میں اپنے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو آواز آئی۔

"میں شیخ محمد اشرف بول رہا ہوں۔ حاجی محمد اسحاق حنیف کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے میو ہسپتال پہنچا دی گئی ہے۔"

یہ اچانک خبر تھی اور نہایت الم ناک......! پورا جسم ہل گیا۔ حاجی اسحاق حنیف کو کسی نے قتل کر دیا۔! یہ کیا معاملہ ہے؟ کس نے قتل کیا؟ کیوں قتل کیا؟ کہاں قتل کیا؟ اس قسم کے کتنے ہی سوالات ذہن میں گردش کرنے لگے۔ کسی سے دشمنی؟ کسی سے عداوت؟ کس سے جھگڑا؟ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔

میں اسی وقت اٹھا اور حزن وملال کا بوجھ اٹھائے میو ہسپتال پہنچا۔ وہاں حاجی صاحب کے عزیز واقارب، دوست احباب اور جماعت کے بہت سے ارکان نشان افسوس بنے کھڑے تھے اور اندر ڈاکٹر صاحبان حاجی صاحب کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے۔

پتا چلا کہ آج صبح لارنس روڈ پر انھیں اپنی گاڑی میں ڈرائیور سیٹ پر مردہ پایا گیا۔ موقعہ واردات پر ان کے ملنے والے بہت سے لوگ پہنچے، مختلف لوگوں نے بہت سی باتیں کیں اور ایک دوسرے سے حیرانی اور تعجب سے کیں۔ وہ کہاں سے آرہے تھے؟ رات کہاں رہے؟ کس وقت موت واقع ہوئی؟ موت کا باعث کیا تھا؟ باتیں ہوتی رہیں لیکن کوئی صحیح نتیجے تک نہ پہنچ سکا اور قتل کے محرک اور وجہ کا کسی کو پتا نہ چل سکا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد لاش قانون کے مطابق ان کے وارثوں کے حوالے کر دی گئی اور پھر ان کے گھر واقع گاندھی سکوائر پہنچا دی گئی، جہاں ایک کہرام بپا تھا اور غم واندوہ کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔

نمازِ مغرب کے بعد جنازہ اٹھا، جس میں کثیر تعداد میں لوگ شامل تھے۔ چار پائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جنازے کو کندھا دے سکیں یا اسے ہاتھ لگا سکیں۔

جنازہ بہاول پور روڈ والی جنازگاہ میں ان کے دیرینہ ساتھی حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف نے پڑھایا اور انھیں میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس طرح ہم نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے ہاتھوں سے اس پیکرِ خلوص ساتھی پر منوں مٹی ڈال دی، جس کے ساتھ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۹ء تک پورے اکیس برس انتہائی قریبی مراسم رہے تھے اور جن سے ہر روز کی ملاقات تھی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

ان کی وفات سے دوسرے دن آٹھ ستمبر کو دس بجے کے قریب اس وقت کی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم مالیات میاں عبدالمجید کی کوٹھی نمبر ۷ سرکلر روڈ (بیرون یکی دروازہ) میں ایک تعزیتی اجلاس ہوا، جس میں مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عطاء اللہ حنیف اور ان سطور کے رقم سمیت بہت سے ارکان جماعت شامل تھے۔ میاں عبدالمجید مرحوم کے والد محترم میاں عبدالعزیز مالواڈا مرحوم بھی موجود تھے جو بیرسٹر تھے اور اپنے دور وکالت میں فوج داری مقدمات کے مشہور وکیل تھے۔ انھوں نے حاضرینِ مجلس سے چند سوالات کیے، جن کے جواب اس دور کی جمعیت اہل حدیث لاہور کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد رمضان مرحوم نے دیے۔

سوال: حاجی صاحب جہاں مردہ پائے گئے وہاں کوئی نئی یا پرانی چیز، کپڑا یا جوتی وغیرہ موجود تھی؟

جواب: ایک چھتر وہاں پڑا تھا۔

سوال: وہ چھتر اس پولیس نے جو قتل کی اطلاع پا کر وہاں پہنچی تھی، قبضے میں کیا؟

جواب: نہیں۔

سوال: کسی پولیس والے نے یا کسی اور نے یہ کہا کہ اس شان دار سڑک پر یہ چھتر کہاں سے آیا؟

جواب: نہیں۔

سوال: گاڑی کی چھت یا اس کے انجن وغیرہ پر گردوغبار تھی؟

جواب: تھی۔

سوال: گاڑی پر گردوغبار کی وجہ سے انگلیوں کے نشان تھے؟

جواب: تھے۔

سوال: ان نشانات کے بارے میں پولیس نے کوئی بات کی اور ان کا نقشہ بنایا؟

جواب: نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان چند سوالات اور ان کے جوابات کے بعد میاں عبدالعزیز مالواڈا مرحوم نے کہا: قتل کا سراغ نہیں مل سکے گا۔ پولیس نے نہ چھتر قبضے میں کیا۔ نہ انگلیوں کے نشانات وغیرہ کا نقشہ بنایا، قتل کا پتا کیوں کر چلے گا؟ قتل تو ان ہی چیزوں میں تھا، جن کی طرف پولیس نے توجہ نہیں کی۔

اس حادثے پر ۴۸ برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اس دور کے بہت سے لوگ جن کا شمار حاجی صاحب کے دوستوں اور ملنے والوں میں ہوتا تھا، وفات پا چکے ہیں۔ لیکن ان کے سانحۂ قتل کا پتا نہیں چل سکا۔

اب چند سطور ان کے ڈرائیور عبدالکریم کے بارے میں!

حاجی صاحب اپنے اس ڈرائیور پر بہت اعتماد کرتے تھے اور جہاں تک میں جانتا ہوں، وہ واقعی قابلِ اعتماد شخص تھا۔ حاجی صاحب شام سے پہلے اسے چھٹی دے دیتے تھے اور وہ اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں کہیں آنا جانا ہوتا تو حاجی صاحب خود ہی گاڑی چلاتے تھے۔ جس دن ان کے قتل کا حادثہ پیش آیا اس دن کے متعلق سنا تھا کہ وہ شام کے بعد گلبرگ کسی کے گھر گئے تھے۔ کس کے گھر گئے؟ یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ یہ بھی پتا نہیں چلا کہ کسی کے بلانے پر گئے تھے یا خود ہی گئے تھے۔ گاڑی میں اکیلے تھے یا کوئی اور بھی ان کے ساتھ تھا۔ واپسی پر اس مقام سے چند قدم آگے پہنچے (جہاں آج کل مرکز اہل حدیث واقع ہے) تو ان کی موت کا حادثہ پیش آیا، جس کی وجہ کا کچھ علم نہیں ہوسکا۔

ان کی وفات کے بعد عبدالکریم کی مجھ سے دو یا تین دفعہ ہی ملاقات ہوسکی۔ وہ جب ملا نہایت احترام سے ملا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے حاجی صاحب کی وفات سے کچھ عرصے بعد ایک دن بتایا کہ وہ لاہور سے راولپنڈی جانا چاہتے تھے، ویگنوں کے اڈے پر پہنچے تو انھیں عبدالکریم نے دیکھ لیا۔ دوڑ کر آیا اور سلام کیا۔ اس نے مولانا سے کہا کہ وہ لاہور اور راولپنڈی روٹ پر ویگن چلاتا ہے۔ لیکن اس دن اس نے چھٹی کی تھی۔ وہ یوں ہی اڈے پر آ گیا تھا۔

حاجی صاحب کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے کا نام خالد شجاع ہے اور چھوٹے کا سعود حنیف......! حاجی صاحب کی وفات کے وقت خالد شجاع کی عمر اکیس بائیس سال ہوگی۔ ان کی شادی ان کی وفات کے بعد سرگودھا میں ہوئی تھی۔ ان سے جب ملاقات ہوتی ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں ملتے ہیں، بہت اچھی طرح ملتے ہیں۔ اپنے مرحوم والد سے میرے تعلقات کا انھیں اچھی طرح علم ہے اور ملاقات کے وقت وہ ان تعلقات کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اپنے اہل وعیال سمیت گاندھی سکوائر والے اسی مکان میں رہتے ہیں، جہاں ان کے والدین رہتے تھے۔ کاروبار کرتے ہیں اور مطمئن ہیں۔

چھوٹے بیٹے سعود حنیف کی ولادت ۳۱۔ مارچ ۱۹۵۶ء کو ہوئی تھی اور شاہ سعود کے نام سے باپ نے اپنے اس بیٹے کا نام سعود رکھا تھا۔ ہم حسب معلوم ایک دن ان کی دکان پر گئے تو بیٹے کی ولادت کی خوش خبری سنائی اور نام بھی بتایا۔ مٹھائی بھی کھلائی...... سعود صاحب گارڈن ٹاؤن کے احمد بلاک میں رہتے ہیں اور کاروباری اعتبار سے ماشاء اللہ خوش نصیب ہیں۔ کہیں ملیں تو نہایت احترام سے پیش آتے ہیں۔

دونوں بھائی ماشاء اللہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں والے ہیں۔ بچوں کی شادیوں پر اس فقیر کو دعوت دیتے ہیں۔ خالد شجاع دارالدعوۃ السّلفیہ کے رکن ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے مخلص دوست حاجی محمد اسحاق حنیف کی آل اولاد کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے اور یہ لوگ اس کے دین کے سچے خادم ثابت ہوں۔

آمین یا رب العالمین

☆☆☆☆☆

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا عبید اللہ احرار

(وفات ۲۰۔فروری ۱۹۷۵ء)

کسی زمانے میں متحدہ پنجاب کے شہر فیروز پور میں ایک راجپوت صراف خاندان آباد تھا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ کا نام حاجی نور محمد تھا۔ اپنی صالحیت، دیانت اور صاف ستھرے کردار کی وجہ سے شہر اور ضلع فیروز پور میں حاجی نور محمد کا بڑا نام تھا۔ ان کا تعلق حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور حضرت سید احمد شہید کی تحریکِ مجاہدین سے تھا اور اس نواح میں ان کے گھر اور ان کی ذات کو اس تحریک کے خفیہ مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حاجی صاحب کو مال و دولت سے بھی نوازا تھا اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کا حوصلہ بھی عطا فرمایا تھا۔ وہ تحریکِ مجاہدین کے بہت بڑے معاون تھے اور خفیہ طور سے ان کے گھر میں جماعتِ مجاہدین کے کارکنوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ حاجی نور محمد اور ان کے خاندان کے لوگ پنجاب کے دو خاندانوں کے علمی اور عملی کارناموں سے بہت متاثر تھے۔ وہ تھے غزنوی اور لکھوی خاندان۔ ان خاندانوں کے مراسم بھی جماعت مجاہدین سے تھے۔ حاجی صاحب کی زیارت کا ہمیں شرف حاصل نہیں ہوا۔

فیروز پور میں جماعت اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی، جسے گنبداں والی مسجد کہا جاتا تھا۔ حاجی صاحب اور ان کے خاندان کے افراد اس مسجد کی دیکھ بھال میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ مولانا عبید اللہ احرار جن کا ان سطور میں تذکرہ کرنا مقصود ہے انھی حاجی نور محمد کے فرزند نام دار تھے، جو ۱۹۰۰ء کے پس وپیش پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ رکھا اور جماعت مجاہدین کی خدمت اور انگریزی اقتدار کی مخالفت کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ قرار دیا۔ وہ مجلس احرار سے والہانہ وابستگی رکھتے تھے اور احرار مقررین بالخصوص سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بے حد مداح تھے۔ شاہ جی کی تقریر، ان کی مجلسی گفتگو، ان کی جرأت مندانہ انگریز دشمنی،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے لطائف، توحید کے موضوع پر ان کے دل نشین مواعظ اور مرزائیت پر ان کی جارحانہ تنقید کے متعلق مولانا عبیداللہ احرار ایسے لہجے میں گفتگو کرتے اور اس انداز میں ان کے مختلف واقعات کو موضوع سخن بناتے کہ لطف آجاتا اور ایسے معلوم ہوتا کہ واقعتاً ہم شاہ جی کی مجلس میں بیٹھے ہیں اور براہِ راست ان کی زبان سے ان کے ارشادات سن رہے ہیں۔

عبیداللہ احرار معروف معنوں میں عالم دین نہ تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے اوصاف سے نوازا تھا۔ قرآن مجید پر بڑا استحضار تھا۔ بہت اچھے مقرر تھے اور دوران تقریر یا عام مجلس کی گفتگو میں برمحل قرآنی آیات کی تلاوت کرتے۔ مناسب مواقع پر نبی ﷺ کی احادیث پاک کے حوالے دیتے۔ صحابہ کرام، ائمہ عظام اور بزرگانِ دین کے بے شمار واقعات انھیں زبانی یاد تھے۔ ضرورت کے وقت ان کا خوب صورت الفاظ میں تذکرہ کرتے، اردو کے متعدد قدیم وجدید شعرا کے درجنوں اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ پنجابی شعرا کے بھی کتنے ہی اشعار ان کے نوک زبان تھے۔ لطائف کی بھی ان کے ہاں کمی نہ تھی۔ لہجہ خالص مقررانہ تھا۔ تقریر کرتے تو سماں بندھ جاتا۔ بے خوف، جری اور بہادر آدمی تھے اور یہ صفات انھیں اپنے پاک باز اسلاف سے ورثے میں ملی تھیں۔

حضرت مولانا سید محمد دد غزنوی کے وہ دست راست تھے۔ مرکزی جمعیتِ اہلِ حدیث کی تنظیم کے قیام (جولائی ۱۹۴۸ء) سے زندگی کے آخری دم تک اس کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ صائب اور صحیح مشورے دیتے تھے۔ فیصل آباد کی شہری اور ضلعی جمعیت میں ان کو باوقار مقام حاصل تھا اور ان کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا۔ شہر کے تمام سیاسی و مذہبی حلقوں کے لوگ ان کے قدردان تھے اور ہر حلقہ فکر میں اس بلند آہنگ شخص کو پذیرائی حاصل تھی۔

جماعت اہلِ حدیث کے ممتاز رکن ہونے کے علاوہ پاکستان کی مجلسِ احرار کے صدر تھے۔ اس حیثیت سے بھی ہر طبقے میں انھیں تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس مردِ عالی ہمت کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو کیوں نہ ان کے بارے میں چند اور باتیں بھی بیان کر دی جائیں تا کہ ان کی عملی زندگی اور عادات واطوار کے مختلف پہلو قارئین ذی احترام کے سامنے اجاگر ہو سکیں۔

عبیداللہ احرار کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں فیروز پور میں دیکھا تھا، جب کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت مولانا محمد علی لکھوی کی کوشش سے وہاں مجلس احرار کا سہ روزہ جلسہ عام منعقد ہوا تھا۔ اس میں تمام احرار رہنما شریک تھے اور مجلس احرار اس عہد کے متحدہ ہندوستان کی اہم سیاسی جماعت تھی۔ اس کے مقرر انگریزی سامراج کے خلاف تقریریں کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زبانیں آگ اگل رہی ہیں اور ان کے جذبات کی شدت نے گویائی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ احرار جیسے تیز کلام اور صاف لہجے شجاعت کے پیشہ انگریز دشمن مقرر برصغیر کی کسی جماعت نے پیدا نہیں کیے۔ وہ اس ہنگامہ خیز دور کے ہنگامہ خیز مقرر تھے۔ میں نے تقریباً تمام احرار مقرروں کی تقریریں سنی ہیں۔ ان کا سٹیج انگریز اور اس کے حامیوں کے خلاف شعلہ جوالہ کا منظر پیش کرتا تھا۔ وہ غیر ملکی محکومی کی وجہ سے تقریروں کا زمانہ تھا۔ اب نہ وہ زمانہ رہا ہے، نہ اس قسم کی تقریریں کی جاسکتی ہیں اور نہ یہ ان تقریروں کا موسم ہے۔

اسی زمانے میں مولانا محمد علی لکھوی کی تحریک سے فیروز پور میں وہاں کی انجمن اہلِ حدیث کا سہ روزہ سالانہ جلسہ ہوا تھا۔ وہاں بھی مولانا عبیداللہ احرار کو دیکھا۔ پھر ایک مرتبہ ہمارے ہاں (کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ) کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں مولانا عبیداللہ احرار اور ان کے دیگر احرار ساتھی اس دور کے ایک احرار مقرر مولانا محمد علی جالندھری کو لے کر وہاں گئے تھے۔ انھوں نے ریاستی حالات کے مطابق سلجھے ہوئے انداز میں بڑی موثر تقریر کی تھی۔

اس کے بعد ایک وقت آیا کہ ۱۹۳۸ء میں فیروز پور کی انجمن اہل حدیث کے ارکان حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو گنبداں والی مسجد کے خطیب اور مدرس کی حیثیت سے وہاں لے گئے۔ میں بھی طالب علم کے طور پر مولانا ممدوح کے ساتھ وہاں گیا۔ اب مولانا عبیداللہ احرار سے تعلقات استوار ہوئے۔ وہ عمر میں مجھ سے کم و بیش پچیس چھبیس سال بڑے تھے، لیکن ان کی شفقت اور اسلوب کلام نے مجھے ان سے اتنا قریب کردیا کہ آہستہ آہستہ تفاوت عمر کے باوجود فکری ہم آہنگی کی بنا پر ہمارے درمیان باہم دوستی کے آثار ابھر آئے، جن کی وہ بھی عمر بھر آب یاری کرتے رہے اور میں نے بھی ہمیشہ انھیں تر و تازہ رکھنے کی کوشش کی۔

اس زمانے کے مولانا عبیداللہ احرار کا حلیہ ملاحظہ فرمایئے: پورا قد، گداز جسم، بھرا ہوا گول گندم گوں چہرہ، ابھری ہوئی ناک، روشن آنکھیں، کھلی پیشانی، کشادہ سینہ، خوش مزاج

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور خوش اخلاق، صاف ستھرا سادہ لباس، سفید شلوار قمیص زیب تن۔ سر پر کلے والا عمامہ، دوستوں کے دوست۔ لوگوں سے بنا کر رکھنے کے عادی، کھنک دار آواز، کسی کے سامنے جھکنا اور کمزوری کا اظہار کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔

فیروز پور میں احرار عددی لحاظ سے کم تھے، لیکن زوردار اور بلند ہمت لوگ تھے۔ عبید اللہ احرار کی صرافے کی دکان پر کانگریسی بھی آتے تھے، مسلم لیگی بھی آتے تھے اور احراری بھی آتے تھے۔ وہ سیاسی بحثوں کا دور تھا اور ان کی دکان پر یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ عبید اللہ احرار سب سے پنجہ آزمائی کرتے اور ہنسی مذاق میں ایسی باتیں کہہ جاتے، جو دوسروں کے لیے کہنی مشکل ہوتی تھیں۔ ان کی باغ و بہار طبیعت سب کے لیے باعث کشش تھی اور ان کی گفتگو قابلِ شنید۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھے مطالعہ کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ ''الہلال'' کا مجلد فائل دیا۔ میں نے اسے بے حد شوق سے پڑھا اور بعض مضامین کا ایک سے زیادہ مرتبہ مطالعہ کیا۔ پھر وہ فائل مجھ سے میرے ایک بزرگ رشتے دار نے لیا۔ انھوں نے اسے دلچسپی سے پڑھا۔ ان سے میرے پاس واپس آیا تو ایک تعلیم یافتہ ہندو کو اس کا پتا چل گیا، وہ مجھ سے ملا اور ''الہلال'' کے وہ شمارے پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ پھر ملک تقسیم ہو گیا اور ''الہلال'' کا فائل اسی کے پاس رہا۔

میرے فیروز پور کے زمانہ طالب علمی میں مولانا عبید اللہ احرار کی اہلیہ اور ان کی ہمشیرہ (یا بھانجی) وہاں کے رام سکھ داس کالج (آر ایس ڈی کالج) میں پڑھتی تھیں۔ ان کی اہلیہ غالباً بی اے کی طالبہ تھیں۔ کالج کے پرنسپل کا نام پی وی کنل تھا جو ہندوؤں کے دیوسماج فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ملک کے سیاسی لیڈروں کا وہ شدید مخالف بلکہ دشمن تھا اور ''نیتی کی گھنٹی'' میں سیاسی رہنماؤں کو نشانہ تنقید بنایا تھا۔ طلباء نے اس پر احتجاج کیا، بعض اور لوگوں نے بھی اس کے طرز تنقید کو ناروا قرار دیا، لیکن اس نے کسی کی بات کو اہمیت نہ دی اور اپنا انداز تنقید جاری رکھا۔ یہ صورت حال فیروز پور کے عوام اور طلباء کے لیے ناقابل برداشت تھی، چناں چہ شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ جو فیروز پور کے مشہور احرار لیڈر تھے، آگے بڑھے اور گوکھلے ہال میں رات کو جلسہ کیا اور بہت بڑے مجمع میں کالج کے سامنے پکٹنگ کرنے کا اعلان کر دیا۔ پکٹنگ میں عبید اللہ احرار نے بھی حصہ لیا۔ میں بھی پکٹنگ کرنے والوں میں شامل تھا اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روزانہ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پکٹنگ کا مطلب یہ تھا کہ ہم کالج کے دروازے کے آگے لیٹ جاتے تھے تاکہ کوئی استاد یا طالب علم کالج میں داخل نہ ہوسکے۔ پولیس بہت بڑی تعداد میں وہاں موجود رہتی تھی۔ پولیس ہمیں گرفتار کر کے پہلے تھانے لے گئی، پھر فیروزپور جیل میں بند کردیا۔ بہت سے لوگ گرفتار تھے۔ مولانا عبیداللہ احرار کا جیل میں سلسلہ تقریر جاری رہتا تھا۔ پندرہ دن ہم لوگ جیل میں رہے۔ پھر پرنسپل نے ملک کے سیاسی قائدین پر تنقید نہ کرنے کا تحریری وعدہ کیا تو تحریک ختم ہوگئی اور گرفتار شدہ لوگوں کو رہا کردیا گیا۔

مولانا عبیداللہ احرار کی اہلیہ بی اے بی ٹی تھیں اور فیروزپور کے ایک گرلز ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ تقسیم ملک کے بعد یہ خاندان لائل پور آیا تو یہاں بھی لڑکیوں کے ہائی سکول میں انھیں ہیڈ مسٹریس مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی وفات شوہر نامدار کی وفات کے بعد ہوئی۔

مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد میں بارہا فیروزپور گیا اور مولانا عبیداللہ احرار سے ملا۔ ان سے ملنا اور ان کی باتیں سننا یوں سمجھیے کہ میرے لیے روح کی غذا تھی اور ذہن کی طراوت کا سامان۔ اس زمانے میں لاہور سے سہ روزہ اخبار ''زمزم'' شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر محمد عثمان فارقلیط تھے۔ یہ اخبار نیشنلزم کا حامی تھا اور بہت پڑھا جاتا تھا۔ اس کا دفتر اردو بازار میں تھا، جسے اس وقت موہن لال روڈ کہا جاتا تھا۔ میں اور مولانا عبیداللہ احرار اس اخبار کے ایڈیٹر سے ملنے کے لیے ایک مرتبہ لاہور آئے تھے۔ یہ اب یاد نہیں رہا کہ ان سے ہم نے کس سلسلے میں ملاقات کی تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ کافی دیر ہم نے ان سے باتیں کیں اور انھوں نے نہایت توجہ سے ہماری باتیں سنیں اور ان کے جواب سے ہم مطمئن ہوئے۔

۱۹۴۵ء میں انتخابات کا اعلان ہوا تو حضرت مولانا محمد علی لکھوی نے مدینہ منورہ سے اپنے صاحب زادوں مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین لکھوی کو خط لکھا کہ ضلع فیروزپور سے نواب ممدوٹ (افتخار حسین خاں) مسلم لیگ کی طرف سے انتخاب لڑیں گے، آپ لوگ ان کا مقابلہ کریں۔ چناں چہ مولانا محی الدین لکھوی نے مجلس احرار کے ٹکٹ پر نواب ممدوٹ کے خلاف انتخاب لڑنے کا اعلان کردیا۔ کئی دن میں اور مولانا معین الدین لکھوی ان کے حلقے میں گھومتے رہے۔ اچانک ایک دن کسی شخص کی معرفت مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی مرحوم کا پیغام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آ گیا کہ نواب ممدوٹ کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ چناں چہ مولانا محی الدین لکھوی نے ارادہ بدل دیا۔

جنوری کا مہینا اور سال ۱۹۴۶ء تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت مرکز الاسلام کے احاطے میں ایک کار داخل ہوئی۔ اس سے مولانا عبیداللہ احرار اور جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کے موجودہ شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیم کے والد محترم مولانا عبدالرحیم باہر نکلے۔ ان کے بعد ایک اور صاحب باہر آئے۔ درمیانہ قد اور نہایت خوب صورت۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا عبدالغفار غزنوی ہیں۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے چھوٹے بھائی۔ تحصیل چونیاں سے کانگرس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے ہیں اور مسلم لیگ کی طرف سے ان کے مدِ مقابل میاں افتخار الدین ہیں، جو تھوڑا عرصہ قبل پنجاب کانگرس کی صدارت سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ مولانا عبدالرحیم اور مولانا عبیداللہ احرار چاہتے تھے کہ مولانا عبدالغفار غزنوی کے حلقہ انتخاب میں جا کر ان کی مدد کی جائے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا معین الدین اس وقت مرکز الاسلام میں نہیں تھے۔ میں اور مولانا محی الدین لکھوی موجود تھے۔ چناں چہ ہم دونوں ان کے ساتھ گئے۔ مولانا عبیداللہ احرار تو فیروز پور چلے گئے اور مولانا محی الدین لکھوی اور یہ بندۂ عاجز مولانا عبدالغفار غزنوی کے ساتھ گئے۔ مولانا عبدالرحیم بھی ساتھ تھے جو اس دور کے بہت بڑے احراری اور زوردار مقرر تھے اور پہلے سے مولانا عبدالغفار غزنوی کے حلقۂ انتخاب میں کام کر رہے تھے۔ ہم چھ سات روز ان کے ساتھ رہے اور مختلف مقامات میں گئے اور ان کے حق میں تقریریں کیں۔ لیکن وہ مسلم لیگ کا زمانہ تھا اور مسلم لیگی امیدوار ہی کامیاب ہوئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ۱۹۷۱ء پیپلز پارٹی کا زمانہ تھا اور پیپلز پارٹی کے امیدوار بہت بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے۔ دریائے اٹک سے لے کر دہلی کی دیواروں تک پھیلے ہوئے پنجاب کے انتیس ضلعوں میں کانگرس کے ٹکٹ پر صرف ایک مسلمان کی کامیابی کا اعلان ہوا تھا اور وہ تھے مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔ کانگرس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے والے باقی تمام مسلمان ہار گئے تھے۔ البتہ چند آزاد مسلمان اور یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لینے والے کچھ مسلمان جیت گئے تھے۔

پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مولانا محی الدین لکھوی انتخاب سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اب نواب ممدوٹ کے مقابلے میں میاں سرور بودلہ تھے جو نواب ممدوٹ کے بعد ضلع فیروز پور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ بارہ دیہات کے مالک تھے اور یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے۔ میں اور مولانا عبیداللہ احرار دو تین مرتبہ ان کے حلقے میں گئے اور ان کو ووٹ دینے کے لیے بعض لوگوں سے کہا۔ ایک یا دو جگہ پبلک تقریریں بھی کیں، لیکن اس وقت ہر طرف مسلم لیگ ہی کا چرچا تھا۔ کوئی اس کو برا کہے یا اچھا، ہمارا کام تو اپنی حد تک مسلم لیگ کی مخالفت کرنا تھا اور وہ کسی نہ کسی صورت میں کرتے رہے۔

ملک تقسیم ہوا تو ہم لوگ ضلع لائل پور کی تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں چک نمبر ۵۳ گ۔ب میں آگئے۔ ان دنوں پرانے دوست بہت یاد آتے تھے اور جی بہت اداس تھا۔ کوئی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ ایک دن کسی نے بتایا کہ تمھارے فیروز پوری دوست مولوی عبیداللہ احرار لائل پور آگئے ہیں۔ یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی۔ میں نے لائل پور نہیں دیکھا تھا اور کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ کتنا بڑا شہر ہے۔ خیال ہوا کہ عبیداللہ احرار جس طرح فیروز پور میں مشہور تھے، اسی طرح لائل پور میں مشہور ہوں گے اور سب لوگ انھیں جانتے ہوں گے۔ کسی سے پوچھ کر ان کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ ہمارا گاؤں جڑاں والا سے لائل پور جانے والی سڑک سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ہوگا۔ یہ عصر کے بعد کا وقت تھا، میں اسی وقت گاؤں سے چلا اور سڑک پر آگیا کہ یہاں سے بس پر سوار ہو کر لائل پور چلا جاؤں گا اور رات مولوی عبیداللہ احرار کے پاس رہوں گا۔ ابھی سڑک پر آیا ہی تھا کہ جڑاں والا کی طرف ایک ٹرک آیا اور میرے پاس آکر رکا۔ وہ ہمارے عزیزوں کا ٹرک تھا جو لائل پور جا رہا تھا۔ ہمارے پرانے وطن میں ہمارا ٹرانسپورٹ کا کام تھا۔

ڈرائیور نے نیچے اتر کر مجھے کہا یہاں کیوں کھڑے ہو......؟ اور کہاں جانا چاہتے ہو......؟ میں نے کہا لائل پور جانے کا ارادہ ہے۔ اس نے کہا آؤ میرے ساتھ بیٹھو، میں وہیں جا رہا ہوں۔ جہاں کہو گے چھوڑ آؤں گا۔ چناں چہ میں لائل پور پہنچ گیا۔ شہر کی حد میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک خوب صورت عمارت نظر آئی، جس پر انگریزی اور اردو میں لکھا تھا خالصہ کالج لائل پور۔ اس میں بہت سے سکھ اور ہندو بیٹھے تھے، جو ہندوستان جانا چاہتے تھے۔ یہ کالج اس وقت ان کا کیمپ تھا۔ اب میرے خیال میں اس کا نام میونسپل کالج ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہ ہر حال میں ٹرک سے ریل بازار کے باہر اتر گیا۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں نے مولانا عبید اللہ احرار کے بارے میں بعض لوگوں سے پوچھا لیکن کچھ پتا نہ چلا۔ پوچھتے پچھاتے کارخانہ بازار میں پہنچ گیا۔ اس کی ایک گلی میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ ٹمبر مارکیٹ ہے۔ وہاں بچے کھیل رہے تھے۔ ان سے پوچھا تو ایک بچے نے ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اس مکان کی اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔'' میں وہاں کھڑا ہو گیا۔ اس بچے نے گھنٹی بجائی تو مولانا عبید اللہ احرار نے اوپر کھڑکی سے سر نکال کر اونچی آواز میں کہا ''او اسحاق! توں کتھے......؟'' (او اسحاق! تم کہاں......؟) پھر جلدی سے نیچے اترے اور بغل گیر ہو گئے۔ ان کی مرحومہ بیوی مجھے جانتی تھیں۔ وہ بھی بہت خوش ہوئیں۔ کہا ہم تمھیں حلوا کھلائیں گے۔ لیکن یہ گڑ کا حلوا ہے اور گڑ بھی کالا ہے۔ چینی نہیں ملتی۔ میں اور عبید اللہ احرار شب کے دو بجے تک باتیں کرتے اور پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔

۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو لاہور میں مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا عبید اللہ احرار اس کے تاسیسی اجلاس میں شامل تھے۔

مولانا عبید اللہ احرار اپنے روزگار کے علاوہ فیروز پور میں دو کاموں میں سرگرم رہتے تھے۔ ایک جماعتی کام اور مسجد گنبداں والی کی دیکھ بھال میں، دوسرے مجلس احرار کے سیاسی معاملات میں۔ لائل پور میں بھی اپنے معاشی معاملے کے علاوہ ان ہی دو کاموں کو انھوں نے ہدف التفات ٹھہرائے رکھا۔ ان کو یہاں خوش قسمتی سے احراری بھی مل گئے تھے اور جماعت اہلِ حدیث کے ارکان بھی کثیر تعداد میں میسر آگئے تھے۔ ان کی کوشش سے تقسیم ملک سے تھوڑا عرصہ بعد لائل پور میں مجلس احرار کا جلسہ عام ہوا، جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سمیت تمام احرار رہنما شریک ہوئے اور نئے حالات کے مطابق انھوں نے تقریروں میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اور صاف لفظوں میں کہا کہ ہم اپنی ریاست میں ہار گئے اور مسلم لیگ جیت گئی۔ اب ہم نئے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہم نے برصغیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ برصغیر آزاد ہو گیا، لیکن اس آزادی کی ہمیں بہت قیمت ادا کرنی پڑی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غالباً ۱۹۴۹ء کے آخر کی بات ہے کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عطاء اللہ حنیف اور یہ فقیر جمعیت کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں لائل پور گئے۔ ہم چاروں کا قیام مولانا عبیداللہ احرار کے مکان پر رہا اور میٹنگ جامع مسجد اہلِ حدیث میں ہوئی تھی۔ مولانا عبیداللہ احرار نے مولانا غزنوی اور ان کے رفقا کے اپنے یہاں قیام کو اپنے لیے اعزاز قرار دیا۔

لائل پور میں جمعیت کے تنظیمی معاملات سے متعلق مولانا غزنوی ہمیشہ مولانا عبیداللہ احرار کو اہمیت دیتے رہے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک وجہ یہ کہ مولانا عبیداللہ احرار کے اسلاف مولانا غزنوی کے اسلاف سے تعلق عقیدت رکھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عبیداللہ احرار کا تعلق مجلس احرار سے تھا اور مجلس احرار کے قیام کے بعد کئی سال مولانا غزنوی اس کے جنرل سیکرٹری رہے تھے اور ۱۹۳۰ء کی تحریکِ کشمیر اور ملک کی دیگر سیاسی تحریکوں میں فیروز پور کے احرار کارکنوں نے سرگرم کردار ادا کیا تھا، اس سے مولانا خوب آگاہ تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ مولانا عبیداللہ احرار صاف گو اور جرأت مند رکن جماعت تھے اور دھڑلے سے بات کرتے تھے۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ جو ذمے داری ان کے سپرد کی جاتی اسے پورا کرنے کی آخری حد تک کوشش کرتے اور بالعموم اس میں کامیاب رہتے۔

مرزائیوں سے مولانا عبیداللہ احرار کو شدید تنفر تھا اور مرزائیوں کے خلاف جو تحریک اٹھی اس میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۵۳ء کی مرزائیت کے خلاف تحریک میں پنجاب نے خاص طور سے بے پناہ قربانیاں دی تھیں اور صوبے کے دیہات وقصبات اور شہروں سے لاتعداد لوگوں کو حکومت نے گرفتار کرلیا تھا۔ لائل پور کی جامع مسجد میں ضلع کے ہزاروں لوگ گرفتاریاں پیش کرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایک دن لاہور سے میں اور مولانا محمد حنیف ندوی لائل پور گئے اور جامع مسجد میں حاضری دی تو وہاں مولانا علی محمد صمصام اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی موجود تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور کافی دیر ان سے تحریک کے بارے میں سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ شام کو ہم لاہور واپس آگئے۔ اس وقت مولانا عبیداللہ احرار گرفتار تھے اور اپنے متعدد رفقاے کرام کے ساتھ لائل پور میں قید تھے۔

ایک روز میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تو ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ جیل کی ڈیوڑھی میں جیل کے عملے سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ کسی قیدی سے ملاقات کرانا اب ہمارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختیار میں نہیں، البتہ سپرنٹنڈنٹ جیل ملاقات کرا سکتا ہے۔ وہ شریف آدمی ہے اور قیدیوں کا ہمدرد ہے۔ آپ ان سے ملیے، وہ ملاقات کرادے گا۔ ان لوگوں نے مجھے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا مکان بتایا اور میں اس سے ملا۔ وہ واقعی بہت شریف آدمی تھا۔ بڑے احترام سے ملا اور پوچھا کہاں سے آئے ہو اور کیا کرتے ہو......؟ میں نے بتایا کہ لاہور سے آیا ہوں اور ایک اخبار میں کام کرتا ہوں۔ اس نے مجھے پانی پلایا اور جیل کے اندر مولانا عبیداللہ احرار اور ان کے ساتھیوں کی بارک میں لے گیا اور کہا کہ ایک گھنٹے تک آدمی آئے گا اور آپ کو باہر لے آئے گا۔ اتنی دیر آپ ان سے باتیں کیجیے۔

وہاں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف اور میرے جاننے والے متعدد حضرات موجود تھے۔ اس وقت یہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر عبیداللہ احرار نے نعرہ لگایا ''وہ دیکھو! اسحاق بھی آگیا۔'' مولانا عبیداللہ احرار کی وہ ہی زندہ دلی، خوش کن ادائیں اور وہ ہی خوش طبعی اور لطیفہ بازی جیل میں بھی تھی، جو ہمیشہ سے ان کا طرۂ امتیاز چلی آرہی تھی۔ ان دنوں چک نمبر ۳۶ گ۔ب کے بہت سے لوگ اس تحریک میں گرفتار تھے اور جیل میں بند تھے۔ مولانا عبیداللہ احرار ان کی بارک میں بھی مجھے لے گئے۔

مولانا عبیداللہ احرار جماعت اہلِ حدیث کے مخلص ترین خادم تھے۔ جامعہ سلفیہ کے قیام اور اس کی تعمیر میں انھوں نے بے حد خدمات سرانجام دیں۔ وہ جامعہ کے بانی رکن تھے اور ہر طبقے میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اس لیے مولانا غزنوی کی تجویز سے انھیں جامعہ کا ناظم تعمیرات بنایا گیا تھا اور اس کی تعمیر میں انھوں نے جو بھاگ دوڑ کی، اس کا اللہ تعالیٰ ہی انھیں اجر عطا فرمانے والا ہے۔ وہ بالکل ابتدائی کام تھا اور دن رات کا کام تھا۔ مزدوروں اور معماروں سے رابطہ رکھنا اور ان سے کام لینا، تعمیر کے لیے لوگوں سے چندے کی اپیل کرنا، اینٹیں، بجری، سریا اور سیمنٹ وغیرہ کے حصول کے لیے مختلف مقامات پر آمد و رفت، یہ تمام کام انتہائی ذمہ دارانہ اور بے حد محنت طلب تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی کام پر جامعہ اور جماعت کی خدمت کو ترجیح دی اور کثرتِ کام کی وجہ سے ان کی مضبوط جسمانی صحت کا ڈھانچا ہل گیا اور انھیں شوگر کا مرض لاحق ہوگیا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور عمل و حرکت کا سلسلہ بہ دستور جاری رکھا۔

وہ پاکستان کی مجلس احرار کے صدر بھی تھے۔ یہ ذمہ داری بھی وقت اور محنت کی طالب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔ اس میں بھی وہ تندہی سے مصروف رہے۔ پھر شہر کی سماجی انجمنوں میں بھی ان کا عمل دخل تھا۔ اس ضمن میں پبلک جلسوں میں ان کی تقریروں کا سلسلہ بھی چلتا تھا۔ لیکن ان کی سب سے زیادہ مساعی جماعت اور جامعہ کے لیے وقف تھیں۔ اس تگ ودو میں ان کے پاؤں زخمی ہوگئے اور بیماری نے پوری طرح انھیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ علاج معالجے کے تمام دروازے بند ہوگئے۔ بالآخر ۲۰۔ فروری ۱۹۷۵ء (۹۔ صفر ۱۳۹۵ھ) کو جمعرات کے دن ۳ بجے دوپہر، ۷۵ برس کی عمر پا کر وہ مرد باہمت تمام جھمیلوں سے آزاد ہو کر راہی ملک بقا ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دوسرے دن نماز جمعہ کے بعد ان کا جنازہ مولانا عبداللہ لائل پوری نے پڑھایا، جس میں ضلع اور شہر فیصل آباد کے علاوہ سیالکوٹ، گوجراں والا، چنیوٹ، سرگودھا، لاہور، قصور، ملتان، خانیوال، ساہی وال، اوکاڑہ، جھنگ وغیرہ بلاد وقصبات کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ مجلسِ احرار پاکستان کے دور ونزدیک سے سیکڑوں احرار قائدین وارکان نماز جنازہ میں شامل ہوئے۔ شہر کی تمام سیاسی، مذہبی اور سماجی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شریک جنازہ تھے اور سب ان کے کارناموں کے مداح تھے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کر رہے تھے۔

مولانا عبیداللہ احرار کی گوناگوں خدمات کی بنا پر ہم عاجز بندوں کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرما دی ہوگی اور وہ جنت الفردوس میں شاداں وفرحاں ہوں گے۔ وفات کے وقت مولانا عبیداللہ احرار کے تین بیٹے تھے۔ بڑے سیف اللہ احرار تھے جو والد کی وفات سے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے تھے۔ ان سے چھوٹے محمد توقیر اور محمد طاہر ہیں، جو کاروبار کرتے ہیں۔ اور ملنسار اور خوش اخلاق ہیں۔ اپنے باپ سے تعلق رکھنے والوں کا انتہائی احترام کرتے ہیں۔ وضع قطع اور دین داری میں اپنے بزرگوں کی خوب صورت نشانی ہیں۔ مولانا عبیداللہ احرار کے نواسوں میں ایک نواسے کا نام ڈاکٹر محمد نوید شوکت ہے۔ مولانا عبیداللہ کے بیٹوں اور نواسے شوکت کا شمار میرے عزیز دوستوں میں ہوتا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس خاندان کے تمام افراد وارکان کو خوش رکھے اور اپنے نیک بخت اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازے۔

آمین یا رب العالمین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکیم محمد عبدالسلام ہزاروی

(وفات ۲۳۔جنوری ۱۹۷۷ء)

۱۹۴۸ء کے آخر کی بات ہے۔ مجھے لاہور آئے چند روز ہوئے تھے کہ میں نے جمعۃ المبارک کی نماز مسجد مبارک میں پڑھی۔ اس وقت اس مسجد میں خطابت کے فرائض مولانا محمد حنیف ندوی انجام دیتے تھے۔ جمعے کی نماز ہو چکی تو ایک صاحب جو برآمدے میں میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے، اٹھ کر مولانا محمد حنیف ندوی کے پاس گئے۔ انھوں نے مولانا کو سلام کیا تو مولانا نے ان کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا ارے حکیم صاحب آپ کہاں؟

ان صاحب کا حلیہ کچھ اس قسم کا تھا۔ میانہ قد، متناسب جسم نہ موٹے نہ دبلے پتلے، سرخی مائل رنگ، گول چہرہ، گرم چادر اوڑھے ہوئے، معتدل داڑھی۔ یہ تھے حکیم عبدالسلام ہزاروی۔

مولانا محمد حنیف ندوی سے باتیں کرتے ہوئے انھوں نے مولانا محمد داؤد غزنوی کے بارے میں پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے اور وہ آج کل کہاں ہیں؟ مولانا ندوی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ان کے متعلق زیادہ جانتے ہیں۔ ان دنوں میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا آفس سیکرٹری تھا اور اس کے صدر مولانا غزنوی تھے۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا آج بھی یہیں ہیں اور کل بھی یہیں ہوں گے۔

حکیم صاحب نے فرمایا میرا ان کی خدمت میں سلام عرض کرنا۔ میں کل حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں نے شام کو مولانا غزنوی کو حکیم صاحب کا سلام پہنچایا تو فرمایا اچھا حکیم صاحب لاہور آئے ہیں۔ پھر فرمایا آزادیٔ وطن کے لیے اس شخص نے بہت قربانی دی ہے۔ کئی سال مختلف جیلوں میں رہے۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ حکیم عبدالسلام دوسرے دن مولانا داؤد غزنوی سے ملنے کے لیے آئے یا نہیں آئے۔ میں نے ان کو اسی دن مولانا محمد حنیف ندوی کے پاس پہلی اور آخری دفعہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیکھا۔ اس کے بعد ان کی زیارت کا موقع نہیں ملا۔

اب آئندہ سطور میں حکیم عبدالسلام کے متعلق چند ضروری باتیں سنیے، جن کا تعلق ان کی تعلیمی زندگی سے بھی ہے، طبی زندگی سے بھی ہے، مجلسی زندگی سے بھی ہے، معاشرتی زندگی سے بھی ہے اور سیاسی زندگی سے بھی ہے۔

ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ وہ بہت بذلہ سنج تھے۔ ایک مرتبہ ایک اہل حدیث مریض ان کے پاس آئے اور انھیں ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ ''گیارھویں شریف'' کا اہتمام آپ کے لیے نہایت ضروری ہے۔

حکیم صاحب ممدوح ۱۹۰۶ء میں ہزارہ صوبہ سرحد کے ایک گاؤں میر پور میں پیدا ہوئے جو ہری پور سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کے والد گرامی مولوی محمد دین اپنے دور کے مجاہد صفت عالم دین تھے۔ حکیم صاحب نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد مکرم ہی سے حاصل کی اور اسی مناسبت سے ان کا تعلق بنیادی طور پر ہمیشہ علمی، مذہبی اور روحانی طبقات سے رہا۔ لیکن والد کا سایۂ شفقت زیادہ دیر بیٹے کے سر پر قائم نہیں رہا، وہ جلد ہی اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی وفات ۱۹۲۲ء میں طاعون کی وبا کے زمانے میں ہوئی۔ اس وقت حکیم صاحب کی عمر سولہ برس کی تھی۔ والد کی وفات کے بعد بھی لائق اور ہونہار بیٹے کا جذبۂ حصول علم بیدار رہا، حالاں کہ وہ مالی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ لیکن گھر سے نکلے اور مختلف مقامات کے مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کرتے رہے۔ اس کی تفصیل کا پورا علم نہیں ہو سکا۔ دینی علوم سے فراغت کے بعد انھوں نے علم طب پڑھا، جامعہ ملیہ اور طبیہ کالج دہلی کے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے (جو بعد میں صدر جمہوریہ ہند ہوئے) حکیم محمد اجمل خاں اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد سے تعلقات پیدا ہوئے۔ کہنا چاہیے کہ انھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ خداداد صلاحیت، بے حد محنت اور ہمت سے اپنی کمیوں اور بے سروسامانی کا مداوا کیا۔ یہ کہاوت ان پر پوری طرح صادق آتی ہے کہ ''دنیا بہترین کتاب اور زمانہ بہترین استاد ہے۔''

۱۹۲۷ء میں انھوں نے ہری پور میں اپنا مطب کھولا۔ اخبار بھی جاری کیا جو جلد ہی ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاست کی نذر ہو گیا۔ مگر مطب وہ کھولتے رہے۔ ہر رہائی کے بعد نیا مطلب اور نئے مقام پر۔ وہ سیاسیات میں بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ چناں چہ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے ہری پور میں کانگریس کمیٹی قائم کی، جس میں بہت سے انگریز دشمن لوگ شامل ہوئے۔ اس سے اگلے سال ۱۹۲۸ء میں انھیں ضلعی کانگرس کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بائیس برس کی تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں لوگوں کی طرف سے اتنا بڑا سیاسی اعزاز بہت اہم بات تھی۔ اسے حکیم صاحب کے ذاتی اثر و رسوخ کا نتیجہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور لوگوں کی انگریز دشمنی پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ نوجوان خون اس کے لیے زیادہ مفید ہوسکتا ہے، وہ صحیح تھے۔ حکیم صاحب واقعی مفید ثابت ہوئے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء میں جب کانگرس زیر زمیں تھی، اس وقت اس کے خفیہ پیغام رسانوں میں ایک حکیم عبدالسلام بھی تھے، جو بیس برس کے نوجوان تھے۔ انھوں نے انگریزی سوٹ پہنا، سر پر ہیٹ رکھا اور جسم کے ساتھ وہ خفیہ پیغامات باندھے جو مختلف کانگرسی لیڈروں کو پہنچانا تھے۔ صاحب بہادر بن کر گھر سے نکلے تاکہ کسی کو کوئی شک نہ گزرے۔ وہ اپنی منازل کی طرف روانہ ہوئے اور کامیاب رہے۔ ایک پیغام مولانا عبدالقادر قصوری صدر پنجاب کانگرس کے نام تھا۔ وہ پیغام بے حد اہم اور خطرناک تھا جو مولانا قصوری کو قصور پہنچایا۔ ۱۹۲۶ء کا پورا سال وہ اسی لباس میں پیغام رسانی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد کھدر کا لباس پہنا اور پھر تادم وفات اسی لباس میں رہے۔ شیروانی اور قراقلی ٹوپی بھی ان کا مرغوب پہناوا تھا۔

حکیم صاحب بے حد متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زبان میں بہت اثر تھا اور ملک کے سیاسی معاملات پر ان کی گہری نظر تھی، یہی وجہ ہے کہ انھیں جلد ہی صوبہ سرحد کی کانگرس کے منصب صدارت پر فائز کر دیا گیا تھا اور وہ آل انڈیا کانگریس کی مجلس عاملہ کے ممبر چن لیے گئے تھے۔ اس کے بعد ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے بہت قربانیاں دیں اور ان کی زندگی کا خاصا دور جیل میں گزرا۔

کانگرس عدم تشدد کی حامی تھی، لیکن اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جو عدم تشدد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعض پہلوؤں سے متفق نہ تھے۔ ان کے لیڈر سبھاش چندر بوس تھے جو کلکتہ کے رہنے والے اور بیرسٹر تھے۔ اس وقت ان کی وکالت کی ماہانہ آمدنی بیس ہزار روپے کے پس وپیش تھی۔ اس زمانے کو آج کے زمانے پر قیاس نہ کیجیے۔ اس سستے زمانے میں یہ بہت بڑی آمدنی تھی۔ سبھاش چندر بوس کے بڑے بھائی کا نام سرت چندر بوس تھا۔ حکیم عبدالسلام کا سبھاش چندر بوس سے تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ اس وقت سبھاش چندر بوس آل انڈیا کانگرس کے صدر تھے۔ جلد ہی یہ تعلق بہت گہرا ہوگیا اور سبھاش نے کانگرس سے علیحدہ ہوکر فارورڈ بلاک بنا لیا۔ یہ دوسری عالم گیر جنگ کا زمانہ تھا جو ۳۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی اور جولائی ۱۹۴۵ء تک (چھے سال) جاری رہی۔ سبھاش چندر بوس کو سبھاش بابو بھی کہا جاتا تھا اور نیتا جی بھی۔ یعنی لیڈر اور رہنما۔ وہ ملک سے باہر جانا چاہتے تھے اور ان کا ارادہ جرمنی اور جاپان سے مل کر انگریزی حکومت سے جنگ کرنا تھا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کی جو فوج انگریزی حکومت کے ماتحت اٹلی، جرمنی اور جاپان وغیرہ کی فوجوں سے لڑ رہی ہے، ان میں سے ہندوستانی فوجیوں کی الگ آزاد ہند فوج تیار کی جائے۔ اس کے لیے انھوں نے حکیم صاحب کو اپنا بھیدی بنایا اور صوبہ سرحد سے افغانستان اور افغانستان سے جرمنی پہنچنے کا منصوبہ تیار کیا۔ چناں چہ اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے حکیم صاحب دہلی گئے۔ دہلی ریلوے اسٹیشن پر انھیں ایک شخص ملا۔ اس شخص نے ان سے پوچھا:

آپ حکیم عبدالسلام ہزاروی ہیں؟

انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے ان کا بستر اٹھایا اور ایک تانگے پر سوار کر کے اِدھر اُدھر کے چکر لگاتا ہوا ایک ہوٹل میں لے گیا اور اس کے کمرہ نمبر سات میں بٹھا کر خدا حافظ کہا اور کہیں چلا گیا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ کافی دیر بعد ایک اور شخص آیا۔ اس نے ان کا نام پوچھا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ دونوں مختلف گلیوں میں گھومتے گھماتے ایک بہت بڑی بلڈنگ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اس شخص نے دروازے پر دستک دی تو ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔ وہ سبھاش چندر بوس کی والدہ تھیں اور یہ ان ہی کا مکان تھا۔ وہ خاتون انھیں مکان کی دوسری منزل میں لے گئیں اور بولیں کہ جس طرح سرت اور سبھاش میرے بیٹے ہیں، اسی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو۔ چند منٹ کے بعد چائے آگئی اور سبھاش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چندر بوس کے بڑے بھائی سرت چندر بوس بھی وہاں آ گئے۔ سب نے مل کر چائے پی۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ قریب کی ایک مسجد سے فجر کی اذان کی آواز کانوں میں پڑی۔ حکیم صاحب نے کہا: میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ سبھاش کی والدہ وضو کے لیے پانی لے آئیں اور کمرے میں ایک طرف قبلہ رخ سفید چادر بچھا دی اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ حکیم صاحب کو خیال ہوا کہ معلوم نہیں قبلہ کدھر ہے لیکن نماز پڑھ لی۔ صبح کو پتا چلا کہ چادر قبلہ رخ ہی بچھائی گئی تھی۔ شک رفع کرنے کی غرض سے خود سبھاش کی والدہ نے کہا کہ ڈھاکہ کی رہنے والی ہوں اور ہمارے ہمسائے مسلمان تھے، جن کے گھروں میں ہماری آمد و رفت رہتی تھی۔ نماز، اس کے آداب اور وضو وغیرہ سب باتیں جانتی ہوں۔ ہمارے گھر میں مسلمانوں کا آنا جانا اس وقت بھی رہتا تھا، اب بھی رہتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ قبلہ کدھر ہے۔

صبح کی نماز کے بعد سبھاش بھی آ گئے۔ اب یہ تین آدمی تھے۔ سرت چندر بوس، سبھاش چندر بوس اور حکیم عبدالسلام۔ موضوع گفتگو یہ تھا کہ سبھاش چندر بوس ملک سے باہر جا کر جرمنی اور جاپان وغیرہ کے حکمرانوں سے ملیں گے اور آزادیٔ وطن کے لیے کوشش کریں گے اور حکیم صاحب آزاد قبائل کے راستے سے انھیں ملک سے باہر جانے میں مدد دیں گے۔ لیکن حکیم صاحب کو اس منصوبے سے اختلاف تھا۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ملک میں رہ کر اس کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ ان دونوں بھائیوں کو چوں کہ حکیم صاحب پر اعتماد تھا۔ اس لیے حکیم صاحب ان کے اصرار پر ان کے ہم نوا ہو گئے اور ان کے اعتماد پر پورا اترنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ملک کی آزادی کے لیے اپنے وطن سے باہر جانے اور اس سلسلے میں کسی دوسرے ملک کی امداد حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہونے کی یہ پہلی مثال نہ تھی۔ اس سے قبل ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے زمانے میں مولانا محمد علی قصوری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، راجا مہندر پرتاپ اور بعض دیگر حضرات نے بھی یہ کوشش کی تھی اور اپنے وطن سے باہر ہندوستان کی آزاد حکومت قائم کی تھی۔ اب سبھاش چندر بوس بھی حکیم عبدالسلام ہزاروی کے تعاون سے یہ کوشش کرنے پر مصر تھے۔ معاملہ اعتماد، اخلاص اور ہمت و جرأت کا تھا۔

یہ ۱۹۴۱ء کے جنوری کا مہینا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ بعض ضروری کام نمٹا کر سبھاش چندر بوس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تین مہینے کے بعد اپنے مسکن کلکتے سے باہر نکلیں گے اور حکیم صاحب کے ہاں پہنچیں گے۔ اس اثنا میں حکیم صاحب اپنے قابل اعتماد لوگوں کے ذریعے سے آزاد قبائل اور اس سے آگے کابل تک پہنچنے کے راستوں کے متعلق پوری معلومات حاصل کر لیں گے۔ چناں چہ حکیم صاحب نے دہلی سے واپس آ کر دو مجاہدوں کو اپنے اعتماد میں لیا جو سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی قائم کردہ جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے اور جماعت مجاہدین کے مرکز ''اسمس'' میں قیام پذیر تھے جو کہ آزاد قبائل میں واقع ہے۔ یہ دو مجاہد تھے مولانا محمد زمان ساکن چکیا تحصیل مانسہرہ اور مولانا محمد اسماعیل ساکن مانسہرہ۔ حکیم صاحب کی طرح مسلک اہل حدیث کے حامل۔ ان دونوں نے حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق ہری پور سے کابل تک پیدل چل کر پورے راستے کا سروے کیا۔ راستے میں تھانہ چوکی، پوسٹ چیکنگ، دریا، پہاڑ، ندی، نالہ، پل، ہر چیز کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ کون سا راستہ صاف اور کون سا مخدوش ہے اور اس کے نشیب وفراز وغیرہ کا کیا سلسلہ ہے۔ اس کے متعلق اچھی طرح پتا کیا۔ نیز راستے میں قیام کے لیے مسافر خانوں، بزرگوں کے مزاروں اور مسجدوں کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچائیں۔

ادھر سبھاش چندر بوس نے بعض ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اپنے آپ کو گھر کے ایک کمرے میں بند کر لیا۔ نہ کسی سے میل نہ جول۔ نہ سیاسی سرگرمیاں، نہ سیاست کے متعلق بیانات۔ اس خاموشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بارے میں مختلف باتیں مشہور ہو گئیں۔ کسی نے کہا کہ سخت بیمار ہیں۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ کسی نے کہا ہمالیہ کی طرف نکل گئے ہیں اور سادھوؤں کی سی زندگی بسر کرنا شروع کر دی ہے۔ کسی نے کہا اچانک کہیں غائب ہو گئے ہیں اور حالات سے مایوس ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ اس قسم کی باتوں سے حکومت کی خفیہ پولیس بھی مطمئن ہو گئی اور اس نے سمجھ لیا کہ ان کی سیاسی جدوجہد ختم ہو گئی ہے اور ان کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن سبھاش چندر بوس کا یہ سارا معاملہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا، جس کا حکیم عبدالسلام اور سبھاش کے چند گھر کے افراد کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔

حکیم صاحب سے طے شدہ پروگرام کے مطابق تین مہینے کے بعد سبھاش چندر بوس رات کے آٹھ بجے اپنے مسکن (کلکتہ) سے گاڑی پر گھر سے نکلے۔ اس وقت ان کی داڑھی کی عمر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چالیس روز کی ہو چکی تھی اور وہ ایک مولوی کے بھیس میں روانہ ہوئے تھے۔ تنگ موری کا پاجامہ اور شیروانی زیب تن۔ سر پر ترکی ٹوپی اور خاصی بڑھی ہوئی صاف ستھری داڑھی۔ انھوں نے کلکتہ سے چالیس میل کے فاصلے پر ایک ریلوے اسٹیشن سے پشاور تک کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور ٹرین میں بیٹھ گئے۔ اس رات کا سفر تو خیریت سے گزر گیا۔ دوسرے دن اس ڈبے میں ایک فوجی سکھ آیا۔ اب یہ دو ہی مسافر تھے۔ اس لیے آپس میں بات چیت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

فوجی سکھ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ان کا نام پوچھا اور ان کے سفر کا مقصد معلوم کرنا چاہا۔ انھوں نے کہا میرا نام ضیاء الدین ہے۔ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، ایک بیمہ کمپنی کا آرگنائزر ہوں اور دورے پر راول پنڈی جا رہا ہوں۔ دن کا سفر اس سکھ کے ساتھ گزرا۔ اس لباس اور ہیئت میں اگرچہ انھیں پہنچاننا مشکل تھا اور وہ یوپی کے مولوی معلوم ہوتے تھے تاہم گرفتاری کا خطرہ بہرحال تھا۔ اس لیے جب کوئی بڑا اسٹیشن آتا تو اخبار منھ کے قریب کر کے پڑھنا شروع کر دیتے۔

پروگرام کے مطابق راول پنڈی سے آگے سنگ جانی ریلوے اسٹیشن پر رات کے وقت سبھاش چندر بوس کی ملاقات حکیم صاحب سے ہوئی۔ انھیں ٹرین سے اتارا۔ مختلف تکلیف دہ راستے طے کرتے ہوئے انھیں پندرہ میل دور اپنے گاؤں کے ایک پرانے سے بھورے (کھودی ہوئی غار) میں لے آئے۔ یہ جگہ سبھاش چندر بوس کی معاشرتی ثقافت اور ذاتی حالات سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن حصول آزادیٔ وطن کا جذبہ انھیں اس قسم کی تکلیفیں اٹھانے پر مجبور کر رہا تھا اور وہ ان تکلیفوں کو راحت سمجھتے تھے۔ حکیم صاحب کے پیچھے خفیہ پولیس لگی رہتی تھی اور ہر وقت ان کی نگرانی کی جاتی تھی۔ ان کے مطب کے اوقات کا خفیہ والوں کو علم تھا۔ جب وہ ان اوقات میں مطب سے غیر حاضر ہوتے تو خفیہ والے انھیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اس کے باوجود حکیم صاحب کئی میل کا سفر طے کر کے رات کو سبھاش چندر بوس سے ملاقات کرتے۔ ان کے آدمی صبح کا ناشتہ اور دن رات کا کھانا وہاں پہنچاتے اور انھیں چائے بنا کر دیتے۔ ان کو ہری پور سے آگے لے جانے کی ذمہ داری جن لوگوں کے سپرد کی گئی تھی، انھوں نے راستے کے بعض انتظامات مکمل کر کے تین دن کے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن وہ تین دن میں اپنا کام مکمل نہ کر سکے اور پانچ دن کے بعد آئے۔ جنگ آزادی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معروف رہنما حاجی صاحب ترنگ زئی کا بھی اس مہم میں حصہ تھا جو قبائلی علاقوں تک محدود تھا۔

اب سبھاش چندر بوس کو پٹھانوں کا لباس پہنا کر جن لوگوں کے ساتھ آزاد قبائل میں بھیجا گیا، وہ ''المس'' کی جماعت مجاہدین کے لوگ تھے۔ سبھاش چندر بوس راستے میں کسی سے کوئی بات نہ کرتے تھے۔ اگر ان کے ساتھیوں سے ان کے بارے میں کوئی پوچھتا تو وہ جواب دیتے کہ یہ گونگا ہے اور ہمارا بھائی ہے۔ ہم اس کو علاج کے لیے فلاں حکیم کے پاس لے جارہے ہیں یا جواب دیتے کہ فلاں مزار پر دعا کے لیے جارہے ہیں۔ یہ جواب وہ اس لیے دیتے کہ اس نواح کے لوگ پیروں اور مزاروں کے ماننے والے تھے۔ سبھاش چندر بوس کے خاموش رہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ پشتو بولنے والوں کا علاقہ تھا اور سبھاش پشتو نہیں جانتے تھے۔ اگر وہ اردو میں بات کرتے تو بھید کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس طرح نہایت مشکل کے ساتھ کابل تک کا لمبا سفر طے ہوا۔ کہیں پیدل چلے، کہیں کسی پرانی بس پر سوار ہوئے۔ کچے اور ناہموار پہاڑی راستے۔ کہیں درختوں کے جھنڈ، کہیں پتھروں کے ڈھیر۔ کہیں کسی مسجد میں رات گزاری، کہیں بزرگ کے مزار پر رات بسر ہوئی۔ کہیں کسی جھونپڑی میں کچھ وقت گزارا۔ کبھی کچھ کھانے کو ملا، کبھی نہ ملا۔ حکیم صاحب نے جن لوگوں کی ان کے متعلق جو ڈیوٹی لگائی، انھوں نے اسے نہایت احتیاط اور ذمہ داری سے ادا کیا۔

پھر یہ ہوا کہ وہ ۲۸۔ مارچ ۱۹۴۱ء کو صحیح سلامت برلن (جرمنی) پہنچ گئے۔ اس کا برلن ریڈیو سے اعلان ہوا تو انگریزی حکومت کو نہایت پریشانی ہوئی۔ سبھاش چندر بوس جرمنی سے جاپان گئے۔ وہاں آزاد ہندوستان حکومت قائم کر کے اس کی آزاد ہند فوج ترتیب دی۔

سبھاش چندر بوس کو ملک سے فرار ہونے میں مدد دینے کے جرم میں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے حکیم عبدالسلام کو گرفتار کر لیا۔ اس سے پہلے انھیں چراٹ (پشاور) کے عقوبت خانے میں رکھا گیا اور ہندوستانی سی آئی ڈی کے حکام نے ان کو لالچ، دھمکیوں اور دیگر ہتھکنڈوں سے رام کرنے اور سب کچھ اگل دینے کی ترغیب دی مگر ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ''مجھے کچھ پتا نہیں۔'' اس کے بعد انھیں دیولالی کیمپ (راجپوتانہ) میں قید کر دیا گیا۔ وہ ساڑھے تین سال اس کیمپ میں قید رہے۔ کسی کو کچھ علم نہیں تھا کہ حکیم صاحب کہاں ہیں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کس حال میں ہیں اور کیا وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ گھر والے بھی پریشان اور ان سے ملنے والے بھی پریشان۔ بالآخر ڈیڑھ سال کے بعد دیولالی کیمپ کی معرفت حکیم صاحب کا خط آیا کہ وہ زندہ ہیں اور خیریت سے ہیں۔ قید کے دن پڑھنے لکھنے میں بسر ہو رہے ہیں۔

آخر جنگ کا پانسا پلٹ گیا اور جاپان، جرمنی اور اٹلی کی شکست کے آثار واضح ہو گئے تو حکومت نے حکیم صاحب کو رہا کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں گھر میں نظر بندی کا حکم مل گیا۔ یعنی اب وہ ہری پور میں مسکن پابند تھے۔ تین سال وہ گھر میں نظر بند رہے۔ لیکن انھوں نے اپنے مطب میں باقاعدہ بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ سب سیاسی لوگ مسلمان اور ہندو ان کے پاس آتے اور خوب محفل جمتی۔ حکومت کی خفیہ پولیس کے آدمی بھی ان کے قریب رہتے اور ان کی نگرانی کرتے۔

حکیم عبدالسلام ہزاروی نے ایک عرصے تک مجلس احرار سے بھی وابستگی اختیار کیے رکھی۔ ان کا شمار احرار کے بڑے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ سب سے ملتے اور سب سے تعلقات رکھتے تھے۔ علماے کرام سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے، اطبا کی جماعت میں بھی ان کو احترام کا مقام حاصل تھا، سیاست دانوں میں بھی انھیں تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور عام لوگوں میں بھی ان کو بے حد اکرام کا مستحق گردانا جاتا تھا۔

حکیم عبدالسلام ہزاروی بے شبہ مرد مجاہد تھے۔ برصغیر کی آزادی کے سلسلے میں ان کی مساعی بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ گرفتار بھی ہوئے، قید بھی ہوئے، پولیس نے ان کے گھر کی تلاشی بھی لی اور انھیں گھر میں نظر بند بھی رکھا۔ لیکن اس عالی ہمت نے ہر تکلیف کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ کسی تکلیف سے کبھی نہیں گھبرائے۔ وہ بالالتزام علی الصبح تلاوت قرآن کرتے اور قرآن و حدیث میں منقول وظائف پڑھتے۔ تفسیر و حدیث کی کتابوں کا مطالعہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ سب کے دوست اور سب کے خیر خواہ تھے۔ حلیم الطبع اور شیریں بیان تھے۔ بہت اچھے مقرر اور بہت اچھے خطیب تھے۔ حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کر لیا تھا۔

حکیم صاحب کی سیاسی تگ و دو اور بعض دیگر سرگرمیوں کے بارے میں چند مزید واقعات ملاحظہ ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ حکیم صاحب سیاست میں بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور یہ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ علم اور دین داری کے لحاظ سے بلند تر مگر اقتصادی طور پر متوسط سے بھی کم تر کاشت کار گھرانے کا نوعمر جو سماجی اور معاشی حالات کا شکار تھا، جذبہ آزادی سے اس درجہ سرشار تھا کہ جلسوں اور جیلوں میں جانا اس کا معمول ہوگیا تھا۔ گھر کی یہ حالت، اور وہ خود آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر اور اس کے فرائض کی ادائیگی میں سرگرم۔ اپنی غربت کو انھوں نے اپنے عظیم مقاصد کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔

☆ خان بہادروں، سروں، نوابوں، خانوں اور جاگیرداروں کے اس دور میں جنگ آزادی کا طبل دیوانے کا خواب لگتا تھا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ انھوں نے اپنے جگری دوست خان مہدی زمان خان نائب صدر جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے تعزیت نامے میں تحریر کیا ہے کہ جب وہ ۱۹۳۱ء میں ملک امیر اعوان ایڈیٹر ''ترجمان سرحد'' مولانا غلام ربانی لودھی اور بعض دیگر دوستوں کے ہمراہ موجودہ تربیلا ڈیم سے پار کے علاقے سے پیدل واپس آرہے تھے تو ان کی ملاقات مہدی زمان خان کے چچازاد بھائی اور ہزارہ کے معروف خان بہادر محمد زمان خان سے ہوئی۔ خان بہادر صاحب نے اصرار کر کے ان لوگوں کو کھانے کے لیے روک لیا۔ کھانے کے دوران باتیں کرتے ہوئے کہا: ''آپ لوگ احمقوں کی جنت میں بس رہے ہیں۔ اس ملک سے کوئی طاقت انگریز کو نہیں نکال سکتی۔ آپ لوگ چٹانوں پر سر پھوڑ رہے ہیں۔ انگریزی حکومت سے آزادی کی کوشش دیوانے کا خواب ہے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں آزادئ وطن کے لیے جدوجہد کی جارہی تھی۔

☆ حکیم صاحب کی شخصیت محبت رسول ﷺ اور حریت فکر سے عبارت تھی۔ سامراج اور استعمار سے نفرت گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ انگریز اور انگریزیت سے انھیں بیر تھا۔ امپیریلزم اور نوآبادیاتی نظام کو وہ بجا طور پر خرابی اور بگاڑ کا منبع سمجھتے تھے۔ اس سے نفرت کا یہ حال کہ کتے کو خان بہادر کہہ کر دھتکارتے تھے۔ محبت رسول ﷺ کے معاملے میں بھی وہ اتنے ہی متشدد تھے۔ سنت نبوی کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ سخت قسم کے موحد تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ وسیع المشرب تھے اور حسب حیثیت دسترخوان کی فیاضی میں مشہور تھے۔ خوش لباس اور خوش خوراک، دودھ، دہی، لسی کے شائق۔ عمر بھر شہر اور گاؤں میں اس کا اہتمام کیے رکھا۔ اکیلے کھانا ان کے لیے عار تھی۔ باجماعت کھانا ان کا انتہائی پسندیدہ طریق تھا۔ علما، فقرا اور طلبا کی اپنی حیثیت کے مطابق دامے، درمے، سخنے، قدمے امداد اور حوصلہ افزائی کرتے۔ دیہات کے کتنے ہی نادار طلبا کو اپنے ہاں رکھ کر ان کی تعلیمی سلسلے میں مدد کی۔ مالی حالت کچھ سنبھلی تو دواؤں کے ساتھ مستحق لوگوں کو خاموشی سے زکوٰۃ کی رقم سے بھی حصہ دیتے۔ فطری حس مزاح سے معمور اور دل کے غنی۔ چائے بہ اصرار پلاتے اور جب مہمان معذرت کرتا تو بضد ہو کر کہتے ''ضرور پئیں۔ اگر آپ چائے نہیں پئیں گے تو بیمار کیسے ہوں گے اور اگر بیمار نہیں ہوں گے تو میرا کام کیسے چلے گا؟'' تواضع کے دوسرے لوازم لسی، خمیرہ گاؤزبان اور جوارش جالینوس تھے۔

☆ اپنی حدود میں رہ کر اپنے وسائل میں زندگی بسر کرنے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ پر پورا اعتماد تھا۔ مرعوب ہونا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ کسی کی دولت، عہدے، وجاہت، نخوت اور امارت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ مجلسی معاملات کے بارے میں جمہوری طور طریقے کے پابند تھے۔

☆ سرحد کے خان برادران (یعنی خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر عبدالجبار معروف بہ ڈاکٹر خاں) سے ذہنی اور سیاسی ہم آہنگی تھی۔ باچا خاں نے اپنی کتاب ''میری زندگی اور جدوجہد'' میں حکیم صاحب کی سیاسی رفاقت، استقامت اور خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یہ سیاسی رفاقت کانگرس کی اندرونی چپقلش یعنی گاندھی بوس تنازعہ اور بعض سیاسی اختلافات کی نذر ہوگئی۔ مگر باہمی اعتماد، تعلق اور احترام کا رشتہ عمر بھر قائم رہا اور فریقین نے بخوبی اور احسن طریقے سے اس کو نباہا۔ خان عبدالولی خاں نے بھی اس رشتے کو روایتی خوبی سے قائم رکھا اور ان کے جانشین اسفندیار ولی خاں بھی خانوادہ حکیم عبدالسلام سے اسی روش پر عامل ہیں۔

☆ سبھاش چندر بوس حد درجہ متحرک اور عظیم انقلابی شخصیت تھے۔ وہ گاندھی جی کی مخالفت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے باوصف دو مرتبہ آل انڈیا کانگرس کے صدر چنے گئے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ حالات کے جبر نے انگریزی استعمار سے نجات کو تو یقینی بنا دیا ہے مگر حقیقی آزادی خواب ہی رہے گی۔ کیوں کہ جمود کی قوتیں انگریز کے بعد اقتدار میں آجائیں گی بلکہ انگریز ان ہی کو اقتدار منتقل کرے گا اور یوں حقیقی انقلاب بے معنی اور بانجھ ہو کر رہ جائے گا۔ وہ دورس اور بامعنی انقلاب کے داعی تھے۔ نقطہ نظر کے اسی تفاوت کی وجہ سے یہ کہہ کر کہ

''میری بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی میری راہ میں رکاوٹ ہے''

کانگرس کی صدارت سے استعفا دے دیا اور اپنے ہم خیال لوگوں کی رفاقت میں جن میں حکیم عبدالسلام کا ایک اہم مقام تھا، ایک انقلابی اور نظریاتی راہ اپنائی۔

☆ انگریز جنگ میں بُری طرح پھنس چکا تھا۔ بین الاقوامی استعمار اپنے منطقی انجام کے قریب تھا۔ اس لیے سبھاش چندر بوس کے نقطہ نظر کی رو سے گاندھی جی کا عدم تشدد بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق معروضی حالات کا تقاضا تھا کہ سامراج پر کاری ضرب لگائی جائے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے تاکہ انگریز سے گلوخلاصی ہو۔ اگرچہ سبھاش چندر بوس کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کی گنجائش تھی مگر ان کے اخلاص سے اختلاف کرنا مشکل تھا۔

☆ حکیم صاحب مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، نواب زادہ نصراللہ خان، شیخ حسام الدین، مولانا غلام غوث ہزاروی، شورش کاشمیری اور دیگر احرار عمائد وزعما سے ان کی ذہنی اور فکری وابستگی تھی۔

☆ حکیم صاحب کے سب سے بڑے بیٹے میجر (ریٹائرڈ) پروفیسر محمد طارق ہیں جو تاریخ وسیاست سے دلچسپی رکھتے اور نامور ماہر تعلیم ہیں۔ وہ انگریزی میں تاریخ وسیاسیات پر متعدد معیاری کتب کے مصنف، پاکستان آرمی جرنل کے سابق ایڈیٹر، متعدد رسائل و جرائد کے مضمون نگار، علمی وادبی تحریکوں کے روح رواں ہیں۔ وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی، پاکستان میرین اکاڈیمی، کئی کیڈٹ کالجوں کے پرنسپل اور ایچی سن کالج لاہور میں ایک عرصے تک صدر شعبہ رہ چکے ہیں۔ انھوں نے افواج، سول حکومت اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وزارت خارجہ وغیرہ اداروں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اپنے والد گرامی حکیم عبدالسلام کے خیالات کو خوب سمجھتے۔ ان کا شمار میرے مخلص دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ لاہور تشریف لائیں تو مجھے ضرور یاد فرماتے ہیں اور غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں۔ علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے متعلق بعض معاملات میں بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب کی زندگی اور ان کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے متعلق میں نے بعض معلومات ان سے حاصل کی ہیں۔

☆ حکیم صاحب اطبا کی سیاست اور پیشہ ورانہ دلچسپیوں میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ وہ دو دفعہ پاکستان طبی بورڈ کے ممبر اور اطبا رجسٹریشن بورڈ کے صدر رہے۔ انھیں حکیم محمد سعید، شفاء الملک، حکیم محمد حسن قرشی، حکیم نیر واسطی اور دیگر مشہور اطبا اور نامور ہومیو حضرات کی رفاقت حاصل رہی۔

☆ اتنی مصروفیات کے باوجود حکیم صاحب کو پڑھنے لکھنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ اخبارات کا مطالعہ عشا کی نماز کے بعد کرتے اور اداریوں پر خاص توجہ دیتے۔ دن بھر ہر نوع کی مصروفیات کے باوجود دوستوں سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا۔ بی بی سی کے تبصروں اور خبروں کو خاص اہمیت دیتے اور دوستوں کے تبصروں کو انہماک اور توجہ سے سنتے۔ ہر قسم کے سیاسی کارکنوں کا ان کے مطب پر جمگھٹا رہتا۔ ان کا گھر حکومت کے معتوب اپوزیشن کارکنوں کا بالخصوص مہمان خانہ ہوتا۔ کوئی ایسا اپوزیشن رہنما شاذ ہی ہوتا جو ہزارہ کے دورے پر آیا ہو اور ہری پور میں حکیم صاحب کا مہمان نہ ہوا ہو۔ اگر مہمانوں کی کثرت کے بارے میں شکایت ہوتی تو فرماتے ''اصل بات یہ ہے کہ خدا ان کی وجہ سے ہی ہمیں روزی دے رہا ہے۔'' ہری پور جیل میں آنے والے زعما ان کی میزبانی سے ضرور مستفید ہوتے۔ راولپنڈی سازش کیس کے معروف نامزد ملزم محمد حسین عطا کئی مہینے حکیم صاحب کے یہاں روپوش رہے۔ بعد میں گرفتار ہو کر سزا یاب ہوئے۔ حکیم صاحب کو مولانا آزاد سے بے حد عقیدت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ نوجوانی میں اگر میرے پاس دس روپے ہوتے تو میں مولانا آزاد کی تقریر سننے کے لیے بمبئی کو روانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں پشاور سے بمبئی کا کرایہ دس بارہ روپے کے لگ بھگ ہوگا۔

قیام پاکستان کے بعد بھی حکیم صاحب سیاسی، علمی اور سماجی طور پر متحرک رہے۔ بالخصوص صوبہ سرحد کی سیاست میں ان کی تگ وتاز کا سلسلہ جاری رہا۔ صوبہ سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خاں کے خلاف انھوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کے صوبہ سرحد کے رفقا میں مولانا عبدالقیوم پوپلزئی، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبدالحق حقانی، خاں عبدالولی خاں، محمد اجمل خٹک، محمد علی خاں ہوتی، ارباب سکندر خاں خلیل، میاں جعفر شاہ اور محمد ابراہیم خان جھگڑا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس عظیم مجاہد آزادی نے ۷۱ برس کی عمر پا کر ۲۳۔ جنوری ۱۹۷۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اپنے آبائی گاؤں میرپور میں حسب وصیت اپنے مرحوم والد کی پائنتی کی طرف محو استراحت ہیں۔ اللہ جنت نصیب فرمائے۔

گزشتہ سطور میں بعض مقامات پر آزاد ہند فوج کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے متعلق میں ضروری تفصیلات اپنی کتاب ''تذکرہ میاں عبدالعزیز مالواڈہ بار ایٹ لا'' میں بیان کر چکا ہوں، جو کتاب سرائے اردو بازار، لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

یہاں یہ عرض کر دیں کہ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان نے اپنی شکست کا اعلان کیا اور اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ اعلان شکست سے تین دن بعد ۱۸۔ اگست کو سبھاش چندر بوس بذریعہ ہوائی جہاز ٹوکیو سے نکلے۔ بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن ان کے ساتھ تھے۔ انڈو چائنا کے علاقے تائی وان کے ہوائی اڈے پر جہاز کو آگ لگ گئی اور سبھاش چندر بوس جل کر مر گئے۔ حبیب الرحمٰن سخت زخمی ہوئے۔ لیکن جان سے بچ گئے۔ ان ہی نے برصغیر کے لوگوں کو سبھاش چندر بوس کی موت کی اطلاع دی اور آنکھوں دیکھا حال بیان کیا۔ بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن ایک عرصے تک شمالی علاقہ جات کے چیف ایڈمنسٹریٹر رہے۔ حکیم صاحب کے ساتھ ان کے نیاز مندانہ تعلقات تھے۔ وہ ۱۹۷۸ء میں آزاد کشمیر کے ضلع میرپور کے ایک گاؤں میں راہی ملک بقا ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ حکیم صاحب کے فرزند میجر طارق نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بشیر احمد ڈار

(وفات ۲۹۔ مارچ ۱۹۷۹ء)

۱۹۵۵ء کے آغاز کی بات ہے کہ ایک دن میں مولانا محمد حنیف ندوی سے ایک مضمون لینے کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر گیا۔ مولانا ایک صاحب سے کسی فلسفیانہ موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ صاحب بڑی نرمی اور ملائمت سے بات کرتے اور نہایت احترام کے ساتھ مولانا سے مخاطب ہوتے تھے۔

مولانا کے تعارف کرانے سے معلوم ہوا کہ ان کا نام بشیر احمد ڈار ہے، جنھیں عام طور پر بی۔اے ڈار کہا جاتا تھا۔ گداز جسم، بھرا ہوا چہرہ، کشادہ پیشانی، موٹی موٹی آنکھیں، ابھری ہوئی ناک، نکھرا ہوا رنگ، داڑھی مونچھ صاف اور سر پر قراقلی ٹوپی۔ دیکھنے میں خوش مزاج اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہوئی۔ کھلے پائنچ کا لٹھے کا پاجامہ اور شیروانی زیب تن۔ مولانا سے اجازت لے کر اٹھنے لگے تو پاس پڑی ہوئی بیساکھی اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ ایک ٹانگ سے معذور تھے اور بیساکھی کے سہارے چلتے تھے۔ عام جسمانی صحت بہت اچھی اور قد میانہ۔ آہستہ خرام بھی تھے آہستہ کلام بھی۔ آہستہ خرام اس لیے کہ ٹانگ سے معذور تھے اور آہستہ کلام اس لیے کہ طبعی متانت اور فطری شرافت سے معمور تھے۔

یہ پہلا تعارف تھا جو بشیر احمد ڈار سے ہوا، اور یہ تعارف کچھ ایسی ساعت سعید میں ہوا تھا کہ بعد کو آنے والے وقت میں پُرخلوص تعلق کے سانچے میں ڈھل گیا۔ ان کی میٹھی میٹھی باتوں نے ان چند لمحی ملاقات میں جو خوش گوار اثر ذہن پر ڈالا تھا، وہ آج تک لوح قلب پر مرتسم ہے۔

بشیر احمد ڈار لاہور کے ایک نیک اور مذہبی خاندان کے فرد تھے۔ شریف النفس، دینی اقدار سے آشنا اور ان پر عامل۔ موچی دروازے کے اندر محلّہ پیر گیلانیاں میں ان کا مکان تھا۔ بعض دواؤں کا ایک مشہور اشتہار عرصہ دراز تک اخبار ''زمیندار'' میں چھپتا رہا ہے، جس کا عنوان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"۔ اس اشتہار کے نیچے اسی محلے کا پتا درج تھا اور اس کالکڑی کا بڑا سا بورڈ بشیر احمد ڈار کے سامنے والے مکان کے دروازے پر نصب تھا۔

بشیر احمد ڈار یکم اپریل ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے کہ پتنگ اڑاتے ہوئے اپنے مکان کی چھت سے گرے اور بری طرح زخمی ہوئے۔ ایک پاؤں کا زخم بہت زیادہ تھا۔ مرہم پٹی کرائی گئی مگر انھوں نے جراح کی ہدایت پر عمل نہیں کیا اور چار پائی پر نہیں لیٹے، تکلیف کے باوجود پتنگ بازی کا کھیل جاری رکھا۔ آخر زخم خراب ہوگیا اور پانی چلا جانے سے ماس گلنے لگا۔ پہلے اس کا اثر ٹخنے تک تھا، پھر گھٹنے تک جا پہنچا۔ ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے کہا: زہر پھیل رہا ہے، اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ گھٹنے تک ٹانگ کاٹ دی جائے۔ چناں چہ ٹانگ کاٹ دی گئی اور وہ چھوٹی عمر میں بہ ظاہر اپاہج اور ناکارہ ہوکر رہ گئے۔

کئی مہینے چار پائی پر لیٹے رہے۔ جب لکڑی کے سہارے چلنے پھرنے لگے تو باپ نے خیال کیا کہ ایک ٹانگ ضائع ہوجانے کی وجہ سے بچہ اب پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں رہا، اسے کوئی ایسا کام سکھانا چاہیے جو یہ بیٹھے بیٹھے کرتا رہے اور جس سے اتنی آمدنی ہوجائے کہ اس کی گزر اوقات ہوسکے۔ چناں چہ انھیں سنار کی دکان پر بٹھا دیا گیا اور وہ سنار کا کام سیکھنے لگے۔

چند روز سنار کے پاس گئے، صبح سے شام تک دکان پر بیٹھے اور استاد کی کڑوی کسیلی باتیں سنیں تو باپ کی منت سماجت کر کے اس کام سے چھٹکارا حاصل کیا اور سکول میں داخل ہوگئے۔ انتہائی شوق اور لگن سے پڑھنا شروع کیا۔ مڈل کے امتحان میں اس شان سے کامیاب ہوئے کہ وظیفے کے حق دار قرار پائے۔ میٹرک میں بھی وظیفہ لیا۔ غریب گھر میں پیدا ہوئے تھے، باپ کا خیال تھا کہ دس جماعتیں پاس کرنے کے بعد تعلیم چھوڑ دی جائے، اس لیے کہ وہ کالج کے اخراجات برداشت نہیں کرسکیں گے۔ مگر ہونہار اور ذہین بچہ اس میدان میں آگے بڑھنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ وہ بغیر کسی سفارش سے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوگئے۔ یہاں بھی وظیفہ ملنے لگا۔ حصولِ علم کے کسی مرحلے میں باپ پر بوجھ نہیں بنے۔ کالج میں ان کا مضمون فلسفہ تھا۔ اسی کالج سے فلسفے میں ایم۔اے پاس کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب انھوں نے علی گڑھ کا عزم کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں بی۔ٹی میں کامیابی کی سند حاصل کی، جسے اب بی۔ایڈ کہا جاتا ہے۔

لاہور واپس آئے تو انجمن حمایت اسلام کے قائم کردہ اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں مدرس ہو گئے۔ کئی سال اس سکول میں خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے۔ یوں تو وہ اردو اور انگریزی تمام مضامین بہت اچھی طرح پڑھاتے تھے، لیکن ریاضی میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے اور نہایت عمدہ طریقے سے اس کی تعلیم دیتے تھے۔ پاکستان کے معروف اہل علم، ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا کہ کسی زمانے میں بشیر احمد ڈار سے اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتے رہے ہیں۔ وہ ریاضی کے ماہر استاد تھے اور اس انداز میں پڑھاتے تھے کہ ہر بات آسانی سے فہم کی گرفت میں آتی اور ذہن میں پیوست ہوتی جاتی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول ڈاکٹر صاحب کے اس دور کے شاگردوں میں ان کے سمیت (فرزند اقبال ریٹائرڈ) جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، مشہور کرکٹر عبدالحفیظ کاردار، پروفیسر علم الدین سالک مرحوم کے صاحب زادے محمد ایرج اور بہت سے طلبا شامل تھے۔ یہ وہ حضرات تھے جنھوں نے بعد کو زندگی کے مختلف میدانوں میں بڑی شہرت پائی اور بعض اونچے مناصب پر فائز ہوئے۔ بشیر احمد ڈار کے شاگرد بڑے احترام سے ان کا نام لیتے اور ان کی شاگردی پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر وحید قریشی کی باتوں سے ہوا۔ جس لہجے میں انھوں نے استاد کا ذکر کیا اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ بہت لائق، محنتی اور شفیق استاد تھے اور شاگردان کے طریق تعلیم سے انتہائی متاثر اور مطمئن تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بتایا کہ وہ ڈار صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اس وقت وہ ستائیس اٹھائیس برس کے ہوں گے۔ ایک ٹانگ سے معذور ہونے کی وجہ سے بیساکھی کے سہارے چلتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام بھاٹی گیٹ کا یہ سکول جس میں بڑے بڑے اہل علم نے پڑھایا اور پڑھا، ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا اور بہت بڑی گراؤنڈ اور عمارت پر مشتمل تھا۔ ضیاء الحق کے حکم سے اسے مسمار کر دیا گیا اور یہاں حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کے دفاتر اور محکمہ اوقاف کے بعض شعبے قائم کر دیے گئے۔ باقی جگہ بعض دیگر مصارف میں لائی گئی۔ تعلیم کو نقصان پہنچانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا، جس پر عمل کیا گیا، اور یہ عمل کامیاب رہا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس زمانے میں انجمن حمایت اسلام کا ایک سکول ''وطن مڈل سکول'' کے نام سے موسوم تھا۔ انجمن نے اسے مڈل سے ہائی سکول بنایا تو بشیر احمد ڈار کو اس سکول میں بھیج دیا گیا۔ ان کا شمار ان دونوں سکولوں کے لائق اور شفیق اساتذہ میں ہوتا تھا۔

وطن ہائی سکول کا نام آیا ہے تو یہ بھی سنتے جایئے کہ اسے وطن ہائی سکول کیوں کہا جاتا ہے؟ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں لاہور کی ایک بڑی اور مشہور علمی شخصیت مولوی انشاء اللہ خاں کی تھی جو سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے سامنے ایک وسیع بلڈنگ میں رہتے تھے۔ وہ اپنے دور کے ممتاز ادیب، معروف صحافی اور مانے ہوئے انشا پرداز تھے۔ کئی سال امرتسر کے اخبار ''وکیل'' کے ایڈیٹر رہے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ اس دور کے اخباروں میں مختلف موضوعات پر ان کے مضامین چھپتے رہے۔

مولوی انشاء اللہ خاں نے ۱۹۰۲ء میں لاہور سے ہفت روزہ اخبار ''وطن'' جاری کیا تھا۔ یہ اخبار ۱۹۳۵ء تک تینتیس سال جاری رہا۔ کسی زمانے میں اس کی اشاعت چار ہزار تک پہنچ گئی تھی جو اس عہد میں بہت بڑی اشاعت سمجھی جاتی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں یہ اخبار روزنامہ کر دیا گیا تھا، لیکن ہم عصر روزانہ اخباروں کا مقابلہ نہ کر سکا، اس لیے تھوڑے عرصے بعد پھر ہفت روزہ کر دیا گیا۔ یہ اخبار وطن بلڈنگ سے جاری ہوا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب یہ بند ہوا تو اس کی اشاعت صرف چھ سو تھی۔

اسی وطن بلڈنگ میں انجمن حمایت اسلام نے اپنا مڈل سکول قائم کیا تھا، جس نے بلڈنگ کے نام کی وجہ سے وطن مڈل سکول کے نام سے شہرت پائی۔ بعد میں اس سکول کو ترقی دے کر ہائی کے درجے تک پہنچا دیا گیا تھا اور یہ وطن بلڈنگ سے منتقل ہو کر انجمن حمایت اسلام کی اپنی بلڈنگ واقع برانڈرتھ روڈ میں چلا گیا تھا، لیکن لوگوں میں یہ اپنے پرانے نام وطن ہائی سکول ہی سے مشہور رہا۔ اب بھی اس کو یہی نام دیا جاتا ہے۔ بشیر احمد ڈار جب وطن ہائی سکول میں مدرس کی حیثیت سے گئے، اس وقت یہ سکول برانڈرتھ روڈ پر تھا۔

بشیر احمد ڈار نے وطن ہائی سکول کی ملازمت کے دوران ہی میں اقبال کے فلسفہ اجتماع پر انگریزی زبان میں کتاب لکھی، جس کا نام تھا ''اقبالز فلاسفی آف سوسائٹی'' یہ پہلی تصنیف تھی جو علامہ اقبال کی وفات سے تھوڑا عرصہ بعد ''مثنوی رموز بے خودی'' کے مطالب کی روشنی میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقبال کے عمرانی فلسفے پر پڑھے لکھے لوگوں کے مطالعے میں آئی۔ اسی کتاب کی بنا پر بشیر احمد ڈار علمی حلقوں میں افکار اقبال سے متعلق ایک محقق کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔

اقبال کی فلاسفی کے موضوع پر ۱۹۴۴ء میں بشیر احمد ڈار کی ایک اور انگریزی کتاب شائع ہوئی، وہ تھی ''اے سٹڈی ان اقبالز فلاسفی'' یعنی فلسفہ اقبال کا ایک مطالعہ۔

بشیر احمد ڈار نومبر ۱۹۵۴ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوئے، اس وقت ان کی عمر چھیالیس سال کی تھی۔ اس دور میں ادارے کے اکیڈمک ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے جو اصحاب علم کے بے حد قدردان تھے۔ خلیفہ صاحب کا اصل موضوع فلسفہ تھا، ڈار صاحب کی دلچسپیوں کا محور بھی یہ ہی موضوع تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی بھی جو ۱۵۔مئی ۱۹۵۱ء سے ادارے سے وابستہ تھے، فلسفے کے دلدادہ تھے۔ ادارے میں آنے کے بعد ڈار صاحب کی تصنیفی قابلیت کے اصل جوہر کھلے۔ وہ خوب چمکے اور خوب نکھرے اور انھوں نے بڑی محنت و کاوش سے اپنے موضوع سے متعلق کام کو آگے بڑھایا۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ان کی ماہانہ تنخواہ تین سو روپے مقرر ہوئی تھی اور سب رفقا کو اس زمانے میں یہ ہی تنخواہ ملتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں یہ نہایت معقول اور بہت مناسب تنخواہ تھی۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستگی کے بعد بھی کچھ عرصے تک بشیر احمد ڈار نے معلّمی سے تعلق رکھا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ پہلے باقاعدہ سکول جا کر پڑھاتے تھے، اب دفتر سے آنے کے بعد سکول کے طالب علموں کو ٹیوشن پڑھانے لگے تھے اور طلبا ان کے طریق تدریس سے بہت متاثر تھے۔ ان کی شفقت کا بھی ان پر بڑا اثر تھا۔

محلّہ پیر گیلانیاں میں ڈار صاحب کا مختصر سا مکان تھا۔ چھوٹی سی صاف ستھری بیٹھک تھی۔ اس میں کتابیں سلیقے اور قرینے سے رکھی گئی تھیں۔ انگریزی، اردو اور فارسی کی بڑی بڑی ڈکشنریاں ان کے پاس تھیں، تمام انسائیکلو پیڈیا موجود تھے اور کتب حوالہ سے الماریاں بھری ہوئی تھیں، بہت سی کتابیں میز پر اوپر نیچے رکھی گئی تھیں اور وہ ان ضخیم اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے۔

ٹیوشن پڑھنے والے لڑکوں میں سے وہ کسی کو اپنے ذاتی کام کے لیے کہیں نہیں بھیجتے تھے اور نہ بازار سے کوئی چیز ان سے منگواتے تھے۔ ان کو پڑھنے لکھنے میں مشغول رکھتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوران کے ساتھ شفقت اور پیار کا برتاؤ کرتے۔ بازار یا دکان سے کوئی چیز منگوانا ہوتی تو اپنے بچوں میں سے کسی کو بھیجتے۔

وہ نومبر ۱۹۵۴ء سے مارچ ۱۹۶۵ء تک تقریباً ساڑھے دس سال ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تصنیفی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کراچی چلے گئے تھے۔ ابتدا میں اقبال اکیڈمی کا دفتر کراچی میں تھا اوراس کے پہلے ڈائریکٹر ڈاکٹر رفیع الدین تھے، وہ بھی اس سے قبل ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ رہے تھے۔ کراچی میں وہ ایک حادثے کا شکار ہوگئے تھے۔ ان کے بعد ۱۱۔ اپریل ۱۹۶۵ء کو بشیر احمد ڈار کو ڈائریکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ ڈار صاحب ۴۔ جولائی ۱۹۷۰ء تک پانچ سال تین مہینے اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر رہے۔

قیام کراچی کے زمانے میں وہ جب لاہور تشریف لاتے تو ادارہ ثقافت اسلامیہ ضرور آتے۔ یہاں پرانے دوستوں سے ملتے اور مختلف موضوعات پر ان سے باتیں کرتے۔ ان کا موضوع فلسفہ تھا اور فلسفے سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی البتہ کوئی اور موضوع زیر بحث آجاتا تو اس میں تھوڑا بہت ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔ فلسفے پر مولانا محمد حنیف ندوی سے ان کی گھنٹوں گفتگو رہتی۔ وہ مولانا کے بہت مداح تھے، مولانا بھی ان کی قدر کرتے تھے۔

کراچی جا کر انھوں نے مصنوعی ٹانگ بنوالی تھی اور انگریزی سوٹ پہننے لگے تھے۔ جب بیساکھی کے سہارے چلتے تھے تو جو پاؤں صحیح تھا، اس میں جوتا پہنتے تھے۔ مصنوعی ٹانگ لگانے کے بعد دونوں پاؤں میں بوٹ پہننا شروع کردیے تھے اور ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔ لاہور میں سگریٹ پیتے تھے، لیکن کراچی میں صحت کچھ خراب ہوگئی تھی اور ڈاکٹروں کے کہنے سے سگریٹ نوشی ترک کردی تھی۔

اقبال اکیڈمی کی ڈائریکٹرشپ سے علیحدگی کے بعد وہ لاہور واپس آگئے تھے، اس سے کچھ عرصہ پہلے یا بعد محلّہ پیر گیلانیاں سے لاہور کی آبادی شاد باغ میں منتقل ہوگئے تھے اور وہاں مکان بنا لیا تھا۔ شاد باغ سے وہ دس بارہ دن کے بعد ادارے آتے اور سب سے ملتے۔ چپراسیوں اور مالیوں کو بھی یاد کرتے اوران سے خیروعافیت پوچھتے۔ اس اعتبار سے وہ اسلامی ثقافت کے صحیح نمائندے تھے۔

وہ پاکستان فلاسفیکل کانگرس کے سرگرم رکن تھے۔ مختلف اوقات میں اس کے مختلف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

عہدوں پر فائز ہوئے۔ کئی سال فلاسفیکل کانگرس کی تصانیف اور اس کی سالانہ رودادوں کی ترتیب کی ذمے داری ان کے سپرد رہی۔ اس کا سہ ماہی جرنل بھی ایک عرصے تک لگن اور محنت سے مرتب کرتے رہے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۵ء تک بزم اقبال کے مجلّے ''اقبال'' (لاہور) کے مدیر معاون کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔

وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ جس علمی اور تصنیفی ادارے میں انھوں نے کام کیا، اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ ایک صاحب تحقیق فلسفی مصنف کی حیثیت سے انھوں نے شہرت پائی اور اصحاب علم نے ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

بشیر احمد ڈار ہر وقت خنداں وفرحاں رہتے تھے۔ خوش مزاجی اور زندہ دلی ان کی زندگی کے لازمی اجزا تھے۔ دوسروں کی علمی مساعی پر مسرت کا اظہار کرتے اور اسے داد دیتے۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں میں جو خشکی اور یبوست پائی جاتی ہے، وہ ان میں قطعاً نہ تھی۔ وہ سراپا خلوص تھے کسی کو خواہ مخواہ ہدفِ تنقید ٹھہرانا اور اپنے کام کو اس کے مقابلے میں بڑا ثابت کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ اعتدال وتوازن کا صحیح نمونہ تھے۔

وہ ماسٹر بشیر احمد ڈار کی حیثیت سے عملی زندگی میں داخل ہوئے تھے، لیکن پاکستان کے بہت بڑے مصنف، مترجم اور مقالہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کے قلم نے خوب جولانیاں دکھائیں۔ ان کی زندگی میں وہ ہمیشہ صفحاتِ قرطاس پر دوڑتا رہا۔

انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ تاریخ تصوف (قبل اسلام۔): ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۲۔ حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق: ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۳۔ Religious Thought of Sir Syed Ahmad Khan

ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۴۔ Quranic Ethics ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۵۔ گلشن راز جدید: ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۶۔ انوار اقبال: ناشر اقبال اکیڈیمی پاکستان، لاہور۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۔ Iqbal, and post Kantain Voluntarism ناشر بزم اقبال، لاہور۔

۸۔ فلسفہ مذہب: از ایڈون اے برٹ ترجمہ بشیر احمد ڈار، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور۔

ان کتابوں کے علاوہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ماہانہ رسالے ''ثقافت'' میں (جو جنوری ۱۹۵۵ء کو جاری ہوا تھا اور دسمبر ۱۹۶۷ء تک جاری رہا) بہت سے مضامین لکھے۔ فنون، اقبال، المعارف اور دیگر رسائل ومجلات میں ان کے رشحات قلم کی اشاعت ہوئی۔

وہ کسی اہل علم کی تحقیقی کاوشوں پر اس انداز سے تنقید کرنے کے عادی نہ تھے، جس سے اس کو ذہنی اذیت پہنچتی ہو یا جس سے اس کی تحقیر اور استہزا کا پہلو نکلتا ہو۔ اس کے برعکس وہ اصحاب تحقیق کے کام کی تحسین کرتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

اگر وہ کسی مسئلے کو ہدف تنقید ٹھہراتے تو یہ انداز اختیار کرتے کہ اس میں مزید وضاحت کی گنجائش تھی یا اسے اس طرح بیان کیا جاتا تو میرے خیال میں اس میں زیادہ نکھار پیدا ہوسکتا تھا۔ ہر شخص کی بھلائی اور ہر شخص کی خیر خواہی ان کے پیش نظر رہتی تھی۔

لاہور کی چینی والی مسجد جماعت اہل حدیث کی بہت پرانی مسجد ہے، ڈار صاحب کا آبائی مکان اس مسجد کے قریب تھا اور وہ خود اور ان کے والد مرحوم اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ اس موضوع پر کبھی گفتگو شروع ہوجاتی تو فقہی مسائل میں وہ اسی مسجد کے پرانے خطیبوں اور اماموں کے حوالے دیتے تھے۔ کبھی حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم سے سنی ہوئی کوئی بات بیان کرتے اور کبھی کہتے کہ مولانا داؤد غزنوی نے ایک درس قرآن یا خطبہ جمعہ میں فلاں مسئلہ اس طرح بیان فرمایا تھا۔ بنیادی طور پر وہ مذہبی آدمی تھے اور اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔

عمر کے آخری دور میں انھیں کینسر ہوگیا تھا۔ کئی مہینے اس اذیت ناک مرض میں مبتلا رہنے کے بعد ۲۹۔ مارچ ۱۹۷۹ء کو فوت ہوئے۔ ہم گنہگاروں کو بارگاہ خداوندی سے امید رکھنی چاہیے کہ مرض کی تکلیف دہ طوالت کے باعث ان کی چھوٹی بڑی لغزشیں معاف کردی گئی ہوں گی اور اس مخلص بندے کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے گئے ہوں گے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا۔ بے شک اللہ تعالیٰ انسان کے تمام گناہ بخش دے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا محمد ابراہیم ڈنڈا

(وفات ۱۹۸۲ء)

۱۹۴۸ء کے آخر کی بات ہے۔ ایک دن میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ کھنکتی ہوئی مگر نہایت مؤدبانہ آواز میں انھوں نے ''حضرت السلام علیکم'' کے الفاظ زبان سے ادا کیے اور قدرے جھک کر دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے مولانا کی طرف بڑھائے۔ مولانا نے کھڑے ہو کر ان کے سلام کا جواب دیا اور خیر خیریت پوچھی......! پورا قد، گداز جسم، چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، سرخی مائل رنگ، تیکھے نقوش، سر پر قراقلی ٹوپی، شلوار قمیص اور شیروانی پہنے ہوئے۔ معلوم ہوا یہ مولانا محمد ابراہیم ہیں جنھیں لوگ ''مولوی ابراہیم ڈنڈا'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ انارکلی کی ایک مسجد میں خطابت وامامت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

مولانا غزنوی اس زمانے میں پنجاب اسمبلی کے رکن تھے اور پاکستان کے قیام پر چودہ پندرہ مہینے کا عرصہ گزرا تھا۔ جو لوگ ہندوستان سے ترک وطن کر کے پاکستان آئے، ان میں سے زیادہ تر لوگ کاروبار، ملازمت اور رہائش وغیرہ کے بہت سے مسائل میں گھرے ہوئے تھے اور اس سلسلے میں بے شمار مصیبت زدہ افراد مولانا کے پاس آتے اور اپنی تکلیفیں بیان کرتے تھے۔ مولانا انھیں متعلقہ وزیر یا افسر کے پاس لے جاتے یا اسے ٹیلی فون کر دیتے یا طالب امداد کو رقعہ دے دیتے اور اللہ کے فضل سے کام ہو جاتا تھا۔ مولانا محمد ابراہیم بھی کسی مصیبت زدہ شخص کی اسی قسم کی امداد کے لیے تشریف لائے تھے اور ان کے کہنے کے مطابق مولانا نے متعلقہ شخص کو ٹیلی فون کر دیا تھا۔

اب آئندہ سطور میں آپ کو مولانا ابراہیم صاحب کے ان حالات سے مطلع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اس فقیر کے علم میں آئے۔

مولانا محمد ابراہیم ۱۹۰۲ء کے پس وپیش رزم گاہ جہاد بالاکوٹ کے ایک قصبے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''نلی ڈبریاں'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی میاں مسعود احمد تھا جو اس علاقے کے صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ والدہ بھی عابدہ وزاہدہ تھیں۔

حصول علم کا آغاز مولانا ابراہیم نے اپنے تایا مولانا محمد عبداللہ سے کیا۔ اس کے بعد اس نواح کے ایک عالم دین مولانا محی الدین کی خدمت میں حاضری دی۔ پھر کاکول (ایبٹ آباد) کے ایک بزرگ مولانا عبدالعزیز سے استفادہ کیا۔ اس علاقے کے ایک عالم دین مولانا محمد سعید تھے جو شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد تھے، ان سے بھی کسب فیض کیا۔ بعد ازاں لاہور میں مولانا غلام مرشد مرحوم (سابق خطیب بادشاہی مسجد) سے کتب حدیث پڑھیں۔

علوم رسمیہ کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تو بمبئی کا عزم کیا۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں وہاں کی ایک مسجد میں خطیب اور امام رہے۔ پھر ۱۹۲۹ء میں لاہور آ گئے اور پرانی سبزی منڈی کی مسجد کی خطابت ان کے سپرد ہوئی۔ ۱۹۴۲ء تک (تیرہ سال) یہ خدمت سرانجام دی۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں انارکلی کے وسط میں نظام ہوٹل کے قریب دہلی مسلم ہوٹل کے سامنے کی مسجد میں ڈیرا ڈال لیا اور چھوٹی سی مسجد میں خطابت وتبلیغ کا جو سلسلہ شروع کیا، وہ زندگی کے آخری دم (۱۹۸۲ء) تک جاری رہا۔ مسجد خوب صورت انداز میں تعمیر کی اور ان کا اخلاص تھا کہ بہت جلد یہ چھوٹی سی مسجد لاہور میں تبلیغ دین کا ایک مرکز بن گئی اور انارکلی میں ''مولوی ابراہیم والی مسجد'' کہلائی۔ اس وقت بھی یہ مسجد اسی نام سے موسوم ہے۔

سوال یہ ہے کہ مولانا ابراہیم کو مولوی ابراہیم ڈنڈا کیوں کہا جاتا تھا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مولانا ممدوح جرأت مند عالم دین تھے اور کلمہ حق کہنے میں نہایت بے باک تھے۔ اس سلسلے میں کسی کی کوئی پروانہ کرتے تھے۔ مثلاً کسی جنازے پر گئے اور جنازے کے بعد (جیسا کہ بریلوی حضرات کی عادت ہے) لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا شروع کی تو وہ اس کی سخت الفاظ میں مخالفت کرتے اور لوگوں کو اس سے روکتے۔ فرماتے جنازے کی دعا وہی ہے جو جنازے میں پڑھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سب بدعت، خلاف شرع اور باعث گناہ ہے۔ قل اور ختم وغیرہ کی سختی سے تردید کرتے۔ شادی بیاہ کے مواقع پر مسلمانوں میں جو رسمیں رواج پا گئی ہیں، ان کے ارتکاب سے ہر ممکن حد تک لوگوں کو روکتے۔ بعض اوقات واقعتاً ڈنڈا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لے کر میدان میں آجاتے اور اسی لیے انھیں لوگ ''مولوی ابراہیم ڈنڈا'' کہنے لگے تھے۔ تعزیت کے لیے آنے والے کو صف ماتم پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے سے منع کرتے۔ عام مجلسوں میں، خطبۂ جمعہ میں اور وعظ وتقریر میں بدعات اور اہلِ بدعت کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے۔

تقسیم ملک سے قبل سیاسیات میں مجلسِ احرار سے تعلق رکھتے تھے اور احرار رہنماؤں اور کارکنوں کا بے حد احترام کرتے جو شخص ان کے خلاف زبان کو حرکت دیتا، اس کے مقابلے پر اتر آتے۔

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد اور جمعیت علماے ہند کے علما و زعما سے نہایت عقیدت کا اظہار کرتے۔ ان کے متعلق زبان طعن دراز کرنے والے کے سامنے خاموش رہنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

مرزائیت سے انھیں بہ درجہ غایت نفرت تھی۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت میں بھی حصہ لیا اور ۱۹۷۴ء کی تحریک میں بھی سرگرم رہے۔ وہ مجاہدانہ طبیعت کے مالک تھے۔ حق گوئی کی پاداش میں انھیں جیل میں بھی جانا پڑا۔

ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سماجی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ لوگوں کے ہم درد اور بہی خواہ تھے۔ کوئی مدرسے کی مالی اعانت کے لیے آیا ہے تو اس کے ساتھ چل پڑے اور اصحابِ ثروت سے تعاون کی اپیل کرنے لگے، کسی نے مسجد کی تعمیر یا اس کی توسیع کا منصوبہ بنایا ہے تو اس کی امداد پر کمر بستہ ہوگئے۔

ان کی مسجد کے قریب اور نظام ہوٹل سے متصل ہمارے دوست حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم کی ریڈی میڈ کپڑے وغیرہ کی دکان تھی۔ نماز مغرب کے بعد حاجی صاحب مرحوم وہاں بیٹھتے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی اور ان سطور کا راقم بھی وہاں جاتے تھے۔ کبھی کبھی حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف اور بعض اور بزرگ بھی وہاں تشریف لے جاتے اور کچھ دیر نشست رہتی۔ بعض اوقات شورش کاشمیری مرحوم بھی ادھر کا رخ کر لیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا محمد ابراہیم بھی اس مجلس میں شریک ہو جاتے۔ پھر سیاسی باتیں بھی ہوتیں، لطائف بھی چلتے، مختلف مسالک فقہی سے تعلق رکھنے والے علماے کرام کا تذکرہ بھی ہوتا، شعر وادب کے موضوع پر بھی گفتگو ہوتی،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدید اور قدیم واقعات بھی بیان کیے جاتے۔ فقہی مسائل بھی زیر بحث آجاتے، یعنی ہر موضوع کو کسی نہ کسی انداز سے ہدف کلام ٹھہرایا جاتا۔

بعض دفعہ مولانا ابراہیم صاحب کسی مستحق کو وہاں لے آتے اور اس کے لیے تعاون کی اپیل فرماتے۔ نہایت خلوص اور بے حد خیر خواہی کے انداز میں اس کی ضرورت کا تذکرہ فرماتے۔

اپنی ذات کے سلسلے میں وہ نہایت غیور تھے۔

اپنے لیے کسی سے کسی چیز کا سوال کرنا یا کسی سے کوئی توقع رکھنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مسجد کی انتظامیہ سے بھی وہ خطابت و امامت وغیرہ کا کوئی پیسا نہیں لیتے تھے، سب کام فی سبیل اللہ کرتے تھے۔ میرے علم کے مطابق ان کا ذریعۂ معاش مسجد کے دروازے کے سامنے ان کی چھوٹی سی دکان تھی، جس میں وہ اپنے آبائی وطن ہزارہ یا سوات وغیرہ سے سردیوں میں کمبل اور شہد یا اسی قسم کی اور چیزیں لاتے اور فروخت کرتے تھے۔ اس سے جو بچت ہوتی تھی، اسی سے ان کی گھریلو ضروریات کا سلسلہ چلتا تھا۔

بارہا ایسا ہوا کہ مجھے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ساتھ جانے کا موقع ملا، مولانا ان کی دکان پر گئے، کمبل یا بعض دوسرے فروختنی چیزیں دیکھیں اور اپنی ضرورت کی چیزیں ان سے خریدیں۔

اب مولانا محمد ابراہیم کی وفات کے متعلق سنیے۔ ۱۹۷۵ء میں وہ کسی کام کے سلسلے میں کوئٹہ گئے۔ ان کا قیام قاضی بوستان (نائب وزیر ریاست قلات) کے گھر تھا۔ وہ ان کے مکان کی سیڑھیوں سے گر گئے، جس کی وجہ سے ان کے کولے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ زیادہ تر صاحب فراش ہی رہے۔ بالآخر اس مرد مجاہد نے جمعرات کے روز ۱۱۔ فروری ۱۹۸۲ء کو سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات پڑھتے ہوئے اسپتال میں وفات پائی۔

انا اللہ وانا الیہ راجعون

ان کی نماز جنازہ مولانا سید غلام نبی شاہ نے پڑھائی۔

اس وقت ان کی اولاد دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا۔ بیٹے کا نام میاں عبدالرحمٰن ہے، جو اپنے عالی مرتبت والد کی جگہ اسی مسجد کے خطیب ہیں۔ حلیم الطبع اور ملنسار عالم دین ہیں۔

مولانا محمد ابراہیم مرحوم احناف کے دیوبندی مکتب فکر کے اہل علم بزرگ تھے۔ ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وفات پر چھبیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی زبان میں چوتھائی صدی گزر گئی ہے، لیکن دیوبندی مکتب فکر کے کسی اہل قلم نے ان کے حالات نہیں لکھے۔ مولانا کوثر نیازی سے مولانا ابراہیم مرحوم کے اچھے مراسم تھے، وہ ان کے دور وزارت سے پہلے بھی ان سے ملتے رہے اور دور وزارت میں بھی ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ نیازی صاحب مرحوم نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ مولانا ابراہیم ڈنڈا کے بارے میں انھوں نے ایک مختصر سا مضمون لکھا ہے، لیکن افسوس ہے، وہ مضمون راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔

اس فقیر پر مولانا ابراہیم بڑی شفقت فرماتے تھے اور مجھے اکثر انھیں سلام کرنے کی سعادت حاصل ہوتی تھی۔ بہت مدت سے میری خواہش تھی کہ ان کے متعلق جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ ضبط تحریر میں لاؤں، چناں چہ یہ چند سطور نذر قارئین کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان سطور میں ان سے متعلق کوئی خاص بات نہیں ہے، لیکن میرا سرمایۂ معلومات یہ ہی ہے۔ مولانا مرحوم کے صاحب زادے عزیز القدر میاں عبدالرحمٰن صاحب ان کی جگہ اس مسجد میں خطابت وامامت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ حفظ قرآن کا مدرسہ بھی اس مسجد میں میاں عبدالرحمٰن صاحب نے جاری کر رکھا ہے۔ بہت سے بچے حفظ قرآن کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ میاں عبدالرحمٰن صاحب اپنے والد محترم کی طرح خوش اخلاق، نیک اطوار اور ملنسار ہیں۔ ان سے بھی مولانا مرحوم کے متعلق کسی اہم بات کا پتا نہیں چل سکا۔

ہم عاجز بندوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد ابراہیم مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور تبلیغ دین کے سلسلے میں ان کے صاحب زادۂ گرامی اور دیگر متعلقین کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازے۔

آمین یا رب العالمین

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفتی عتیق الرحمان عثمانی

(وفات ۱۲۔ مارچ ۱۹۸۴ء)

۱۹۳۸ء میں دہلی کے علاقہ قرول باغ میں جن حضرات نے ''ندوۃ المصنفین'' کے نام سے تصنیفی واشاعتی ادارہ قائم کیا تھا، ان میں مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مفتی عتیق الرحمان عثمانی شامل تھے۔ ان میں سے میرے تھوڑے بہت مراسم مولانا سیوہاروی اور مولانا اکبرآبادی سے تو بے شک تھے، لیکن مفتی صاحب کو نہ میں نے دیکھا تھا اور نہ ان سے کبھی مراسلت کا موقع ملا تھا۔ یہ تینوں حضرات یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اپنے تعلق کی بنا پر اس کتاب میں چوں کہ مولانا سیوہاروی اور مولانا اکبرآبادی کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ ان کے تیسرے ساتھی مفتی عتیق الرحمان کے بارے میں بھی اپنی محدود معلومات کے مطابق کچھ عرض کردیا جائے تاکہ قارئین کرام ان تینوں نامور شخصیتوں کا ذکر ایک ہی جگہ ملاحظہ فرماسکیں۔

مفتی عتیق الرحمان کا شمار دیار ہند کے جید علما میں ہوتا تھا۔ وہ جمعیت علماے ہند کے رکن، دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کی مجلس شوریٰ کے ممبر، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے نائب صدر اور ندوۃ المصنفین دہلی کے روح رواں تھے۔

مفتی صاحب مرحوم کا آبائی وطن دیوبند تھا اور وہاں کے عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا اسم گرامی مفتی عزیز الرحمان عثمانی تھا جو دارالعلوم دیوبند کے اولین مفتی تھے اور جدِ امجد کا نام نامی مولانا فضل الرحمان عثمانی تھا جو دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔

مفتی عتیق الرحمٰن ۱۹۰۱ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے اور علم وفضل کے ماحول میں پرورش پائی۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کی منزلیں طے کیں اور اکابر علما کی صحبت وتربیت میں رہنے کا شرف حاصل کیا۔ تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، منطق وفلسفہ، ادب وبلاغت، صرف ونحو وغیرہ علوم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جوان کے دور میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھائے جاتے تھے، محنت اور انہماک سے پڑھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دارالعلوم ہی میں اپنے والد مکرم مولانا مفتی عزیز الرحمان عثمانی کے ماتحت نائب مفتی اور مدرس مقرر ہوئے۔ جوانی کا زمانہ تھا اور دل میں خدمت دین کا جذبہ کار فرما تھا، اپنے مفوضہ فرائض حسن وخوبی سے انجام دینا شروع کیے۔ کئی سال اس کام پر مامور رہے۔

اس کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں بعض اکابر کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ اس اختلاف نے اتنی شدت اختیار کی کہ علما و مدرسین کی ایک بڑی جماعت جو جلیل القدر اصحاب پر مشتمل تھی، ترک دارالعلوم پر مجبور ہو گئی۔ ان حضرات میں مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مفتی عزیز الرحمان عثمانی کے نام لائق تذکرہ ہیں۔ یہ تمام حضرات علمی اعتبار سے اپنے وقت کے معروف لوگ تھے۔ مفتی عتیق الرحمان عثمانی اس زمانے میں جوانی کی منزل سے گزر رہے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ دارالعلوم سے رخصت ہو گئے اور صوبہ گجرات کے ایک مقام ڈابھیل میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں ایک دارالعلوم قائم کیا اور تعلیم و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔

ڈابھیل میں ان حضرات نے جو خدمات سرانجام دیں وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ یہاں تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی خوب کام ہوا اور علما و طلبا کی ایک بڑی تعداد نے خدمت دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

اس کے بعد حالات نے ایک اور کروٹ لی۔ مفتی عتیق الرحمان نے دہلی کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور ۱۹۳۸ء میں مفتی عتیق الرحمان عثمانی، مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور بعض دیگر حضرات نے دہلی کے قرول باغ میں ندوۃ المصنفین کے نام سے ایک تصنیفی اور اشاعتی ادارے کی طرح ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ماہنامہ رسالہ جاری کیا جس کا نام ''برہان'' رکھا اور اس کے ایڈیٹر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو مقرر کیا گیا۔

ندوۃ المصنفین کے ناظم مفتی عتیق الرحمان تھے اور اچھے انداز سے کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں ہندوؤں نے حملہ کر کے ندوۃ المصنفین کی عمارت کو آگ لگا دی، کتب خانہ تباہ کر دیا گیا اور سامان لوٹ لیا گیا۔ اس سے بے شک ندوۃ المصنفین کے بانیوں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمدردوں کو سخت صدمہ پہنچا، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور حالات سے مایوس نہیں ہوئے۔ جوں ہی فضا کچھ سازگار ہوئی، ندوۃ المصنفین اور برہان کے دفاتر دہلی کی جامع مسجد کے قریب اردو بازار میں منتقل کر دیئے گئے اور پہلے سے بھی زیادہ جوش اور جذبے سے کام ہونے لگا۔

آزادی سے قبل بھی ندوۃ المصنفین نے بہت کام کیا لیکن آزادی کے بعد تو اس کے باہمت ارکان نئے عزم اور نئے ولولے کے ساتھ میدان عمل میں اترے اور بہت سی کتابیں شائع کیں۔ مجموعی اعتبار سے اس کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد ایک سو تیں پینتیس کے قریب ہوگی۔ ان میں سے چند کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی (عربی) تفسیر مظہری جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کی قصص الانبیا چار جلدوں میں، مولانا بدر عالم کی ترجمان السنہ چار جلدوں میں، علاوہ ازیں اخلاق اور فلسفہ اخلاق، اسلام کا اقتصادی نظام، اسلام کا زرعی نظام، اسلام کا نظام حکومت، اسلام کا نظام مساجد، مسلمانوں کا نظام مملکت، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامہ، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت عمر کے سرکاری خطوط، حضرت عثمان کے سرکاری خطوط، العلم والعلماء کا اردو ترجمہ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی فہم قرآن، غلامان اسلام اور سیرت حضرت ابوبکر صدیق وہ کتابیں ہیں جو حسن ظاہری سے بھی مزین ہیں اور حسن باطنی سے بھی۔ ان کی کتابت وطباعت کا تمام کام مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی نگرانی میں ہوا۔

ندوۃ المصنفین کو پہلا دھچکا اس وقت لگا۔ جب ۲۔ اگست ۱۹۶۲ء کو اس کے مشہور رکن اور نامور عالم مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ پھر ۱۲۔ مئی ۱۹۸۴ء کو مفتی صاحب بھی اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے۔ یہ دوسرا صدمہ تھا جو اس ادارے کو پہنچا۔ اس کے بعد ۲۴۔ مئی ۱۹۸۵ء کو اس کے بانی ارکان میں سے تیسرے رکن مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس دنیائے دوں سے منہ موڑا۔ یہ انتہائی اور آخری المیہ تھا جس سے ندوۃ المصنفین دوچار ہوا۔

اس طرح اس ادارے کے تینوں بانی ارکان یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان سطور کے راقم کو نہ تو مفتی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل تھا اور نہ ان سے خط وکتابت ہوئی۔ تاہم ان کی وفات سے بہت صدمہ پہنچا۔ وہ مستقل طور پر دہلی میں رہتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک سہارا تھے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ ان کی خدمت میں آتے تھے، جو ان سے شرعی مسائل بھی دریافت کرتے تھے اور اپنے دکھ درد میں بھی انھیں اپنا شریک بناتے تھے۔ وہ ان کی بات توجہ سے سنتے اور جہاں تک ممکن ہوتا ان کی مدد کرتے۔ کبرسنی میں بھی وہ دور دراز مقامات کے سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔ ان پر مرض الموت کا حملہ بھی دوران سفر ہی میں ہوا۔ فروری ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ارباب انصرام نے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سیمینار منعقد کیا تو اس میں وہ شریک تھے۔ سیمینار سے فارغ ہو کر بذریعہ ٹرین واپس دہلی جا رہے تھے۔ جب ٹرین دریاباد کے اسٹیشن پر پہنچی تو ان پر ناگہاں فالج کا حملہ ہوا۔ انھیں وہیں ٹرین سے اتار کر لکھنؤ پہنچایا گیا اور وہاں کے بلرام اسپتال میں داخل کیا گیا۔ آٹھ دس دن وہ ہسپتال میں ماہر ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ جب طبیعت سنبھلی تو انھیں ان کے گھر دہلی لے جایا گیا۔ اس کے بعد بھی ان پر بیماری کے اثرات باقی رہے، لیکن انھوں نے اس کی پروا نہیں کی اور برابر اپنے کام میں مشغول رہے۔ ندوۃ المصنّفین ان کی سرگرمیوں کا اصل مرکز تھا اور اس کی خدمت کو انھوں نے ہمیشہ ہر شے پر مقدم رکھا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے والد مکرم مولانا مفتی عزیز الرحمان عثمانی کا انتقال بھی عارضۂ فالج سے ہوا تھا۔ مفتی صاحب دیوبند کے ایک بڑے خاندان کے بڑے فرزند تھے۔ ان کے جدِ امجد بھی اپنے دور کے جید عالم دین تھے اور والد محترم بھی وہ تمام علوم باقاعدہ حاصل کر چکے تھے جو اس زمانے میں عربی اور دینی مدارس میں پڑھائے جاتے تھے۔ علم فقہ میں وہ بالخصوص درک رکھتے تھے، اسی لیے انھیں دارالعلوم دیوبند کا اولین مفتی مقرر کیا گیا تھا۔

مفتی عتیق الرحمان بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اور یہ خوبیاں انھوں نے ورثے میں پائی تھیں۔ وہ اچھے مقرر اور مدرس تھے۔ زور اور اعتماد سے بات کرتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو تکلیف آتی، اس کے ازالے کے لیے کوشاں ہوتے اور اس کو رفع کرنے کے لیے حکومت کے اونچے سے اونچے دروازے پر دستک دیتے۔

ہندوستان کے اس عالم دین نے ۱۲۔ مئی ۱۹۸۴ء کو وفات پائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پروفیسر محمد سرور جامعی

(وفات ۲۲۔ ستمبر ۱۹۸۴ء)

جنوری ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک دن فرمایا: ''چلیے آپ کو سرور صاحب سے ملائیں......۔'' میں ان دنوں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں کام کرتا تھا۔ ندوی صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اور میں معاون ایڈیٹر۔ ''الاعتصام'' گوجراں والا سے نکلتا اور لاہور میں چھپتا تھا۔ میں اسے چھپوانے کے لیے ہر منگل کو لاہور آتا تھا۔ مولانا حنیف ندوی نے محض سرور صاحب سے ملانے کے لیے میرے ساتھ لاہور آنے کا پروگرام بنایا۔

سرور صاحب اس زمانے میں ہفت روزہ ''آفاق'' کے ایڈیٹر تھے، جو پاکستان کا ایک مشہور اور معیاری اخبار تھا۔ اس کے عملہ ادارت میں ممتاز صحافی میاں محمد شفیع اور چودھری علی محمد خادم شامل تھے۔ میاں محمد شفیع م۔ش کے قلمی نام سے ''لاہور کی ڈائری'' لکھتے تھے۔ یہ ان کا ایسا کالم تھا جس کے مطالعے سے درون خانہ کی بہت سی مخفی اور بسا اوقات حیران کن سیاسی باتوں کا پتا چلتا تھا، اس بنا پر یہ کالم دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔

میاں محمد شفیع کے متعلق میں اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں مضمون لکھ چکا ہوں۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور چودھری علی محمد خادم کا مختصر سا تعارف زیر مطالعہ کتاب کے اس مضمون میں کرادیا گیا ہے جو مولانا محمد اسحاق چیمہ کے بارے میں ہفت قلیم میں لکھا گیا ہے۔

آفاق کا دفتر ٹمپل روڈ پر ریگل سینما کے ساتھ والی بلڈنگ کی نچلی منزل میں تھا۔ میں اور مولانا محمد حنیف ندوی دس بجے کے قریب سرور صاحب سے ملنے دفتر پہنچے تو وہ موجود نہ تھے۔ دفتر میں کام کرنے والوں نے بتایا کہ آنے ہی والے ہیں۔ باہر نکلے تو ایک صاحب ہمیں دیکھ کر جلدی سے بائیسکل سے اترے۔ ہم نے ان کو بائیسکل چلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اترتے ہوئے دیکھا۔ وہ کالے رنگ کی شیروانی زیب تن کیے، سر پر اسی رنگ کی جناح کیپ سجائے، کھلے پائنچے کا لٹھے کا پاجامہ پہنے اور آنکھوں پر نظر کی عینک لگائے ہوئے تھے۔ نہایت تپاک سے ملے اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ وہیں کھڑے کھڑے مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا اور پھر ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا: ''آپ ہیں سرور صاحب!''

سرور صاحب ہمیں اندر لے گئے، چائے پلائی اور دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ سرخ وسفید رنگ، تیکھے نقوش، متوازن جسم، پورا قد، زبان میں لکنت، گفتگو میں متانت و وقار، مولانا حنیف ندوی کے سامنے سراپا عقیدت بنے ہوئے۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں کئی سال مصر رہے تھے اور مصری اہل علم اور وہاں کی تہذیب وثقافت سے بہت متاثر تھے۔ چہرے کا میدان بالوں سے صاف، ﴿قاعا صفصفا﴾ (طٰہٰ: ١٠٦)۔ رنگ روپ، شکل وشباہت، نقش ونگار، اور قد و قامت کے اعتبار سے مصری معلوم ہوتے تھے۔ اسلوبِ کلام مہذبانہ، طرز ادا مودبانہ، لہجہ عقیدت مندانہ۔ کہتے کم، سنتے زیادہ تھے، جیسے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ میں چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا، کسی بات میں دخل نہیں دیا۔ میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔

اس سے چار مہینے بعد اپریل ۱۹۵۰ء میں وہ ''آفاق'' کی توسیع اشاعت اور اخبارات کی ایک ایجنسی سے پہلی رقم وصول کرنے کے لیے گوجراں والا گئے۔ اخبار ''الاعتصام'' کے دفتر بھی تشریف لے گئے۔ وہاں مولانا اسماعیل صاحبؒ اور مولانا حنیف ندویؒ سے ملے اور مختلف امور پر باتیں کیں۔ میں بھی اس مجلس میں موجود تھا لیکن سامع کی حد تک۔ تین اکابر کی مجلس میں ہمیشہ سماع کا قائل رہا۔ اب بھی اسی مسلک پر عامل ہوں۔

پہلی ملاقات کے علاوہ میں نے کبھی سرور صاحب کو شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔ سردیوں میں انگریزی سوٹ اور گرمیوں میں پینٹ شرٹ پہنتے تھے۔ بعض اوقات ٹوپی اور شلوار قمیص زیب تن کرتے تھے۔

سرور صاحب ۱۹۰۴ء میں موضع سیکریالی تحصیل کھاریاں، ضلع گجرات (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ گجرات کے آزاد ہائی سکول سے، جسے بعد میں اسلامیہ ہائی سکول کہا جانے لگا تھا، میٹرک پاس کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس موقعے پر چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ گجرات کا آزاد ہائی سکول کیا تھا؟ کب قائم ہوا تھا اور کس کی سعی و ہمت سے قائم ہوا تھا؟

پہلی جنگ عظیم کے بعد جو ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی، ہندوستان میں آزادی کی کئی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔ تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ہجرت اور تحریکِ خلافت وغیرہ۔ ترکِ موالات (نان کواپریشن) کا سلسلہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔ لوگوں نے انگریزی چیزیں خریدنا اور استعمال کرنا بند کردی تھیں۔ انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے، برتن اور دوسرے تمام سامان کا بائیکاٹ کردیا گیا تھا۔ وکیلوں نے انگریزوں کی عدالتوں میں جانے اور مقدمے لڑنے کا سلسلہ ختم کردیا تھا۔ طلبا نے حصولِ تعلیم کے لیے سکولوں اور کالجوں میں جانے سے انکار کردیا تھا، اور پورا ملک انگریزی حکومت کے خلاف میدانِ عمل وحرکت میں نکل آیا تھا۔

تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ ہجرت وغیرہ دراصل ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

پنجاب میں مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ پہلے عالمِ دین تھے جنھوں نے پورے صوبے کا دورہ کیا اور اٹک سے لے کر انبالے کے آخری سرے تک بے شمار خلافت کمیٹیاں قائم کیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے زیادہ تر ضلع اور شہر گجرات کو مرکز توجہ ٹھہرایا اور ان کی سعیِ مسلسل اور جذبۂ آزادیٔ وطن کے نتیجے میں اس شہر اور ضلعے میں تیرہ سو خلافت کمیٹیاں معرضِ قیام میں آئیں۔ اس ضلعے کے لوگوں نے اس دور کی خلافِ انگریز سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ملک کے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کا استقبال کیا۔

۱۹۲۰ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی بھاگ دوڑ اور شب وروز کی کوشش سے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے گجرات میں ''آزاد ہائی سکول'' قائم ہوا، جس میں وہ طلبا داخل کیے گئے تھے جنھوں نے ترک موالات کے سلسلے میں سرکاری سکولوں میں تعلیم حاصل کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر چودھری فیض محمد ایم۔ اے کو اور سیکنڈ ماسٹر ملک نصر اللہ عزیز خاں کو مقرر کیا گیا تھا۔ ملک حسن علی جامعی بھی اس سکول میں پڑھاتے رہے تھے۔ اسی زمانے میں علی گڑھ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ دونوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیمی اداروں کے سیاسی نقطہ فکر کی ہم آہنگی کے پیش نظر آزاد ہائی سکول کا الحاق جامعہ ملیہ سے کر دیا گیا تھا۔ گجرات کے آزاد ہائی سکول کی طرح ملک کے بعض دوسرے شہروں میں بھی سکول کھولے گئے تھے، جن میں وہ لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے جو خود یا جن کے والدین ترکِ موالات کے حامی تھے۔

تحریکِ ترکِ موالات سے قبل سرور صاحب گجرات کے سرکاری ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کو سیاسیات سے لگاؤ تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر انگریز دشمن سیاسی رہنماؤں کی مجلسوں میں جاتے اور ذوق وشوق سے ان کی تقریریں سنتے تھے۔ ان کی تقریروں سے متاثر ہوکر سرور صاحب نے سرکاری سکول چھوڑ دیا تھا اور آزاد ہائی سکول میں داخل ہوگئے تھے۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات نے زور پکڑا تو انگریزی حکومت نے اس کے تمام رہنماؤں کو گرفتار کر کے ملک کی مختلف جیلوں میں بند کر دیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں سے اکثر کو میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ آب وہوا، گرمی کی شدت اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر اس جیل کو پنجاب کا کالا پانی کہا جاتا ہے۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے بعض قیدیوں کو انگریزی حکومت نے اسی جیل میں مقید رکھنا مناسب خیال کیا۔ ان قیدیوں میں زیادہ مشہور اور خطرناک لوگ مندرجہ ذیل تھے، جو میانوالی جیل میں لائے گئے تھے۔

مولانا سید داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا لقاء اللہ پانی پتی، صوفی محمد اقبال، مولانا اختر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا عبداللہ چوڑی والے دہلوی، سید حبیب، پنڈت بنکی رام شرما، لالہ ترلوک چند، ڈاکٹر ستیہ پال، دیش بندھوداس گپتا، سردار منگل سنگھ، بابا گوردت سنگھ، سردار سردول سنگھ کویشر، بابا کھڑک سنگھ، ماسٹر تاج الدین انصاری، سوامی شردھانند، منشی احمد الدین، خواجہ عبدالرحیم عاجز اور وزیر آباد کے راجا غلام قادر!۔

شاہ جی کی گرفتاری کے بعد گجرات کی سیاست کا رخ بدل دیا گیا۔ حکومت نے آزاد ہائی سکول کا نام اسلامیہ ہائی سکول رکھ دیا اور جامعہ ملیہ سے اس کا سررشتۂ تعلق توڑ کر پنجاب یونیورسٹی سے جوڑ دیا تھا۔ سرور صاحب نے اسی آزاد سکول سے میٹرک پاس کیا۔ اس زمانے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اساتذہ میں ملک نصر اللہ خاں عزیز اور ملک حسن علی جامعی بھی شامل ہیں، ان کا تذکرہ وہ اکثر کرتے اور بڑے احترام سے ان کے نام لیتے تھے۔

۲۹۔اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا، جس کا افتتاح شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے کیا تھا۔ آزاد ہائی سکول گجرات سے میٹرک کرنے بعد سرور صاحب نے علی گڑھ کا عزم کیا اور جامعہ ملیہ میں داخل ہوگئے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد جامعہ ملیہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کردیا گیا تو سرور صاحب دہلی چلے گئے، وہ اس کے ابتدائی دور کے طلبا میں سے تھے۔ عربی ادب اور تاریخ ان کے خاص مضامین تھے۔ جامعہ سے بی اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر گئے اور جامعہ ازہر میں داخلہ لیا۔ چار سال وہیں مقیم رہے۔ قیام مصر کے دوران میں انھوں نے عربی ادب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ مصر اور عالم اسلامی کے سیاسی کوائف کے متعلق آگاہی حاصل کی، وہاں کے قومی ذہن رکھنے والے قائدین کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں اور ان سے متاثر ہوئے اور یہ تاثر عمر بھر قائم رہا۔

مصر میں چار سالہ قیام کے بعد وطن واپس آئے تو دہلی گئے اور جامعہ ملیہ میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ اس وقت جامعہ ملیہ کے مہتمم اعلیٰ نامور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم تھے، جو آزادی کے بعد ہندوستان کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔

انگریزوں کے دور حکومت میں جامعہ ملیہ کے سند یافتہ کو سرکاری ملازمت نہیں ملتی تھی، لیکن اس کے باوجود لوگ اس سے دلچسپی رکھتے اور اس کے طریق تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کارپردازان جامعہ نے اس کے اسلوب درس وتدریس سے لوگوں کو متعارف کرانے کے لیے پنجاب میں جامعہ کی ایک شاخ قائم کی تو ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایما سے سرور صاحب پنجاب آگئے اور تعلیمی وتدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے عملی صحافت کا آغاز کردیا، اور ۱۹۳۴ء میں روزنامہ ''زمیندار'' (لاہور) کے عملۂ ادارت میں شامل ہوگئے۔ ''زمیندار'' اس زمانے میں برصغیر کا ایک وقیع اور مقبول اخبار تھا اور سرور صاحب اس کے افتتاحیہ نگاروں کی جماعت کے رکن تھے، جو متعدد لائق ترین افراد پر مشتمل تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب ان کے کاروان حیات نے ایک اور موڑ کاٹا اور برصغیر کی ایک بڑی شخصیت سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں وہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی ہدایت پر مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم قیام فرما تھے۔ سرور صاحب نے مولانا سندھی سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے علمی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی فلسفے اور تعلیمات کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ان سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد وہ تمام عمر اپنے فہم وفکر کے مطابق اس فلسفے اور تعلیم کی نشر واشاعت کرتے رہے۔ اس سے اتفاق بھی ہوسکتا ہے اور بعض گوشوں سے اختلاف بھی، لیکن یہاں اس بحث میں پڑنے اور اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

مکہ مکرمہ سے سرور صاحب واپس آئے تو جامعہ ملیہ (دہلی) میں بیت الحکمت کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا بنیادی مقصد شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے فروغ و ترویج کے متعلق خدمت سرانجام دینا تھا۔

جامعہ سے طویل رخصت لے کر ۱۹۴۲ء میں سرور صاحب پھر پنجاب آئے اور لاہور کے روزنامہ ''احسان'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، لیکن اس اخبار کی پالیسی سے عدم اتفاق کے باعث ۱۹۴۳ء میں اس سے الگ ہوگئے۔ اسی سال انھوں نے شاہ ولی اللہ دہلوی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار و تصورات اور فلسفہ وحکمت کی تبلیغ واشاعت کے لیے ''سندھ ساگرا کیڈمی'' کے نام سے ایک طباعتی او اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اس کے ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا سلسلہ جو پہلے سے جاری تھا اور تیز کردیا۔

آزادئ وطن سے قبل اگرچہ سرور صاحب نے لاہور کے بعض اخبارات میں کام کیا، لیکن اس اثنا میں ان کا اصل تعلق دہلی کی جامعہ ملیہ سے رہا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ جامعہ میں استاد تھے۔ موسم گرما کی چھٹیوں میں لاہور آئے تو برصغیر آزاد ہوگیا اور پاکستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے نقشۂ عالم پر ابھر آیا۔ پھر وہ دہلی نہیں گئے اور مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر ہوگئے۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں جب لاہور سے روزنامہ ''امروز'' جاری ہوا تو اس کی مجلس ادارت میں پروفیسر محمد سرور بھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ ''امروز'' سے منسلک رہے، پھر علیحدہ ہوگئے۔ علیحدگی کے بعد اپنے بعض احباب سے مل کر لاہور سے ہفت روزہ ''آفاق'' جاری کیا۔ آفاق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں انھوں نے مسئلہ ملکیت زمین کے موضوع پر مدلل مضامین لکھے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نقطہ نظر سے اختلاف کا اظہار کیا۔ یہ مضامین علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے اور دلچسپی سے پڑھے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ ہفتہ وار اخبار روزنامہ ہوگیا اور چند وجوہ سے سرور صاحب اس سے علیحدہ ہوگئے۔

آفاق سے علیحدگی سے کچھ مدت بعد وہ کراچی چلے گئے اور پاکستان کی وزارت اطلاعات ونشریات کے محکمۂ مطبوعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر مقرر کیے گئے، لیکن کراچی میں وہ زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکے اور لاہور واپس آگئے۔ لاہور میں انھیں محکمۂ اطلاعات پنجاب کے ڈپٹی ڈائریکٹر مطبوعات کا منصب سونپا گیا، مگر یہاں بھی ان کا دل نہ لگا اور سرکاری ملازمت ترک کردی۔

۱۹۵۹ء میں پشاور پہنچے اور وہاں کے ایک اخبار روزنامہ ''بانگ حرم'' کی عنان ادارت سنبھالی۔ کچھ عرصہ وہاں رہے۔ پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ اسے بھی چھوڑ دیا۔

اس زمانے میں محکمۂ اوقاف کی طرف سے حیدرآباد (سندھ) میں شاہ ولی اللہ اکادمی قائم ہوچکی تھی اور اس نے اپنا ایک ماہنامہ ''الرحیم'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس کی ادارتی ذمہ داریاں سرور صاحب کے سپرد کی گئیں۔ کئی سال وہ اس ادارے سے منسلک رہے۔

''الرحیم'' اپنے نقطۂ فکر کا معیاری رسالہ تھا۔ اس میں سرور صاحب اور بعض دوسرے حضرات کے علمی وتحقیقی مقالات معرض اشاعت میں آتے تھے۔ چند وجوہ کی بنا پر وہ ''الرحیم'' کی ادارت سے بھی دست بردار ہوگئے۔ اس کے بعد انھیں مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) کے ترجمان مجلّہ ''فکر ونظر'' کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔ کچھ مدت وہ اس سے وابستہ رہے۔

اگست ۱۹۶۹ء میں ان کا تعلق ادارہ ثقافت اسلامیہ (لاہور) سے قائم ہوا اور ادارے کے ترجمان ماہنامہ ''المعارف'' کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام تھے۔ وہی ان کو یہاں لائے تھے۔ دوسال وہ یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اور ان سے دوسال ہی کا معاہدہ تھا۔

اس کے بعد انھیں حکومت پاکستان کے ماہنامے ''الزکوۃ'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ یہ رسالہ نیشنل پریس ٹرسٹ کی نگرانی میں مرکزی وزارت اوقاف کی طرف سے شائع ہوتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرور صاحب بہت محنتی اور کام کے دھنی تھے۔ کبھی ہم نے ان کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سنے کہ آج اتنا کام کیا ہے کہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے۔ اپنی تدریسی اور صحافتی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصنیفی اور تحقیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کی تصنیفات و تالیفات اور تراجم و مرتبات کی فہرست مندرجہ ذیل کتابوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ مضامین محمد علی: مولانا محمد علی جوہر کے مضامین کا یہ مجموعہ دو جلدوں میں ہے، اور ان مضامین پر مشتمل ہے جو ''ہمدرد'' میں شائع ہوئے، لیکن ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنی تصنیف ''مولانا محمد علی اور ان کی صحافت'' (کے صفحہ ۶۸ تا ۷۰) میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب ''محمد علی...... ذاتی ڈائری کے چند اوراق'' سے کچھ اقتباس نقل کیے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ تمام مضامین مولانا محمد علی جوہر کے نہیں ہیں، بلکہ بعض مضامین مولانا عبدالماجد دریابادی اور ''ہمدرد'' کے دیگر ارکانِ ادارہ کے بھی ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لکھتے ہیں۔

''پروفیسر محمد سرور صاحب نے متعدد ایسے مقالات اپنے مرتبہ ''مضامین محمد علی'' کے دونوں مجموعوں میں شامل کر لیے ہیں جو ''ہمدرد'' میں مولانا محمد علی کے نام سے نہیں چھپے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا دریابادی نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔'' سرور صاحب کے مرتب کردہ یہ دونوں مجموعے ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیے۔

۲۔ خطوط محمد علی: ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ ۱۹۴۰ء۔

۳۔ مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر: ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی ۱۹۴۰ء۔

۴۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ حالات زندگی اور سیاسی افکار: ناشر سندھ ساگر اکادمی لاہور، ۱۹۴۵ء۔

۵۔ تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ و تاریخ: یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب ''لمعات'' کا اردو ترجمہ ہے۔ ناشر سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔ ۱۹۴۶ء۔

۶۔ مشاہدات و معارف: شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف ''فیوض الحرمین'' کا اردو ترجمہ۔ ناشر سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔ ۱۹۴۷ء۔

۷۔ خطبات مولانا عبیداللہ سندھی: ناشر، سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۔ تصوف کے آداب واشغال اوران کا فلسفہ: شاہ ولی اللہؒ کی تصنیف ''القول الجمیل فی بیان سواء السبیل'' کا اردو ترجمہ۔ ناشر، سندھ ساگرا کادمی، لاہور۔

۹۔ شخصیات: مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین اور بعض دوسری مشہور شخصیتوں کے حالات۔

۱۰۔ مولانا محمد علی بحثیت تاریخ اور تاریخ ساز: ناشر، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی ۱۹۶۲ء۔

۱۱۔ کابل میں سات سال: اکتوبر ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۲ء (از مولانا عبیداللہ سندھی) مرتبہ پروفیسر محمد سرور جامعی۔

۱۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ افادات وملفوظات: ناشر، سندھ ساگرا کادمی لاہور۔

۱۳۔ ارمغان شاہ ولی اللہ: ناشرادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے اس کتاب کی جب دوسری مرتبہ اشاعت کا فیصلہ کیا گیا، سرور صاحب اس وقت اسلام آباد میں ''الزکوٰۃ'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ دفتر کی طرف سے یہ ذمے داری مجھ پر عائد کی گئی تھی کہ میں ان سے خط وکتابت کروں کہ اگر وہ اس کتاب پر نظر ثانی کرنا یا اس میں کچھ اضافے کرنا چاہتے ہیں تو کرلیں تاکہ وہ دوبارہ کتابت کرا کے اسے شائع کیا جائے، چناں چہ سرور صاحب نے اس کے متعدد مقامات پر اضافے کیے۔ جہاں قرآن مجید کی آیات کا صرف اردو ترجمہ دیا گیا تھا، اصل الفاظ نہیں لکھے گئے تھے، وہاں مع حوالے کے اصل الفاظ درج کیے گئے، جہاں حدیث کا ترجمہ دینے پر اکتفا کیا گیا تھا وہاں حدیث کے الفاظ لکھے۔ اسی طرح بعض تفصیل طلب عبارتوں کی تفصیل بیان کی۔ پھر سرور صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس کی پروف ریڈنگ یا اس میں حک واضافہ اپنی صوابدید کے مطابق میں خود کروں، چنانچہ ان کے حکم کے مطابق میں نے پروف ریڈنگ بھی کی اور اضافہ بھی کیا۔

۱۴۔ شاہ ولی اللہؒ کی تصنیف ''قول فیصل'' کا اردو ترجمہ

۱۵۔ شاہ صاحب کی تصنیف ''تاویل الاحادیث'' کا ترجمہ

۱۶۔ شاہ صاحب کی کتاب ''لمعات'' کا ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۷۔ شیخ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ''الفوائد الفواد'' کا ترجمہ

۱۸۔ تحریک اسلامی اور اسلامی دستور۔

۱۹۔ مولانا مودودی کی تحریک اسلامی

۲۰۔ مسلمان قوم کے اسبابِ زوال۔

۲۱۔ پنجابی ادب۔

ان کتابوں کے علاوہ سرور صاحب نے اخبارات و رسائل میں بے شمار مضامین و مقالات سپرد قلم کیے۔ ان کا زیادہ تر کام بعض اہل قلم کے مضامین و مقالات کی جمع و ترتیب اور تراجم سے متعلق ہے۔

سرور صاحب اپنے افکار و تصورات کی بنا پر حلقۂ اہل علم میں خاص شہرت رکھتے تھے اور دل کی بات کہنے اور لکھنے میں انھیں کوئی حجاب نہ تھا۔ تاہم احتیاط کا دامن تھامے رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ بہت سے حضرات ان سے متفق نہ تھے اور بہت سے اہل علم ان کے مداح اور موید تھے، لیکن بارگاہ الٰہی سے انھیں کچھ ایسی فطرت عطا کی گئی تھی کہ نہ وہ کسی کی مدح وستائش پر اتراتے تھے اور نہ کسی کی نکتہ چینی اور تنقید سے اظہار اضطراب کرتے تھے۔ اپنی بات وہ کسی نہ کسی انداز میں بہرحال بیان کر دیتے تھے۔

اکابر علما میں وہ جن حضرات کے مداح تھے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ مولانا سے ان کو ملاقات کے زیادہ مواقع نہ ملے، لیکن ان کے علم و ادراک کے مختلف گوشوں سے وہ بہت متاثر تھے اور نہایت احترام سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ جو شخص مولانا کے بارے میں کوئی بات کرتا، انتہائی توجہ سے سنتے۔ ہمارے ہاں کے بعض لوگوں نے اپنے آپ پر یہ ضروری قرار دے رکھا ہے کہ مولانا سے متعلق سلسلۂ گفتگو میں تنقید و تردید کا پہلو لازماً تلاش کیا جائے۔ سرور صاحب پر یہ اسلوبِ کلام بہت گراں گزرتا تھا۔ وہ اس قسم کی باتیں کرنے والے کے سامنے تن جاتے اور بسا اوقات غصے سے آستینیں چڑھا لیتے تھے۔ اگر انھیں خاموش رہنے کو کہا جاتا تو جواب دیتے، صاحب! میں کب سے ان کی باتیں سن رہا ہوں، یہ کہاں کے عالم فاضل ہیں جو مولانا پر تنقید کر رہے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جامعہ ملیہ میں انھوں نے مالی اعتبار سے بڑی تکلیف کی زندگی بسر کی تھی۔ اس زمانے میں یہ تعلیمی ادارہ نہایت مشکل حالات سے دوچار تھا۔ پروفیسروں کی تنخواہیں دوسرے تعلیمی اداروں کی نسبت بہت کم تھیں اور وہ بھی باقاعدہ نہیں ملتی تھیں۔ کئی کئی مہینوں کے بعد تھوڑے سے پیسے ملتے تھے۔ ہندوستان کے ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے مہتمم تھے، ان کا حال بھی وہی تھا جو پروفیسروں اور معلموں کا تھا۔ بس ایک بات تھی کہ ڈاکٹر صاحب خاندانی اور ذاتی اعتبار سے آسودہ حال اور صاحب جائداد تھے۔ گھر سے پیسے منگوا لیتے تھے۔ اپنا خرچ بھی اس سے چلاتے اور پروفیسروں کو بھی عید بقرعید کے موقعے پر اس سے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔

سرور صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی بھی تعریف کرتے اور ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا دلچسپ الفاظ میں ذکر کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک دن انھوں نے بتایا کہ جب پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی، ایک روز ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا: ''پاکستان بن جائے گا، لیکن موجودہ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں یہ ہوگا کہ یوپی کے لوگ حکومت کریں گے اور پنجابی کلرکی کرے گا اور پھر وقت آئے گا کہ بنگالی سازش کریں گے''...... یہ بات سرور صاحب نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے بہت پہلے سنائی تھی۔ بلاشبہ ابتدا میں یہی ہوا تھا، لیاقت علی خاں صاحب نے اپنی پسند کے بعض علمائے کرام کو بھی یوپی سے درآمد کیا تھا۔ پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ سازش کے آثار کہاں سے ابھرے اور ان کا کیا نتیجہ نکلا۔

جس زمانے میں سرور صاحب جامعہ ملیہ میں پڑھاتے تھے، اس زمانے میں برصغیر کے مسلمانوں کے اس بہت بڑے تعلیمی ادارے کی مالی حالت دگرگوں تھی۔ اگرچہ بے شمار واقعات اس کی نشان دہی کرتے ہیں، لیکن میں یہاں ایک ایسا واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں، جو ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے اولین لائبریرین مولوی عبدالسلام مرحوم نے ایک دفعہ مجھے سنایا تھا۔

مولوی عبدالسلام بہت باخبر، تجربہ کار اور ماہر لائبریرین تھے۔ ان کا اردو اور انگریزی کا خط بے حد خوب صورت تھا اور لائبریری کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ آزادی سے قبل وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لائبریرین تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مسلم یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ایک رکن ڈاکٹر ذاکر حسین خاں بھی تھے جو جامعہ ملیہ کے مہتمم تھے۔ ایک مرتبہ مجلس انتظامیہ کے اجلاس میں یونیورسٹی کے سالانہ بجٹ پر بحث ہو رہی تھی۔ آئندہ سال کے لیے پچاس لاکھ روپے کا بجٹ پیش کیا گیا جو منظور کر لیا گیا۔ مولوی عبدالسلام کہتے ہیں، بجٹ کی منظوری کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں آئے اور مجھ سے فرمایا: کوئی نئی کتاب آئی ہے تو دکھایے۔ میں نے چند کتابیں دکھائیں۔ گفتگو کرتے ہوئے بولے: آپ کی یونیورسٹی نے آئندہ سال کے لیے پچاس لاکھ روپے کا بجٹ پاس کیا ہے۔ آپ یہ بتایے کہ پچاس لاکھ روپے ہوتے بھی ہیں یا یوں ہی کہہ دیا گیا ہے کہ آئندہ خرچ ہوں گے..... جامعہ ملیہ کا بجٹ تو کبھی چند ہزار روپے سے آگے نہیں بڑھا۔

پھر کہا: عبدالسلام صاحب! آپ نے کتابیں بہت سلیقے اور قرینے سے ترتیب دی ہیں۔ آپ میرے ساتھ دہلی چلیے اور جامعہ ملیہ کی لائبریری میں کام کیجیے، لیکن وہاں بجٹ نام کی کوئی شے نہیں ہوتی، اس لیے تنخواہ نہیں ملے گی۔ وہی کچھ ملے گا جو ہم لیتے ہیں اور اسی انداز سے ملے گا جس انداز سے ہمیں ملتا ہے۔

یہ تھی اس جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مالی حالت، جس کا افتتاح ۲۹۔اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مقابلے میں برصغیر کے ایک بڑے عالم مولانا محمود حسنؒ نے کیا تھا اور جس کے پہلے مہتمم اور وائس چانسلر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ پورے ملک میں اور ملک کے باہر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دھوم تھی، لیکن اس میں جو اہل علم تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، انھیں قوت لایموت بھی بڑی مشکل سے میسر آتی تھی۔ سرور صاحب اسی جامعہ میں پہلے تعلیم حاصل کرتے رہے اور پھر اسی میں طلبا کو تعلیم دینے پر مامور ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قناعت کا سبق جو انھیں عمر بھر یاد رہا، جامعہ ملیہ میں پہلے خود پڑھا، پھر طالب علموں کو پڑھایا اور پھر تمام عمر اس پر عامل رہے۔

جیسا کہ ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا، سرور صاحب سے میری پہلی ملاقات جنوری ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی۔ اس سے کچھ عرصے بعد ان سے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ ملاقاتوں کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔ جس زمانے میں وہ پاکستان کی وزارت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اطلاعات ونشریات کے محکمۂ مطبوعات کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کراچی میں مقیم تھے، اس زمانے میں انھوں نے دو کتابیں تصنیف کیں، ایک ''مولانا مودودی کی تحریک اسلامی'' اور دوسری ''تحریک اسلامی اور اسلامی دستور''۔ یہ دونوں کتابیں کراچی سے مجھے ''الاعتصام'' میں تبصرے کے لیے بھجوائیں۔ میں نے تبصرہ کیا تو شکریے کا خط لکھا۔ چند روز بعد لاہور آئے تو مجھے دفتر آکر ملے۔ مزید شکریہ ادا کیا اور مختلف مسائل سے متعلق گفتگو ہوئی۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا اور اس کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا۔

ان کتابوں میں سرور صاحب نے مولانا مودودی اور ان کی تحریک اسلامی کی نہ مخالفت کی ہے، نہ موافقت۔ بس واقعات وحقائق سے بحث کی ہے۔ علمی معاملات میں ان کی یہ ہی عادت تھی۔ واضح الفاظ میں کسی کی مخالفت یا موافقت نہیں کرتے تھے۔ جو نقطۂ نظر ان کے نزدیک صحیح ہوتا اسے دلائل کی روشنی میں بیان کر دیتے تھے۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بعض افکار ومسائل سے بہت سے اہل علم کی طرح انھیں اتفاق نہیں تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے متعدد مضامین میں کیا ہے۔ مسئلۂ ملکیت زمین کے سلسلے میں بالخصوص ان کی رائے مولانا مودودی سے بہت مختلف تھی اور اس کا اظہار انھوں نے ان مضامین میں کیا ہے جو ''آفاق'' میں اس موضوع پر شائع ہوتے رہے، لیکن اسلوب تحریر دھیما اور مثبت ہے۔ نہ کہیں طعن وتشنیع ہے، نہ تشدد وجارحیت! بس اپنی بات کی اور آگے نکل گئے۔

سرور صاحب سے ۱۹۵۰ء میں جو مراسم قائم ہوئے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں پختگی اور استحکام پیدا ہوتا گیا۔ جب محکمہ اطلاعات پنجاب کے ڈپٹی ڈائریکٹر مطبوعات مقرر ہوکر وہ کراچی سے لاہور آئے، اس زمانے میں ان کا دفتر ایبٹ روڈ پر تھا۔ اس دور میں ان کے دفتر میں یا کسی دوسری جگہ ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

اگست ۱۹۶۹ء میں وہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوگئے۔ ادارے کے ڈائریکٹر اس وقت شیخ محمد اکرام تھے، وہ سرور صاحب کی صلاحیتوں اور علمی سرگرمیوں سے آگاہ تھے، اسی لیے وہ انھیں ادارے میں لائے تھے۔ انھیں ''المعارف'' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں نہایت قریب سے ان کو دیکھنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ان کے معمولات اور اسلوب کار سے آگاہ ہونے کا موقع ملا۔

وہ بہت مستعد اہل علم اور باہمت صاحب قلم تھے۔ آٹھ سوا آٹھ بجے دفتر آجاتے اور پھر کام میں جت جاتے۔ محنت اور احتیاط سے رسالہ مرتب کرتے۔ تمام مضامین پڑھتے اور ان کی تصحیح کرتے۔ اداریے کے علاوہ ایک یا دو مضمون خود لکھتے اور کتابوں پر تبصرے کرتے۔ ''المعارف'' کے لیے بعض اوقات بعض عربی مضامین کے ترجمے بھی کرتے۔ پروف خوانی بھی خود ہی کرتے۔

المعارف کے ادارتی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے لیے ایک کتاب ''ارمغان شاہ ولی اللہ'' تالیف کی، جو اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے۔ اس میں مختلف مسائل سے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار و نظریات ضبط تحریر لائے گئے ہیں۔

سرور صاحب صبح دفتر آجاتے اور عام طور پر شام کو دفتر سے باہر نکلتے۔ شاید ہی کوئی دن ہوگا کہ شام سے پہلے یا چھٹی کے وقت دفتر سے گئے ہوں۔ اس زمانے میں وہ عربی رسائل و جرائد سے ''امروز'' کے سنڈے ایڈیشن کے لیے بھی عالم عرب کے سیاسی اور معاشرتی مسائل و کوائف سے متعلق مضمون لکھتے تھے۔

وہ چھٹی بہت کم کرتے تھے، روزانہ باقاعدہ دفتر آتے تھے۔ بغیر کسی ضروری کام اور علمی معاملے کے کسی کے کمرے میں نہیں جاتے تھے۔ ہم دونوں کے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ کام کرتے کرتے کچھ آرام کی ضرورت محسوس ہوتی تو ازراہِ کرم میرے پاس تشریف لے آتے یا مجھے بلا لیتے۔ چند منٹ ہلکی پھلکی باتیں یا لطیفے بازی ہوتی اور پھر کام میں مصروف ہو جاتے۔

وہ خود تو کم ہی لطیفہ سناتے تھے، مگر لطیفہ سننے کے شائق تھے۔ لطیفہ سن کر خوش ہوتے بارہا ایسا ہوا کہ میں نے ان کو کوئی لطیفہ سنایا یا کوئی ایسی بات، جو ان کے نزدیک کسی اہمیت کی حامل تھی، بتائی، تو چند روز بعد اسے دوبارہ سنانے کی فرمائش کی۔ یا ان کے مطلب کا کوئی شخص آجاتا تو خود بھی میرے حوالے سے اس کو وہ لطیفہ یا بات چند لفظوں میں سناتے اور پھر مجھے کہتے کہ آپ وہ ساری بات (یا پورا لطیفہ) انھیں سنایے۔

ان کی زبان میں کچھ لکنت تھی، اس لیے سناتے کم تھے اور سنتے زیادہ تھے۔ ہر شخص کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بات غور سے سنتے، اگر بات کا پہلے سے علم ہوتا، جب بھی اسے محسوس نہ کراتے اور اسی طرح سنتے جیسے پہلی دفعہ سن رہے ہوں۔

سرور صاحب خالص پنجابی تھے اور پنجابیت پر انھیں فخر تھا۔ لیکن گفتگو زیادہ تر اردو میں کرتے تھے، لہجہ بہت اچھا تھا۔ پنجابی بولتے عجیب سے لگتے تھے اور اس زبان سے ان کی اجنبیت کا سا احساس ہوتا تھا۔

وہ جب تک ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے منسلک رہے، میں نے ان کو دیکھا کہ بسکٹ، ڈبل روٹی، مکھن، چاے، چینی اور مالٹے وغیرہ کھانے پینے کی چیزیں اپنے کمرے میں رکھتے۔ برتن بھی اپنے گھر سے لائے تھے جو الماری میں پڑے رہتے، جو شخص ملنے کے لیے آتا، اسے خود چاے بنا کر پلاتے اور کھانے کی مختلف چیزیں پیش کرتے۔ عام طور پر دفتر کے کسی شخص کو چاے پر بلا لیتے۔ برتن خود صاف کرتے، دوسرے سے کام کرانے کے عادی نہ تھے۔ بعض دفعہ ہم دونوں کو دفتر سے کوئی ایسا کام مل جاتا تھا، جسے دفتری اوقات کے بعد ہم اکٹھے بیٹھ کر کرتے تھے۔ اس کا ہمیں دفتر کی طرف سے معاوضہ دیا جاتا تھا۔ روزانہ تین چار گھنٹے ہم اس کام میں مصروف رہتے۔ اس اثنا میں ایک یا دو مرتبہ چاے پیتے اور سرور صاحب خود چاے بناتے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ برتن صاف کروں، لیکن انھوں نے اس کا موقع نہیں دیا، خود ہی برتن صاف کیے۔

وہ سردیوں میں کوٹ پتلون پہنتے اور ٹائی لگاتے تھے۔ گرمیوں میں پتلون، بوشرٹ پہنتے تھے۔ شلوار قمیص بھی دفتر میں رکھتے تھے۔ دفتری اوقات کے بعد گرمیوں میں عام طور سے یہ ہی عوامی لباس پہنتے تھے۔

ان کا حلقۂ احباب اچھا خاصا تھا، جو شخص آتا، اس کے مزاج کے مطابق بات کرتے۔ چودھری علی محمد خادم ان کے پرانے دوست تھے۔ اس زمانے میں وہ لائل پور (حال فیصل آباد) کی تحصیل سمندری کے ایک حلقے سے پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ وہ اکثر ان سے ملاقات کو آتے تھے۔ وہ ''آفاق'' میں سرور صاحب کے رفیق کار رہے تھے۔ بڑے ملنسار اور شریف الطبع آدمی تھے۔ ان کے سیاسی اور نظریاتی افکار کچھ دوسری قسم کے تھے، لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلقات و مراسم کی راہ میں انھیں حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔

سرور صاحب بااصول اہل قلم اور باضمیر صاحب علم تھے۔ وہ ذاتی طور پر نہ کسی کے مخالف تھے نہ موافق! وہ ہی بات کرتے جو ان کے زاویۂ نگاہ کے مطابق قرین صحت ہوتی۔ اس سلسلے کا ایک عجیب واقعہ کلیم اختر مرحوم نے سنایا جو سرور صاحب کے بھانجے اور میرے مخلص دوست تھے۔

انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۴ء میں جب ایوب خاں اور فاطمہ جناح پاکستان کے صدارتی انتخاب میں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے تھے، ایک دن این اے رضوی صاحب جو اس وقت ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس تھے، سرور صاحب کے مکان پر شادماں کالونی پہنچے۔ کلیم اختر صاحب نے بتایا کہ وہ بھی وہاں موجود تھے۔ رضوی صاحب نے سرور صاحب سے کہا: ''میں آپ سے تنہائی میں ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' سرور صاحب نے جواب دیا: ''یہیں کر لیجیے۔'' پھر کلیم اختر کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''یہ میرے بھانجے ہیں، ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' رضوی صاحب نے کہا: ''آپ کو معلوم ہے کہ صدر ایوب اور فاطمہ جناح کے درمیان صدارتی مقابلہ ہو رہا ہے۔ مولانا مودودی، فاطمہ جناح کی حمایت کر رہے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ مولانا مودودی کے خلاف مضامین لکھیے۔''

سرور صاحب اس زمانے میں ادارۂ تحقیقات اسلامی سے منسلک تھے جس کے ڈائریکٹر ان دنوں ڈاکٹر فضل الرحمٰن تھے، وہ بعض باتوں میں سرور صاحب کے ہم نوا تھے یا یوں کہیے کہ بعض مسائل میں دونوں ایک ہی مذہب و مسلک کے حامل تھے۔ سرور صاحب کو مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے متعدد مسائل میں اختلاف تھا، جس کا انھوں نے اپنی کتابوں اور مضامین میں اظہار کیا ہے، لیکن این۔ اے رضوی کی یہ بات سن کر وہ طیش میں آگئے اور بولے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ سے یہ کس نے کہا میں مولانا مودودی کی ذات کے خلاف ہوں اور میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ جو کچھ وہ کہیں یا کریں، اس کی مخالفت کروں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ سے یہ کس نے کہا کہ میں کسی کے کہنے پر، کسی کی مخالفت یا موافقت میں مضمون لکھتا ہوں، اس میں میری سوچ کا عمل دخل نہیں ہوتا۔

تیسری بات یہ کہ آپ میری عادت اور طبیعت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کو مجھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے یہ کہنے کی کیسے جرأت ہوئی کہ میں کسی خاص مسئلے میں جو آپ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، مولانا مودودی کے خلاف لکھوں۔ اگر آپ نے اس لیے مجھے مضمون لکھنے کے لیے کہا ہے میں ادارۂ تحقیقات اسلامی میں ملازم ہوں، تو آج ہی اس سے مستعفی ہو جاتا ہوں۔

کلیم اختر مرحوم نے بتایا کہ یہ واقعہ ہے کہ اسی وقت انھوں نے استعفا بھیج دیا اور پھر ادارۂ تحقیقات اسلامی کے دفتر اسلام آباد نہیں گئے۔ یہ ان کی جرأت رندانہ کی انتہا تھی کہ اچھی خاصی ملازمت چھوڑ دی، لیکن اپنے ضمیر اور اصول کی قربانی نہیں دی اور سرکار دربار کی خواہش کے مطابق مولانا مودودی کے خلاف نہیں لکھا۔

اس سے کچھ عرصہ پیشتر ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ان کی علمی خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان سے ان کو تمغۂ امتیاز دینے کی سفارش کی تھی۔ ملازمت چھوڑ دینے اور صدر ایوب کے حق میں اور مولانا مودودی کی مخالفت میں مضمون نہ لکھنے کے باوجود حکومت نے ان کو تمغۂ امتیاز دیا۔

موت سے کئی سال پہلے وہ خان عبدالغفار خان کی سیاست سے شدید اختلاف کا اظہار کرنے لگے تھے اور ان سے مایوس ہو گئے تھے۔ صاف لفظوں میں کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ کچھ نہیں کر پائیں گے، موجودہ حالات میں ان کا سیاسی موقف غلط ہے۔ وہ ان کے سیاسی رجحانات کے بارے میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے، جس میں واقعاتی اعتبار سے ان کے افکار و نظریات کا تجزیہ کرنا مقصود تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ اس کام پر بالکل آمادہ تھے، مگر افسوس کہ موت نے اس کی مہلت نہ دی۔

ایک اہم کام ان کے پیش نظر علامہ اقبالؒ کے عمرانی اور دینی نقطہ نظر کی وضاحت کرنا تھا۔ جن خطوط پر وہ کام کرنے کے خواہاں تھے، اس کے نوٹس عام طور سے کلیم اختر صاحب کو لکھواتے رہتے تھے۔ افسوس کہ ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔

سید نذیر نیازی اور سرور صاحب دونوں جامعی تھے اور آپس میں جگری دوست۔ دونوں کا شمار جامعہ ملیہ کے ان اولین طلبا میں ہوتا تھا جو اس زمانے میں جامعہ میں داخل ہوئے تھے، جب علی گڑھ میں اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دونوں جامعہ میں پڑھاتے بھی رہے تھے۔ نذیر نیازی کٹر مسلم لیگی تھے اور سرور صاحب پکے نیشنلسٹ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دونوں کہیں اکٹھے ہو جاتے تو کسی نہ کسی مختلف فیہ سیاسی مسئلے پر بحث و تکرار کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو اکثر اوقات جھگڑے کی شکل اختیار کر لیتا۔ سرور صاحب جذبات میں آ جاتے اور غصے میں اپنا بُرا حال کر لیتے۔ نذیر نیازی ٹھنڈی طبیعت کے مالک تھے اور لطیفے باز! وہ لطیفوں اور چٹکلوں سے کام لیتے جس سے سرور صاحب کا پارہ اور چڑھ جاتا۔ خیال ہوتا کہ زبان و بیان کی یہ معصوم سی لڑائی ابھی ہاتھوں کی خوف ناک لڑائی میں بدل جائے گی اور چھوٹے قد کے دبلے پتلے سیالکوٹیے نذیر نیازی کو کلے ٹھلے اور ڈیل ڈول والا سرور گجراتیہ گھٹنوں کے نیچے دبا لے گا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کو ''پورا موا'' نہ کیا تو ''ادھ موا'' ضرور کر دیا جائے گا۔ اس موقعے پر کلیم اختر یا دونوں کے مشترکہ دوستوں میں سے جو صاحب موجود ہوتے، وہ فرشتۂ رحمت کی صورت میں سامنے آتے اور گفتگو کا موضوع بدل کر دونوں کو دوسری باتوں میں لگا دیتے۔

سرور صاحب پیدائشی طور پر دیہاتی تھے اور ان کا میٹرک پاس کرنے تک کا زمانہ گاؤں کی کھلی فضاؤں میں گزرا تھا۔ میٹرک کے بعد طالب علمی کے زمانے میں بھی، تدریس کے زمانے میں بھی، صحافت اور تصنیف و تالیف کے زمانے میں بھی وہ برصغیر کے کئی مشہور اور بڑے شہروں میں رہے، مگر ان کے دل میں گاؤں کی محبت بہ دستور قائم رہی اور اپنی ابتدائی دیہاتی زندگی پر ہمیشہ فخر کا اظہار کرتے رہے۔ ان کا دل بھی دیہات کی فضاؤں کی طرح کھلا تھا۔ اگر کوئی دیہاتی طالب علم (اس کا تعلق سکول سے یا کالج سے ہوتا یا یونیورسٹی سے ہوتا) سرور صاحب کے پاس آ جاتا اور تعلیم کے سلسلے میں ان سے کوئی مشورہ لیتا تو وہ نہایت خوش ہوتے، اس کی حوصلہ افزائی کرتے، اس کے مضامین کے بارے میں پوچھتے، اساتذہ کے متعلق دریافت کرتے اور اس کو مفید مشوروں سے نوازتے۔ اسے تلقین کرتے کہ شہری لڑکوں سے دب کر نہ رہے، محنت میں، بات چیت میں، پڑھائی میں، اساتذہ کے ادب و احترام میں، لباس کی صفائی میں، رہن سہن میں ان سے آگے رہے اور کسی سلسلے میں ان سے مرعوب نہ ہو، بلکہ ان کو مرعوب کرے۔

وہ غریب اور نادار طالب علموں کی اپنی حیثیت کے مطابق مالی مدد کرتے اور ان کی کوشش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی کہ کسی کو اس کا پتا نہ چلے۔ اس سے طالب علم کا وقار مجروح ہوگا اور وہ اپنے اندر خاص قسم کی کمزوری اور کمتری محسوس کرے گا۔ چپکے سے کسی طالب علم کو نقد روپے دے دیتے، کسی کی فیس ادا کر دیتے، کسی کو کتابیں خرید دیتے اور کسی کو کپڑے لے دیتے۔ ضلع گجرات کے بعض دیہات کے طالب علم ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ طالب علموں کو تاکید کرتے کہ نصابی کتابوں کے علاوہ اس موضوع کی کتابوں کا مطالعہ ضرور جاری رکھیں، جس سے انھیں ذہنی طور پر دلچسپی ہے۔

بعض دفعہ وہ عجیب باتیں سنایا کرتے تھے جو انھوں نے کسی بزرگ سے سنی ہوتی تھیں۔ ایک دن ایک بزرگ کے حوالے سے بتایا کہ ایک شخص نے حکیم نورالدین سے (جو مرزا غلام احمد قادیانی کی موت کے بعد ان کے خلفیہ مقرر کیے گئے تھے) پوچھا کہ آپ نے مرزا صاحب کی کتابیں پڑھی ہیں؟ انھوں نے مرزا صاحب کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں، بولے: ''میں تصنیف پڑھنے کے بجائے مصنف کو پڑھتا ہوں''۔ یہ بات مرزا صاحب کے علم میں آئی تو وہ صاف لفظوں میں تو حکیم صاحب سے اپنی کتابوں کے مطالعے کے لیے نہیں کہہ سکتے تھے، البتہ ایک دن حکیم صاحب سے کہا کہ میری کتابوں میں کتابت وغیرہ کی بعض غلطیاں رہ جاتی ہیں، آپ انھیں پڑھ کر درست کر دیا کریں تاکہ آئندہ اشاعت میں غلطی باقی نہ رہے۔

سرور صاحب تصویر کھنچوانے کے عادی نہیں تھے، اگر انھیں اس کے لیے کہا جاتا تو طرح دے جاتے اور بچنے کی کوشش کرتے۔

جامعہ ملیہ میں طالب علمی کے زمانے میں بھی اور معلمی کے دور میں بھی وہ پاجامہ، قمیص اور شیروانی پہنتے تھے، اس لیے کہ وہاں کا لباس یہ ہی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں بھی کچھ عرصہ ان کا یہی لباس رہا، لیکن اس کے بعد یہ لباس انھوں نے ترک کر دیا تھا۔

کئی سال پہلے ان کے سر کے بال جھڑنا شروع ہو گئے تھے۔ زندگی کے آخری دور میں چند بال رہ گئے تھے اور وہ بھی چاندی کی طرح سفید...... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ان میں کالا بال ایک بھی نہ تھا۔

سرور صاحب عربی کے عالم، فارسی سے آشنا، انگریزی سے باخبر، اردو کے انشا پرداز۔ معلم، مصنف، مترجم، صحافی، حکمت شاہ ولی اللہؒ کے ترجمان، فلسفہ مولانا عبید اللہ سندھی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شارح، اچھے دوست، ہمدرد، خیرخواہ، درد دل رکھنے والے، محنتی، باہمت، ایثار پیشہ، دکھ سکھ کے ساجھی تھے۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ ان میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ جذباتی اور زودرنج تھے۔ بعض اوقات چھوٹی سی بات پر خفا ہوجاتے۔ ایسا بھی ہوا کہ سرے سے کوئی معاملہ ہی نہیں ہے، لیکن سرور صاحب نے خود ہی ذہن میں ایسا تانا بانا سا بنایا، ایک بات دل میں بٹھائی اور غصے سے بھر گئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس شخص سے خفا ہیں، اس کے فرشتوں کو بھی کسی ایسے معاملے کا پتا نہیں جو سرور صاحب کی خفگی کا باعث بنا۔ نہ اسے یہ معلوم ہے کہ سرور صاحب اس سے خفا ہیں۔ بس سرور صاحب نے کسی مفروضے کے تحت ایسا موڈ بنالیا، جس سے پتا چلا کہ حضرت خفا ہوئے بیٹھے ہیں۔

مولانا حنیف ندوی کے وہ بہت مداح بلکہ معتقد تھے۔ ایک دن مولانا نے مجھ سے کہا: معلوم ہوتا ہے، سرور صاحب مجھ سے خفا ہیں۔

میں نے عرض کیا: کیوں خفا ہیں؟

بولے: میں نے ان کے بارے میں خود ان سے یا کسی اور سے کچھ نہیں کہا، معلوم نہیں کیوں خفا ہیں۔

میں نے پوچھا: آپ کو ان کی خفگی کا کیسے پتا چلا؟

کہا: کل ایک مشترکہ دوست کے مکان پر ہم پانچ چھ دوست بیٹھے تھے، جن میں سرور صاحب بھی تھے، دو ڈھائی گھنٹے مجلس رہی، جس میں ہر موضوع کی باتیں ہوئیں، لیکن تمام وقت سرور صاحب مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہے۔ میں نے دو تین مرتبہ ان سے مخاطب ہونے کی کوشش کی، مگر سرور صاحب میری طرف ملتفت نہیں ہوئے۔

چند روز کے بعد ایک دوست نے بتایا کہ سرور صاحب واقعی مولانا سے خفا تھے، اور خفگی کا باعث محض ایک ذہنی مفروضہ تھا جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں تھا۔ اسی دوست نے جب سرور صاحب سے کہا کہ جو بات آپ نے مولانا کے متعلق دل میں بٹھا رکھی ہے، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، تو ان کا غصہ رفع ہوگیا اور پہلے کی طرح مولانا سے اظہار عقیدت ومحبت کرنے لگے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خود مجھے ایک دفعہ اپنے متعلق سرور صاحب کے طرزِ عمل سے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے خفا ہیں۔ میں چاہتا تھا، کسی وقت ان سے بات کروں اور ناراضی کی وجہ پوچھوں۔ اس وقت ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے ان کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔

میرا عام معمول یہ تھا کہ دو ڈھائی بجے دفتر سے نکلتا اور چیرنگ کراس تک (کم وبیش ایک میل) پیدل جاتا، چیرنگ کراس سے ویگن پر سوار ہو جاتا، جو سانده میں میرے گھر کے قریب اتار دیتی تھی۔ اسی معمول کے مطابق ایک دن دفتر سے نکلا اور لارنس گارڈن سے آگے چڑیا گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ سامنے سرور صاحب آ رہے ہیں۔ سوچا یہیں کھڑے کھڑے ان سے چند باتیں کریں گے، لیکن ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچے تو نہ میں نے ان کو سلام کیا اور نہ انھوں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ چپ چاپ دونوں اس طرح ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے، جیسے آپس میں کوئی جان پہچان ہی نہیں ہے۔ یہ واقعہ تو ہو گیا، لیکن میں نے اسی وقت اپنے آپ کو ملامت کی کہ سرور صاحب کو سلام کیوں نہیں کیا۔ وہ مجھ سے بڑے ہیں، میرا فرض تھا، میں ان کو سلام کرتا۔ انھوں نے ممکن ہے مجھے دیکھا نہ ہو، اگر دیکھا ہوتا تو پہلے کی طرح سلام میں سبقت کرتے۔

اسی سوچ میں پندرہ بیس قدم آگے نکل گیا۔ پھر فوراً رکا، پیچھے گردن موڑ کر دیکھا تو سرور صاحب پچیس تیس قدم کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ میں نے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ تیز تیز چلتے تھے، میں نے بھی یہی رفتار اختیار کر لی اور ہم دونوں کے درمیان جو پچیس تیس قدم کا فاصلہ تھا، اسے برقرار رکھا۔ وہ لارنس گارڈن میں داخل ہوئے اور قائداعظم لائبریری کے سامنے سے ہوتے ہوئے اس گیٹ کی طرف رخ کیا جو لارنس روڈ اور ریس کورس روڈ کے چوک کے قریب ہے۔ آج کل اس گیٹ کے سامنے مرکز اہل حدیث کے نام سے لاہور میں اہل حدیث کی بہت بڑی جامع مسجد ہے۔ اس زمانے میں سرور صاحب شادماں کالونی میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ریس کورس روڈ سے انھوں نے جیل روڈ کا چوک عبور کیا اور کچھ دور آگے جا کر اپنے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ میں چند منٹ کے لیے پیچھے رک گیا، خیال کیا کہ وہ پانچ دس منٹ آرام کر لیں تو دستک دوں گا، اس سے پہلے بھی ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دفعہ ان کے مکان پر گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجائی تو وہ باہر آئے اور ہم دونوں نے ایک دم السلام علیکم کہا اور سلام میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ حسبِ عادت دونوں ہاتھوں سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اندر لے گئے۔ پہلے پانی پلایا، پھر پُر تکلف چائے پلائی۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کیں۔ دفتر کے حالات پوچھے، مولانا حنیف ندوی کے بارے میں دریافت کیا، میرے کام کے متعلق پوچھا۔ نہایت خوش ہوئے اور ملاقات کے لیے حاضر ہونے پر شکریہ ادا کیا۔ کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے، لیکن ہم نے ایک دوسرے کو بالکل یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ تھوڑی دیر پہلے مال روڈ پر ہم ایک دوسرے کے قریب سے گزرے تھے۔ انھوں نے صرف یہ بتایا کہ چند منٹ پہلے آیا ہوں۔ ''امروز'' میں شرق اوسط کے حالات سے متعلق ایک مضمون دینے گیا تھا، جس کا عربی کے ایک رسالے سے ترجمہ کیا تھا۔

اس کے بعد وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ جہاں ملاقات ہوئی بہت اچھی طرح ملے اور شفقت و مہربانی کے جذبات کا اظہار کیا۔

وہ چوں کہ جذباتی اور زود رنج تھے اور تھوڑی سی بات پر طیش میں آجاتے تھے، اس لیے کہیں زیادہ عرصہ جم کر ملازمت نہ کرسکے۔ کسی نے کوئی بات کی، فوراً غصے میں آگئے اور استعفا داغ دیا۔ اس کا نام غالباً انھوں نے اصول رکھا تھا۔ حالاں کہ اس کا نام اصول نہیں، محض غصہ اور بے مقصد ناراضی ہے۔

بعض مسائل میں ان کے افکار و تصورات بہت سے اہل علم سے جداگانہ تھے۔ ان کے اظہار کے لیے انھوں نے متعدد مقامات پر مولانا عبیداللہ سندھی کا سہارا لیا ہے اور اپنے دل کی باتیں ان کی طرف منسوب کر کے بیان کی ہیں۔ پنجابی لوگ گیت کے مطابق

روندی یاراں نوں لے لے ناں بھراواں دے

جامعہ ملیہ میں انھوں نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، ان سب کے نام معلوم نہ ہوسکے۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی کہ اس طرف توجہ نہ کی اور ان سے ان کے اساتذہ کے بارے میں دریافت نہ کیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے خود ہی عربی ادب و لغت کے مشہور عالم و ماہر مولانا محمد سورتی کا نام لیا کہ وہ جامعہ میں ان کے استاد تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے، ان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم وفضل اور ورع وتقویٰ کی وجہ سے تمام اساتذہ وطلبا ان کا احترام کرتے تھے۔ سرور صاحب نے بتایا کہ وہ نماز باجماعت کا بہت اہتمام کرتے تھے اور سب کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ طلبا کے ٹخنے دیکھتے رہتے، جس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا اس کے ٹخنے پر ڈنڈا مارتے۔ میں نے اس بے احتیاطی میں کئی دفعہ ان سے ڈنڈے کھائے۔ طلبا پر ان کا بڑا رعب تھا، کسی کو ان کے سامنے بولنے کی جرأت نہ تھی۔ میں محنت کرتا اور غور سے پڑھتا تھا، اس لیے مجھ پر شفقت بھی بہت فرماتے تھے۔

سرور صاحب زیادہ تر پیدل چلتے تھے، گھر سے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) پیدل آتے اور پیدل ہی دفتر سے گھر جاتے تھے۔

چلتے وقت وہ تیز تیز قدم اٹھاتے تھے، آہستہ چلنے کی عادت نہ تھی۔ آخر تک ان کی عام صحت بہت اچھی رہی۔ اس کی بڑی وجہ میرے خیال میں ان کی جفاکشی، محنت اور پیدل چلنا تھا۔ بیمار وہ بہت کم ہوتے تھے۔ سگریٹ، پان، تمباکو کے بالکل عادی نہ تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے اور رہن سہن بہت اچھا تھا، لیکن تکلف کسی معاملے میں نہ کرتے تھے۔

برصغیر پاک وہند کے بعض اہل علم اور سیاسی رہنماؤں کے وہ بہت مداح بلکہ عقیدت مند تھے۔ ان کے افکار ونظریات سے متعلق اگر علمی انداز میں کوئی بات ہوتی تو تحمل سے سنتے اور اعتراض کا متانت سے جواب دیتے، بلکہ بعض مسائل میں ان سے اظہار اختلاف بھی کرتے، لیکن اگر کوئی شخص ان رہنماؤں کی نیت پر حملہ کرتا اور سخت الفاظ میں ان کو ہدف تنقید ٹھہراتا تو برداشت نہ کر پاتے، سختی کا جواب سختی سے دیتے اور اس موقعے پر اکثر جذباتی ہو جاتے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے وہ بہ درجہ غایت مداح تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار ونظریات کو پھیلانے اور عام کرنے میں انھوں نے بڑی جاں فشانی سے کام لیا، لیکن سنجیدگی سے نجی مجلسوں میں ان کے بعض تصورات سے اختلاف کا اظہار بھی کرتے اور علمی رنگ میں دوسرے کی اختلافی گفتگو بھی پوری توجہ سے سنتے۔ ہم بعض اوقات ازراہِ مزاح کہا کرتے تھے کہ آپ نے مولانا سندھی کے افکار کی جس نہج سے ترجمانی کی ہے، شاید اس نہج سے وہ خود بھی نہ کر پاتے۔ اسی طرح مولانا سندھی نے جس اسلوب میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ صاحب کے بعض افکار کی وضاحت کی ہے، اس سے خود شاہ صاحب بھی شاید آگاہ نہ ہوں گے۔ سرور صاحب ہماری اس قسم کی باتیں خوش ہو کر سنتے اور ہنس پڑتے۔

سرور صاحب مالی اعتبار سے کمزور تھے اور یہ کمزوری ہمیشہ ان کی رفیق حیات رہی اور زندگی بھر کندھے سے کندھا ملا کر ان کے ساتھ چلتی رہی۔ لیکن وہ دل کے سخی تھے اور ہاتھ کھلا تھا۔ آخر عمر میں ان کی حالت اس لیے بہتر ہو گئی تھی کہ لڑکے کماتے اور کاروبار کرتے تھے۔ لاہور کے علاقے ٹاؤن شپ میں اپنا مکان بھی بنا لیا تھا۔

ملک کے بعض سیاسی اور اقتصادی معاملات میں وہ یاس اور قنوط کا شکار تھے۔ اگر ان سے اختلاف کیا جاتا تو کہتے: نہیں صاحب! ایسا نہیں ہوگا'' (اپنے مخاطب کو اثنائے گفتگو میں وہ عام طور پر ''صاحب'' کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ ''ہاں صاحب'' ''نہیں صاحب'') ان کے قنوط کی وجہ سے ایک دن میں نے ان سے کہا، سرور صاحب! آپ تو قنوط کا اظہار کرتے کرتے ''دعائے قنوت'' ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد میری موجودگی میں کسی بے تکلف دوست سے کسی معاملے میں قنوط کا اظہار کرتے تو کہتے: ''اسحاق صاحب مجھے پھر دعائے قنوت کہیں گے، لیکن صاحب! بات وہی صحیح ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ آپ کی بات کبھی عملی شکل اختیار نہیں کرے گی۔''

سرور صاحب کی زندگی کی آخری سرکاری ملازمت ایک سرکاری ماہنامے ''الزکوٰۃ'' کی ادارت تھی، جس کے فرائض ادارت وہ کچھ عرصے سے سرانجام دے رہے تھے۔ یہ رسالہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ''المعارف'' کے مبادلے میں نہیں آتا تھا۔ میں نے ان کو خط لکھا کہ معلوم ہوتا ہے، آج کل آپ بہت امیر ہو گئے ہیں، جن لوگوں پر زکوٰۃ فرض ہے وہ بڑی مشکل سے سال میں ایک مرتبہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، لیکن آپ ہر مہینے ''زکوٰۃ'' نکالتے ہیں۔ معلوم نہیں کون کون لوگ آپ کی ''زکوٰۃ'' سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ یقیناً آپ کی مرتب کردہ فہرست میں امیر اور غیر مستحق لوگ بھی شامل ہوں گے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم آپ کی زکوٰۃ کے مستحق ہیں اور اس کے باوجود محروم ہیں۔ کیا اس ماہانہ زکوٰۃ سے ہمیں کچھ حصہ ملے گا؟ اس کے بعد انھوں نے ''الزکوٰۃ'' کے انچارج جناب کلیم اختر کو لاہور خط لکھا اور انھوں نے اس کے تمام گزشتہ شمارے مجھے دستی بھجوا دیے اور آئندہ کے لیے رسالہ باقاعدہ ''المعارف'' کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مبادلے میں جاری کر دیا گیا۔

اس رسالے کی ادارت کے سلسلے میں سرور صاحب اسلام آباد میں مقیم تھے اور کبھی کبھی لاہور آتے تھے۔ ایک دوست نے بتایا کہ ان کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر وہ ان سے ملاقات کے لیے اسلام آباد گئے، چھٹی کا دن تھا۔ سرور صاحب نے تہبند باندھا ہوا تھا اور کپڑے دھو رہے تھے۔ پوچھا: یہ کیا؟ کہا: اپنا کام خود ہی کرنا چاہیے۔

سرور صاحب تقریباً اسی (۸۰) برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے، لیکن صحت اتنی اچھی تھی کہ ساٹھ برس سے زیادہ عمر کے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کام میں تیزی اور مستعدی آخر وقت تک قائم رہی۔

جی چاہتا ہے کہ سرور صاحب کے دو مکتوب بھی یہاں درج کر دیے جائیں جو انھوں نے مارچ ۱۹۸۳ء میں مجھے اسلام آباد سے لکھے تھے۔ اس وقت وہ حکومت پاکستان کے ماہنامے ''الزکوٰۃ'' کے ایڈیٹر تھے۔

میں نے مارچ ۱۹۸۳ء میں ہندوستان کے اس زمانے کے صدر گیانی ذیل سنگھ پر ایک مضمون لکھا تھا جو روزنامہ ''مشرق'' کے دو شماروں میں چھپا تھا۔ اس کا پہلا حصہ اس دن شائع ہوا تھا، جس دن صدر پاکستان ضیاء الحق غیر وابستہ ممالک کی کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی جا رہے تھے۔ دوسرا حصہ اس سے ایک ہفتہ بعد معرضِ اشاعت میں آیا تھا۔

یہ مضمون اگرچہ مختصر تھا، تاہم لوگوں نے اسے پڑھا اور پسند کیا۔ میں نے اس میں فرید کوٹ کی ایک مسجد کا ذکر کیا تھا جو مہاراجا فرید کوٹ نے قبضے میں کر لی تھی اور پھر اسے میونسپل کمیٹی کا دفتر بنا دیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں ریاستی پرجامنڈل کی تحریک شروع ہوئی تو ریاستی حکام سے مصالحت کی جو شرائط پرجامنڈل کی طرف سے پیش کی گئی تھیں، اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مسجد مسلمانوں کو واپس کی جائے۔ یہ شرط پیش کرنے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ ریاستی پرجامنڈل کے سکھ ارکان بھی تھے، جن میں گیانی ذیل سنگھ کا نام بھی آتا ہے۔ سرور صاحب نے اپنے مکتوب میں جس مسجد کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ ہی مسجد مراد ہے۔

یہ مضمون سرور صاحب نے پڑھا تو از راہ کرم اسے پسند کیا اور ۱۲۔ مارچ ۱۹۸۳ء کو مجھے خط لکھا، میں نے ان کے خط کے جواب میں شکریے کا خط لکھا اور ساتھ ہی تحریر کیا کہ اس سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے ۱۹۵۷ء میں آپ نے مجھے کراچی سے ایک خط لکھا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ اس پر انھوں نے دوسرے خط میں لکھا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میرے خطوں کی اس قدر تکریم کرتے ہیں تو میں اب دفتر کے دفتر آپ کے نام لکھ چکا ہوتا۔ سرور صاحب کا ایک خاص انداز فکر تھا، جس کی روشنی میں وہ بعض مسائل کو زیر غور لاتے تھے۔ ان کے خطوط میں اس انداز فکر کی کچھ جھلک موجود ہے۔

گیانی ذیل سنگھ پر میرا تفصیلی اور طویل مضمون سرور صاحب کی وفات سے چار سال بعد ستمبر ۱۹۸۷ء کے ''قومی ڈائجسٹ'' میں چھپا تھا۔ اس کے بعد کچھ اضافوں کے ساتھ میری کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں شائع ہوا۔ اب سرور صاحب کے مکتوبات ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے ۱۲۔ مارچ ۱۹۸۳ء کا مکتوب۔ پھر ۱۶۔ مارچ ۱۹۸۳ء کا۔

نیشنل پریس ٹرسٹ
پوسٹ بکس ۱۲۶۶
اسلام آباد

مکرمی ومحترمی جناب مولانا اسحاق صاحب زاد لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل صبح میں لاہور میں تھا اور آج صبح اسلام آباد سے خط لکھ رہا ہوں۔

کل لاہور میں گیانی ذیل سنگھ پر آپ کا مضمون ''مشرق'' میں پڑھا۔ موضوع تو میرے لیے دلچسپ تھا ہی، آپ نے جس انداز سے لکھا ہے، وہ بے حد قابل تعریف ہے۔ میں نے اسے پڑھا۔ اپنے پاس اسے سنبھال کر رکھا اور مجبور ہوا کہ آپ کو یہ خط لکھوں...... شریک محفل اور محفل کا ذکر اس قدر معروضی پیرائے میں......! پاکستان میں یہ وصف ناپید ہے۔...... اور بھٹی صاحب! یہ دین ہے قوم پرستی کی۔ صحیح معنوں کی قوم پرستی کی۔

آپ کا مضمون پڑھ کر دل بہت خوش ہوا، اور گزری ہوئی زندگی کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہ معاشرہ کتنا ترقی کرتا، جہاں سکھ مسلمانوں کو مسجد واپس کرتے تھے۔ زمانے کے انقلاب نے ہم سب کو وحشی بنا دیا۔ اب آپ کا مضمون پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ ہم کبھی انسان بھی تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کے دوسرے حصہٗ مضمون کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوں۔

اسلام آباد میں کچھ ہفتے رہنا پڑے گا۔ لاہور لوٹا تو حاضر ہوں گا۔ مولانا حنیف صاحب کو بہت بہت سلام۔ ڈار صاحب کو تسلیمات۔

آپ کا

محمد سرور

۱۲۔۳۔۸۳

اب میرے نام سرور صاحب کا دوسرا خط ملاحظہ فرمایئے۔

مکرمی و محترمی جناب بھٹی صاحب زاد لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

محبت نامہ ملا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میرے خطوں کی یوں تکریم کرتے ہیں تو میں اب تک دفتر کے دفتر لکھ چکا ہوتا۔ میں نے آپ کا مضمون پڑھا، برسوں کی زندگی کی یاد تازہ ہوگئی اور بہت جلدی میں خط لکھ دیا...... میری جوانی قاہرہ میں اور قوم پرست ادب پڑھتے گزری۔ حالات کسی اور رخ چل دیے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ چالیس سال تک ایک سرزمین سے محبت کروں اور پھر میرا دین، ایمان بن جائے۔ اس اذیت میں پچھلے ۳۵ برس گزرے ہیں۔ مجھے پنجاب سے محبت ہے اور اس لحاظ سے بڑا متعصب پنجابی ہوں، لیکن کل کو کہا جائے کہ تو گجراتی ہے، پنجاب سے تمھیں کیا، یہ کیسے ممکن ہے۔

الزکوۃ لاہور سے ڈسپیچ (Dispatch) ہوتا ہے۔ آج لاہور آفس کے سربراہ کلیم اختر صاحب کو خط لکھ رہا ہوں۔ ان سے درخواست کر رہا ہوں کہ آپ کو ایک تو پچھلے پرچے پیش کریں۔ دوسرے تازہ پرچہ بھجوانے کا انتظام کریں۔ کبھی فرصت ہو تو ان سے مل لیں۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کا دفتر ہائی کورٹ کے سامنے الائیڈ پریس کے اوپر ہے۔ فون نمبر ۵۲۰۱۶

قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام۔ لاہور آیا تو حاضری دوں گا۔ ڈار صاحب کو سلام۔

آپ کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد سرور

۱۶-۳-۸۳

نیشنل پریس ٹرسٹ

پوسٹ بکس ۱۲۶۶

اسلام آباد

سرور صاحب کے ایک صاحب زادے ابوظہبی میں تھے۔ ستمبر ۱۹۸۳ء میں وہ بیٹے سے ملاقات کے لیے ابوظہبی گئے۔ ۱۹۔ ستمبر کو رات کے کھانے پر وہ ہندوستان کے سفیر متعینہ ابوظہبی کے ہاں مدعو تھے۔ کھانے کے بعد دیر تک وہاں بیٹھے مختلف حضرات سے باتیں کرتے رہے۔ بیماری یا تکلیف کے قطعاً کوئی آثار نہ تھے۔ واپس گھر آئے تو آدھی رات کے قریب دل کا دورہ پڑا۔ اسی وقت ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا لیکن زندگی کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ یہ ۱۹ اور ۲۰۔ ستمبر ۱۹۸۳ء کی درمیانی شب تھی۔ ۲۱۔ ستمبر کو لاہور کے اخبارات میں ان کی وفات کی خبر پڑھی تو نہایت افسوس ہوا اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۳ء تک تینتیس برس میں پھیلی ہوئی بہت سی یادیں لوح ذہن پر ابھر آئیں۔

۲۲۔ ستمبر کی صبح کو ان کی میت لاہور پہنچی۔ اخبارات میں دوپہر کے بعد نماز جنازہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ ان کا مکان ٹاؤن شپ میں ہے، نہ میں جانتا تھا، نہ مولانا حنیف ندوی۔ ہم پریشان تھے کہ جنازے میں کس طرح شرکت کریں۔ اتنے میں ہمارے دوست جناب انور مہدی صاحب گاڑی لے کر ہمارے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ پہنچ گئے۔ ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور سرور صاحب کے مکان پر لے گئے۔ وہاں ہر حلقے کے بہت سے دوست احباب موجود تھے۔ ان کے کئی عزیزوں نے مجھ سے بغل گیر ہو کر اظہار افسوس کیا اور روتے ہوئے کہا......

آپ سے وہ بہت تعلق رکھتے تھے۔

۲۲۔ ستمبر؛ ان کا جنازہ اٹھنے سے پہلے سخت دھوپ اور شدید حبس تھا، جوں ہی جنازہ اٹھا آسمان پر بادل چھا گئے، اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ قبرستان کے قریب پہنچے تو ہلکی سی بارش شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ادھر میت کو لحد میں اتار دیا گیا اور قبر پر مٹی ڈال دی گئی اور ادھر بارش بند ہو گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرحوم نے ۱۸۔ مارچ ۱۹۸۳ء کو اسلام آباد سے مجھے آخری خط لکھا، جس میں وعدہ کیا کہ اب لاہور آیا تو ملاقات کے لیے ضرور تمھارے دفتر آؤں گا، لیکن یہ وعدہ اس طرح ایفا ہوا کہ ۲۲۔ ستمبر ۱۹۸۳ء کو ابوظہبی سے ان کی میت لاہور آئی اور میں ان کے جنازے میں شریک ہوا۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه

نمازہ جنازہ میں بہت سے حضرات نے شرکت کی، جن میں ان کے دوست، متعدد صحافی اور اصحاب علم موجود تھے۔

تجہیز وتکفین سے فارغ ہو کر میں اور مولانا محمد حنیف ندوی اپنے دوست حکیم محمد شریف جگرانوی مرحوم کے ساتھ واپس آئے۔

سرور صاحب اس عالم فانی سے رخصت ہو چکے، دنیا کے مال ومتاع کی کوئی چیز ان کے ساتھ نہیں گئی، وہ اس جہاں آب وگل سے اسی طرح خالی گئے ہیں، جس طرح ماں کے پیٹ سے خالی ہاتھ آئے تھے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق جو بات صحیح ہے، وہ یہ ہے کہ صرف ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے ہیں اور اللہ کے دربار میں اعمال ہی کی اصل قدر وقیمت ہے۔ ان کی عادات واطوار کی جو جھلک میں نے دیکھی ہے اور ان کے جو خصائل وخصائص میرے محدود علم میں آئے ہیں، ان کے مطابق ہم عاجز بندے امید رکھتے ہیں کہ بارگاہِ ایزدی سے ان کی مغفرت کی نوید انھیں سنادی گئی ہوگی۔

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

(وفات ۲۴۔مئی ۱۹۸۵ء)

۱۹۶۹ء کے مئی کا مہینا تھا اور دن کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا کہ ایک صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لائے اور سب سے پہلے مولانا محمد حنیف ندوی کے کمرے میں آئے۔ حسن اتفاق سے میں وہیں بیٹھا تھا۔ لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف مرحوم ان کے ساتھ تھے۔ شیخ صاحب نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا! ''یہ ہیں مولانا سعید احمد اکبر آبادی......!''

مولانا حنیف ندوی یہ الفاظ سنتے ہی کھڑے ہوگئے۔ میں بھی جلدی سے اٹھا اور ان سے مصافحہ کیا۔

رفقائے ادارہ میں سے شاہ محمد جعفر پھلواروی اور رئیس احمد جعفری کو اطلاع دی گئی، وہ بھی آگئے اور یہ حضرات ان سے باتیں کرتے رہے۔ میں خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو میں نے پڑھا تو تھا لیکن ان کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق آج پہلی دفعہ ہوا۔ پورا قد، متناسب جسم، نہ فربہ نہ دھان پان، گندمی سا رنگ، سر پر قراقلی ٹوپی، پاجامہ، کرتہ اور ٹھنڈی شیروانی زیب تن، معتدل داڑھی سیاہ اور سفید بالوں کا خوب صورت مجموعہ۔ گفتگو کا انداز دھیما۔ بات چیت میں توازن کا غلبہ اور لہجے میں اعتدال کی فراوانی۔

اس سے دو سال قبل ۱۹۶۷ء میں مولانا محمد حنیف ندوی کی کتاب ''عقلیات ابن تیمیہ'' شائع ہوئی تھی جو تبصرے کے لیے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو بھیجی گئی تھی۔ انھوں نے اپنے ماہانہ مجلّے ''برہان'' میں اس پر تبصرہ کیا تھا۔ مولانا ندوی کو اس تبصرے کے بعض پہلوؤں سے متعلق مولانا اکبر آبادی سے دوستانہ شکوہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا اکبر آبادی نے یا تو کتاب اچھی طرح پڑھی نہیں یا ایک علمی موضوع کے بارے میں معاصرانہ چشمک سے کام لیا ہے یا پھر اس لیے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا کہ وہ ان کے حلقے سے تعلق نہیں رکھتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کا ذکر مولانا ندوی اپنی محفل احباب میں کئی دفعہ کر چکے تھے۔ اب مولانا اکبر آبادی تشریف لائے تو خیر و عافیت کے بعد مولانا ندوی نے اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ مولانا ندوی کا انداز گفتگو قدرے تیز بلکہ ''جارحانہ'' تھا۔ مولانا اکبر آبادی کا اسلوب کلام ان کے مقابلے میں نرم بلکہ کہنا چاہیے کہ ''مدافعانہ'' تھا۔ وہ تقریباً پون گھنٹا ادارے میں رہے۔ اس اثنا میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی تصنیفی واشاعتی سرگرمیوں کے بارے میں چند باتیں پوچھیں، اور رفقائے ادارہ نے ندوۃ المصنفین، ہندوستان کے دیگر علمی و تحقیقی اداروں اور بعض اشخاص سے متعلق ان سے دریافت کیا۔ اور وہ تشریف لے گئے۔

اس سے کوئی پانچ سال بعد وہ ڈاکٹر اسرار احمد کی دعوت پر انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام منعقدہ قرآنی محاضرات میں شریک ہوئے۔ اس موقعے پر میں بھی مدعو تھا اور مجھے ''برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث، عہد تابعین میں'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرنا تھا۔ اب پہلی مرتبہ ان سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔ اس وقت میری کتاب سلسلۂ ''فقہائے ہند'' کی چند جلدیں چھپ چکی تھیں اور ان کے مطالعے میں آچکی تھیں۔ ان کے بارے میں مجھ سے بعض باتیں پوچھیں، کچھ مشورے دیے اور برصغیر کے علما و فقہا کے متعلق گفتگو ہوئی۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں وہ پھر پاکستان آئے۔ اب کی مرتبہ قاضی اطہر مبارک پوری اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ فارسی کے صدر ڈاکٹر نذیر احمد بھی ان کے ساتھ تھے۔ ۲۲۔ مارچ کو یہ تینوں حضرات ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لائے، لیکن اس دن میری طبیعت ناساز تھی اور میں دفتر نہیں جا سکا تھا۔ دوسرے حضرات بھی دفتر سے جا چکے تھے۔ یہ تینوں بزرگ مجلسِ ترقی ادب کے ڈائریکٹر جناب احمد ندیم قاسمی سے ملے اور میرا ذکر کیا۔ اتفاق سے قاسمی صاحب کے پاس اس وقت جناب میرزا ادیب صاحب تشریف فرما تھے۔ میرے گھر سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ان کا مکان ہے اور ایک دوسرے کے ہاں ہماری آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ قاسمی صاحب نے میرزا ادیب صاحب کی معرفت مجھے پیغام پہنچایا کہ ہندوستان کے یہ اہل علم بزرگ پنجاب گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہیں اور تمھیں ملنا چاہتے ہیں۔ میں شام کو وہاں پہنچا تو یہ حضرات موجود نہیں تھے، کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھوڑی دیر بعد آئے تو نہایت تپاک سے ملے اور ایسے معلوم ہوا کہ ہم میں سے کسی کے درمیان کوئی ذہنی فاصلہ نہیں ہے اور سب ایک ہی نقطہ فکر کے حامل ہیں۔

قاضی اطہر مبارک پوری ہندوستان کے ممتاز سکالر اور عربی اور اردو دونوں زبانوں کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ اگست ۱۹۸۴ء میں ان کو عربی زبان کی خدمت کے سلسلے میں صدر ہندوستان کی طرف سے صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں بھی یہ لاہور آئے تھے اور مولانا عطاء اللہ حنیف کے ہاں گئے تھے تو مجھے بھی یاد فرمایا تھا اور میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور قاضی اطہر مبارک پوری سے پہلے سے آشنائی تھی۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی بعض کتابیں اور ان کے کچھ مضامین ومقالات تو ہندوستان کے بعض رسائل وجرائد میں پڑھے تھے، لیکن ان سے ملاقات پہلی دفعہ ہوئی۔

قاضی اطہر مبارک پوری نے اس ملاقات میں عربی زبان کی اپنی تصنیف شدہ چند کتابیں ازراہ نوازش مجھے عطا فرمائیں۔

میں شام کو ساڑھے چھ بجے ان سے ملا تھا، شب کے گیارہ بجے تک ان کی مجلس میں رہا۔ اس اثنا میں بہت سی باتیں ہوئیں اور پاکستان اور ہندوستان کے مختلف اداروں اور افراد کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔

یہ تینوں حضرات حکومت پاکستان کی دعوت پر آئے تھے اور اسلام آباد کی ایک سرکاری تقریب میں شرکت کے بعد وارد لاہور ہوئے تھے۔ یہ رات انھوں نے حکومت کے مہمان کی حیثیت سے پنجاب گیسٹ ہاؤس میں بسر کی۔ دوسرے دن ۲۴۔ مارچ کو علی الصبح قاضی اطہر مبارک پوری اور ڈاکٹر نذیر احمد تو اپنے وطن ہندوستان تشریف لے گئے، لیکن مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ڈاکٹر اسرار احمد کے منعقد کردہ محاضرات قرآنی میں شرکت کرنا تھی، اس لیے وہ یہیں رہے۔

۲۵۔ مارچ ۱۹۸۴ء کو نماز عصر کے بعد حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف نے دارالدعوۃ السّلفیہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو چائے کی دعوت دی۔ ان کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا معراج الحق بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا حافظ عبدالرشید ارشد، (ریٹائرڈ جسٹس) ڈاکٹر منیر احمد مغل (جنھوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا عبیداللہ سندھی کی تفسیر ''المقام المحمود'' سورہ بقرہ تک انگریزی میں ایڈٹ کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے) ڈاکٹر پروفیسر خواجہ حمید یزدانی (سابق استاد شعبہ فارسی گورنمنٹ کالج لاہور) مولانا عبدالخالق قدوسی مرحوم اور بعض دیگر حضرات شامل تھے۔

اس موقعے پر حافظ عبدالرشید ارشد نے مولانا اکبر آبادی کی خدمت میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ ''الہلال'' کا ایک سیٹ پیش کیا جو کچھ عرصہ قبل انھوں نے شائع کیا تھا۔ (یہ سیٹ الہلال کے ۱۹۱۲ء تک کے شماروں پر مشتمل ہے) نیز انھوں نے تفسیر المقام المحمود بھی ان کی نذر کی۔ مولانا عطاء اللہ حنیف نے بھی مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا معراج الحق صاحب کی خدمت میں مکتبہ سلفیہ کی بعض مطبوعات پیش فرمائیں۔

یہ دلچسپ مجلس دوڈھائی گھنٹے جاری رہی......

اسی دن (یعنی ۲۵۔ مارچ سے ۲۸۔ مارچ ۱۹۸۴ء تک جناح ہال لاہور میں انجمن خدام القرآن کی طرف سے) ڈاکٹر اسرار احمد نے محاضرات قرآنی کا اہتمام کیا تھا، اس کی صدارت کے فرائض مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے انجام دیے۔ ۲۷۔ مارچ کی شب کو خود مولانا اکبر آبادی کی تقریر تھی۔ تقریر کا موضوع تھا ''مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت و کردار اور ان کے علمی و عملی کارنامے''۔ تقریر سے پہلے میں نے ان سے کہا بڑا عجیب موضوع آپ کو دیا گیا ہے۔ وہ مسکرائے اور کہا، ''اچھا جو خدا کو منظور!''

ہال میں کرسیوں کا انتظام تھا اور تقریر سے پہلے ہی ان پر سامعین نے قبضہ جمالیا تھا۔ نیچے فرش پر بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ سٹیج بھی حاضرین سے بھر گیا تھا۔ گیلری بھی پُر تھی اور ہال اچھی خاصی وسعت کے باوجود اپنی تنگ دامانی پر نالاں تھا۔ برآمدے میں بھی لوگ کھڑے تھے اور باہر بھی جہاں تک لاؤڈ سپیکر کی آواز پہنچ سکتی تھی، لوگ موجود تھے۔ میرے خیال میں جناح ہال نے اتنا بڑا مجمع کبھی نہیں دیکھا ہوگا، جتنا آج مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تقریر میں دیکھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے انھوں نے کئی واقعات بیان کیے۔ طرزِ ادا نہایت دلچسپ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اندازِ کلام انتہائی دلکش۔ میں نے ان کی تقریر پہلی مرتبہ سنی تھی اور ان کے قریب ہی سٹیج پر بیٹھا تھا۔ ہم پاکستانیوں کے نقطہ نظر سے موضوع بہت نازک تھا اور اس بنا پر اور بھی نازک تھا کہ مقرر مولانا آزاد کے مداح بلکہ معتقد تھے اور ہندوستانی باشندے تھے۔ فاضل مقرر کو داد دینی چاہیے (اور تقریر کے بعد میں نے داد دی) کہ نہ کہیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا، نہ کسی موقعے پر فرطِ عقیدت نے زبان کو حدِ اعتدال سے باہر نکلنے دیا اور نہ تقریر کی روانی میں فرق آیا۔ یہ ان کا کمال تھا جس سے سامعین بے حد متاثر ہوئے۔ تقریر ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی اور لوگوں نے بڑے اطمینان اور دلجمعی سے سنی۔

انجمن خدام القرآن کے اربابِ انتظام نے اسے مقرر کی آواز میں ٹیپ کر لیا تھا، لیکن میں اس سہولت سے محروم تھا، اس لیے جیسے جیسے فاضل مقرر کے الفاظ ان کی زبان سے نکل کر میرے پردۂ سماع سے ٹکراتے گئے، میں انھیں اپنے خزانۂ ذہن میں محفوظ کرتا گیا اور پھر چند روز کے بعد قلم و قرطاس کی گرفت میں لے آیا۔

میں نے کوشش کی ہے کہ بیانِ واقعات میں روایت باللفظ کی پابندی کروں، لیکن ممکن ہے اتنی طویل تقریر کے تمام الفاظ ذہن میں نہ رہے ہوں اور اس میں روایت بالمعنی کی آمیزش ہوگئی ہو۔ اگر ایسا ہوگیا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ علم اصولِ حدیث کی رو سے روایت بالمعنی کو بھی درجہ قبولیت حاصل ہے۔

آیئے اب آپ کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تقریر سناتے ہیں۔ انھوں نے مولانا آزاد کے متعدد واقعات بیان کیے۔

مولانا اکبر آبادی نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا: مولانا ابوالکلام آزاد کے ذکر سے مجھے عزیز لکھنوی کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد انھوں نے فرمایا:

۱۔ مولانا آزاد کے بارے میں کچھ باتیں تو وہ ہیں جو میرے سامنے ہوئیں اور میں نے ان سے سنیں اور کچھ وہ ہیں جو اپنے بزرگوں اور اکابر علما سے معلوم ہوئیں۔ ۱۹۳۶ء میں میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور پھر کسی نہ کسی صورت میں یہ سلسلہ ان کی وفات (۲۲۔فروری ۱۹۵۸ء) تک جاری رہا۔ وہ انتہا درجے کے جینئس اور نابغہ شخصیت تھے۔ ذہانت وفطانت، حفظ واتقان اور علم وادراک میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔مختلف موضوع کی کتابوں پر انھیں اس قدر عبور واستحضار تھا کہ وہ صحیح معنوں میں چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ انھوں نے تعلیم کہاں حاصل کی؟ کس عالم سے کیا پڑھا؟ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہ خود انھوں نے اس کی وضاحت فرمائی اور نہ کبھی کسی نے ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔

۲۔ ان کے والد مولوی خیر الدین کلکتہ اور اس کے قرب وجوار کے بہت بڑے پیر اور صاحبِ طریقت تھے۔ بڑے بڑے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، جن میں سیٹھ اور دولت مند لوگ بھی تھے اور قدیم وجدید کے ماہر علما بھی۔ معلوم ہوتا ہے مولوی خیر الدین مرحوم نے انھی میں سے جو شخص جس علم کا ماہر تھا، اسے بیٹے کی تعلیم پر مقرر کر دیا تھا۔

۳۔ مولانا کو شروع ہی سے پیری مریدی کے اس انداز سے جوان کے گھر میں رائج تھا، نفرت تھی اور وہ اس سے بغاوت کا اظہار کرتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد انھوں نے اس سلسلے کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن چوں کہ وہ پیرزادہ اور صاحب زادہ تھے اور ان کا گھر روحانی فیض حاصل کرنے والوں کا مرجع تھا، اس لیے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کے انکار کے باوجود لوگوں نے ان سے اپنے گھر میں یہ سلسلہ جاری رکھنے پر بہت زیادہ اصرار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہفتے میں دو دن جمعرات اور ہفتے کو آجایا کرو، میں درس قرآن دیا کروں گا اور مسائل بتایا کروں گا۔ لیکن روپے پیسے یا نذرانہ قبول نہیں کروں گا۔

یہ سلسلہ کچھ عرصہ چلا، پھر بند کر دیا۔

۴۔ مولانا بہت زیادہ ذہین، اونچے مرتبے کے عالم اور بلند پایہ مصنف ومقرر تھے۔ اگر اپنے باپ کا سلسلۂ مشیخت جاری رکھتے تو اس میں نہایت کامیاب رہتے۔ مگر یہ ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افتادِ طبع کے خلاف تھا۔

۵۔ آزادیٔ وطن سے ٹھیک دو ماہ بعد ۱۵۔اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مولانا آزاد نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو لنچ پر بلایا۔ میں ان حضرات سے چھوٹا تھا، مجھے نہیں بلایا گیا تھا، لیکن میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ میں اس قسم کی دعوتوں میں ان کے ساتھ نتھی ہو جاتا تھا۔ (یہ الفاظ مولانا اکبر آبادی نے مسکراتے ہوئے فرمائے) کھانے کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ میں دو باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ ہم قیام پاکستان کے مخالف تھے اور ہمارے نزدیک نیک نیتی سے یہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسائل اور ان کی مشکلات کا صحیح حل نہ تھا۔ لیکن اب پاکستان بن گیا ہے۔ ہمیں پاکستان اور تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں کی مخالفت میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔ بلکہ نہایت اخلاص کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو، پاکستان اور وہاں کے مسلمانوں کی مدد کرنی چاہیے اور دعا کرنی چاہیے کہ پاکستان قائم اور مستحکم رہے۔ اگر خدانخواستہ پاکستان کو کوئی نقصان پہنچا تو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے مسلمان کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کوئی علیحدہ تنظیم نہیں بنانی چاہیے۔ برادران وطن کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے زور دے کر کہا، لیکن یہ یاد رکھیے کہ اپنے مذہب اور تہذیب وثقافت کی حفاظت ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ مولانا نے اس موقعے پر دائیں ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے کہا: ''اس پر کوئی کمپرومائز نہیں ہو سکتا۔'' (مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی زبان سے یہ الفاظ بیان کرتے ہوئے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور کہا، ''مولانا نے یوں کیا'')

۶۔ جب مجھے مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنایا گیا۔ (اس منصب پر ان کو مولانا آزاد نے فائز کیا تھا) تو شیخ الحدیث کی مسند جمعیت علمائے ہند کے مشہور عالم مولانا عبدالحلیم صدیقی کے سپرد ہوئی تھی۔ اس کے لیے ان سے تین سال کا معاہدہ ہوا تھا۔ یہ مدت ختم ہوئی تو میں نے ان کو علیحدہ کر دیا۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی عربی کے بہت بڑے ادیب تھے، لیکن علمِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حدیث میں زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے۔ میں علم حدیث کے کسی ماہر عالم کو اس منصب پر لانا چاہتا تھا اور میرے نزدیک مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اس کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ میں اس اثنا میں دہلی آیا۔ مولانا کو پتا چلا تو ایک دن اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اجمل خاں صاحب سے مجھے ٹیلی فون کرایا کہ میں کل صبح نو بجے پارلیمنٹ ہاؤس میں مولانا سے ملوں۔ میں وہاں پہنچا تو وہ ٹھیک نو بجے تشریف لائے۔ پہلے خیر و عافیت پوچھی۔ پھر فرمایا:

''مجھے معلوم ہوا ہے، آپ نے مولوی عبدالحلیم صدیقی کو ملازمت سے الگ کر دیا ہے۔''

میں نے کہا: ''جی ہاں......!''

فرمایا: ''کیوں؟''

عرض کیا: ''وہ عربی ادبیات اور دیگر علوم میں تو درک رکھتے ہیں، لیکن علم حدیث میں انھیں مہارت حاصل نہیں ہے۔ شیخ الحدیث کا منصب بہت بڑا منصب ہے، میں اس منصب پر کسی ایسے شخص کو لانا چاہتا ہوں جو علم حدیث کا ماہر ہو۔''

فرمایا: ''علم حدیث میں مہارت سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

عرض کیا: ''علم حدیث کے بہت سے شعبے ہیں۔ علم رجال، اقسام حدیث، راویوں کے بارے میں معلومات وغیرہ۔''

مولانا نے میری بات سنی تو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر تقریر شروع کر دی۔ رمضان کا مہینا تھا، گرمیوں کے دن تھے اور مولانا روزے سے تھے۔ حدیث، رجال حدیث، رواۃ حدیث، اقسام حدیث، کتب حدیث، شروح حدیث، تدوین حدیث اور ہندوستان میں علم حدیث کی آمد اور ترویج و اشاعت پر ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل تقریر کی، جب کہ سامع میں اکیلا تھا۔ تقریر میں ایسے ایسے نکات بیان کیے جو نہ میرے علم میں تھے اور نہ کبھی سنے تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو فرمایا: ''مولوی عبدالحلیم کو اپنی جگہ پر رہنے دیجیے۔ اب آپ کو کوئی انور شاہ تو ملے گا نہیں۔ انھی کو شیخ الحدیث ماننا اور انھی سے کام لینا ہوگا۔''

میں اجازت لے کر آنے لگا تو فرمایا: ''میری بات آپ کو یاد رہے گی؟''

میں نے کہا: ''صاحب، کیا میں آپ کا فرمان بھول کر آپ سے دشمنی کروں گا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر دو دفعہ فرمایا: ''اللہ آپ کو جزائے خیر دے! اللہ آپ کو جزائے خیر دے!''

۷۔ مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی بے پناہ ذہانت اور کتابوں پر عبور و استحضار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۲۱ء میں مجلس خلافت کی جو کانفرنس آگرہ میں مولانا آزاد کے زیر صدارت ہوئی تھی، میں اس میں شریک نہیں تھا۔ مولانا نے اس میں ''خلافت اور جزیرۃ العرب'' کے موضوع پر زبانی خطبہ دیا تھا جو چھپ چکا ہے۔ وہ خطبہ اس قدر عالمانہ اور محققانہ تھا کہ جو علمائے کرام اس میں موجود تھے، وہ مولانا کے خطبے سے انتہائی حیران اور متعجب تھے کہ یہ شخص کس قدر روانی سے عربی کی عبارتوں کی عبارتیں پڑھ رہا ہے اور باقاعدہ کتابوں کے حوالے دے رہا ہے۔ لوگ انھیں چلتا پھرتا کتب خانہ قرار دیتے تھے۔

۸۔ مولانا آزاد، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم سے بہت متاثر تھے اور ان کی تمام کتابیں مولانا کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ مولانا کی وفات کے بعد حکومت ہند نے آزاد بھون کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے، مولانا کا کتب خانہ ان میں منتقل ہو گیا ہے، اس میں ہر موضوع کی کتابیں موجود ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، ان پر جابجا ان کے حواشی ہیں۔ حکومت ہند نے ایک محکمہ قائم کر کے ایک صاحب علم کو اس کام پر مقرر کیا ہے کہ وہ مولانا کے حواشی جمع کریں۔ یہ کام ہو رہا ہے۔

(مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کے حواشی کا ذکر ۲۷۔ مارچ ۱۹۸۴ء کو کیا تھا۔ اس کے جلد ہی بعد یہ حواشی مرتب ہو گئے تھے اور ''حواشی ابوالکلام آزاد'' کے نام کتابی شکل میں چھپ گئے تھے۔ یہ کتاب سید مسیح الحسن نے ترتیب دی تھی جو ہندوستان میں چھپی تھی۔ پھر پاکستان میں مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور کی طرف سے یہ کتاب شائع ہوئی۔ نہایت دلچسپ اور پر از معلومات کتاب ہے، ہر پڑھے لکھے شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے)

۹۔ مولانا نہایت خود دار تھے اور وقار سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان پر انتہائی مالی پریشانی کا دور بھی آیا، لیکن وہ اس کا کسی سے اظہار نہ کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد لکھ رہے تھے، اس زمانے میں ان کے کاتب منشی عبدالقیوم تھے جو کان پور کے رہنے والے تھے اور چھ سات مہینے تفسیر کی کتابت کے سلسلے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا کے پاس رہے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمارے پاس ''برہان'' میں آ گئے تھے اور اس کی کتابت کرتے تھے۔ وہ ان کی زندگی کے عجیب وغریب واقعات سنایا کرتے تھے۔ مثلاً منشی عبدالقیوم نے بتایا کہ مولانا کلکتہ کے علاقہ بالی گنج میں ایک دومنزلہ کوٹھی میں رہتے تھے اور اس کا پانچ سو روپے ماہانہ کرایہ تھا۔ مولانا کی مالی حالت اس زمانے میں اتنی کمزور تھی کہ انھیں مجبوراً کوٹھی کا نیچے کا حصہ کرائے پر دینا پڑا۔ اس دور میں ان پر ایسا وقت بھی آیا کہ غربت کی وجہ سے بعض اوقات ان کا چولہا نہ جلتا تھا۔ ان کے ملازم کا نام احمد تھا۔ وہ احمد کو ایک چونی دیتے اور آہستہ سے کہتے، دو روٹیاں اور دال لے آؤ۔ مولانا اور ان کی بیوی ایک ایک روٹی دال کے ساتھ کھا کر گزارا کرتے تھے۔

اسی دوران میں ایک دن مولانا سے ملاقات کے لیے گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو ان کے گھر آئے۔ مولانا کا ایک ہی جوڑا تھا جو وہ پہنتے تھے۔ کھدر کی قمیص مونڈھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ مولانا کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو پھٹی ہوئی قمیص کو چھپانے کے لیے چادر اوڑھ لی۔ اسی حالت میں بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہے۔ انھیں معلوم تھا کہ مولانا تنگ دستی کے عالم میں ہیں۔ انھوں نے اس کا کچھ اشارہ کیا تو فرمایا:

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

۱۰۔ مولانا کسی کے خلاف کوئی بات نہ کہتے تھے۔ ان کا ایک خاص موقف تھا، جس کا وہ کھل کر اظہار کرتے تھے۔ لیکن کسی کی مخالفت کرنا یا کسی کے بارے میں حرفِ شکایت زبان پر لانا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ (مولانا اکبر آبادی نے بتایا) قلعہ احمد نگر سے رہائی سے کچھ عرصہ بعد وہ دہلی سے الہ آباد جا رہے تھے۔ ان کی ٹرین علی گڑھ پہنچی تو مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے ریلوے اسٹیشن پر ان کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور نہایت نازیبا حرکات کیں۔ پنڈت سندر داس کو پتا چلا تو وہ الہ آباد میں ان کی قیام گاہ پر آئے اور اس حادثے پر اظہارِ افسوس کیا۔ مولانا نے مسکرا کر فرمایا:

''پنڈت جی! یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے۔'' طلبا ہمارے بچے ہیں اور بچے والدین سے کچھ کہیں تو انھیں اس کا حق پہنچتا ہے۔ آئندہ ہمیں انھی سے کام لینا ہے، ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی باتیں سننی اور برداشت کرنی چاہییں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو ایک بات مجھے بھی یاد آئی۔ کئی سال ہوئے ہندوستان کے ایک صاحب جو مسلمان تھے، لاہور آئے اور ہمارے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی تشریف لائے۔ مجھ سے ان کی ملاقات ہوئی تو اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ وہ ہندوستان کے محکمۂ تعلیم میں اچھے خاصے منصب پر فائز تھے۔ انھوں نے بتایا کہ آزادی سے کچھ عرصے بعد وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ ایک دن کسی محکمانہ کام کے سلسلے میں مولانا آزاد کی خدمت میں گئے۔ مولانا وزیر تعلیم تھے۔ محکمے کے چند افسر وہاں موجود تھے۔ مولانا نے میری طرف دیکھا تو فرمایا:

"آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

"ان کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی مجھے پسینے چھوٹنے لگے۔ اس لیے کہ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر جن طلبا نے مولانا کے خلاف مظاہرہ کیا تھا، میں ان میں موجود تھا۔ اور اب کئی سال بعد ان کے ماتحت تھا اور انھوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ لیکن یہ بات مولانا نے یہیں ختم کر دی اور میرے ساتھ ہمیشہ شفقت کا برتاؤ کرتے رہے۔

۱۱۔ مولانا اکبر آبادی نے فرمایا کہ آزادی کے بعد مولانا آزاد نے ہندوستان کے تعلیمی، ثقافتی، تہذیبی اور تصنیفی اداروں کی حفاظت کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور حکومت کی طرف سے انھیں گراں قدر مالی امداد دلائی۔ مثلاً دائرۃ المعارف حیدر آباد (دکن)، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور بعض دیگر اداروں کا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی اور ثقافتی مراکز ہیں، حفظ وبقا مولانا آزاد ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے ان کے لیے لاکھوں روپے کی ماہانہ اور سالانہ امداد منظور کرائی جو ان اداروں کو باقاعدہ حکومت ہند کی طرف سے مل رہی ہے۔

۱۲۔ مولانا آزاد سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے تعلق خاطر کے بارے میں مولانا اکبر آبادی نے بتایا کہ شیخ الہند ان کے بہت مداح تھے اور ان کی تحریریں ذوق وشوق سے سنتے اور پڑھتے تھے۔ وہ "الہلال" کے منتظر رہتے، جونہی الہلال آتا، پڑھنا یا سننا شروع کر دیتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اول سے آخر تک تمام مضامین کا مطالعہ کرتے۔

۱۳۔ مسجد کان پور کے سلسلے میں مولانا آزاد نے الہلال میں مدلل اور زوردار مقالے لکھے تھے، جن سے انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک خاص جوش اور جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ انھی دنوں یوپی کا انگریز گورنر جیمس مسٹن دارالعلوم دیوبند گیا۔ مولانا آزاد بھی وہاں پہنچ گئے، لیکن مولانا کو دروازے پر روک دیا گیا۔ دارالعلوم کے احاطے میں داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ گورنر دارالعلوم کے اندر وہاں کے علما اور اصحاب انتظام سے گفتگو کر رہا تھا اور مولانا باہر کھڑے تھے۔ شیخ الہند ان دنوں بیمار تھے اور گھر میں تھے۔ وہ دارالعلوم میں گورنر کی آمد کے خلاف تھے۔ انھیں مولانا آزاد کی تشریف آوری کا پتا چلا تو آدمی بھیج کر مولانا کو گھر پر بلایا۔ نہایت احترام سے پیش آئے اور فرمایا: میں نہیں چاہتا تھا کہ گورنر کو دارالعلوم میں آنے کی دعوت دی جائے۔ یہ میری مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ انھوں نے مولانا کو دعا دی اور ان کی تعریف کی۔ فرمایا: مجھے افسوس ہوا کہ آپ کو دارالعلوم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔

دوران گفتگو میں مولانا آزاد نے شیخ الہند سے پوچھا: آپ میری اور الہلال کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا: اس لیے کہ آپ نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے اور الہلال میں جرأت مندی کے ساتھ وہ موقف اختیار کیا ہے جو کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔

۱۴۔ مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی بیعت اور ان کو امام الہند بنانے کا واقعہ بھی بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے اکثر علما جن میں اہل حدیث اور دیوبندی حضرات شامل تھے، مولانا کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور انھیں امام الہند بنانا چاہتے تھے۔ لیکن دیوبند کے مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور ہمارے استاد مولانا انور شاہ اس کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک اختلاف کی چند وجوہ تھیں۔

ایک یہ کہ مولانا آزاد اگرچہ بہت بڑے عالم، ذہین اور تحریر وتقریر میں بے مثال ہیں، لیکن کسی دارالعلوم کے باقاعدہ سند یافتہ نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ نوجوان ہیں اور ان کے مقابلے میں بہت سے بزرگ علما اس ملک میں موجود ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسری یہ کہ مولانا علم و فضل کے باوجود اتقا اور پرہیزگاری میں اس مقام پر نہیں ہیں، جس کا یہ منصب تقاضا کرتا ہے۔

چوتھی وجہ وہ حضرات یہ بیان کرتے تھے کہ جن امور کے نفاذ کے لیے بیعت کرنے اور امام الہند بنانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، انھیں اس ملک میں نافذ کون کرے گا؟ اس کے لیے قوت تنفیذ یہ کا پایا جانا ضروری ہے جو موجودہ دور غلامی میں ممکن نہیں۔

۱۵۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کہا کہ مولانا آزاد کسی مسئلے کو زیر بحث لاتے تو اس کے تمام گوشوں کی وضاحت کرتے اور اپنے موقف کی تائید میں ایسے ایسے دلائل بیان فرماتے کہ کوئی اس کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ انھوں نے مولانا محمد میاں مراد آبادی کے حوالے سے بتایا کہ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کا مولانا آزاد کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ جوش خدا کو نہیں مانتے تھے (اور بقول مولانا اکبر آبادی) ''عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اس سلسلے میں ان سے کم درجے کے نہ تھے''۔ ایک دن یہ دونوں مولانا آزاد کے مکان پر ان کے پاس بیٹھے تھے کہ مولانا نے ان سے کہا: میرا آپ سے بہت عرصے سے تعلق ہے۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا جواب تک نہیں کہی۔ یہ زندگی کا آخری دور ہے۔ میں چاہتا ہوں، اب یہ فرض ادا کردوں۔

انھوں نے پوچھا: ایسی کون سی بات ہے؟

فرمایا: میں خدا کے وجود کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، کل نو بجے یہاں آجایے۔

مولانا عبدالرزاق نے اسی شام مسجد فتح پوری میں آکر اپنے حلقۂ احباب میں اس کا ذکر کیا تو مولانا محمد میاں مرحوم اور مولوی قاضی سجاد حسین نے جو اس وقت مدرسہ اسلامیہ فتح پوری دہلی میں مدرس تھے، کہا کہ یہ بہت اچھا موقع ہے، کیا ہمیں بھی اس مجلس میں شرکت کی اجازت ہوگی؟

ان حضرات نے مولانا کے سیکرٹری سے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ بڑے شوق سے آپ بھی آجایے۔ اور بھی جو لوگ آنا چاہیں، آجائیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔

چناں چہ دوسرے دن وقت مقررہ پر مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی، جوش ملیح آبادی، مولانا محمد میاں اور قاضی سجاد حسین مولانا کے مکان پر پہنچ گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا اکبر آبادی نے کہا کہ مجھے مولانا محمد میاں نے بتایا کہ مولانا آزاد نے وجود باری پر تقریر شروع کی اور تمام دلائل قرآن سے دیے۔ لیکن نہ کہیں قرآن کا نام لیا، نہ کوئی آیت پڑھی اور نہ کسی حدیث کا حوالہ دیا۔ اس طرح عقلی انداز میں دلائل پیش کیے کہ ہر بات دل میں اترتی گئی۔ سننے والے ہم چار آدمی تھے اور مولانا کے اثر آفرین اسلوب کلام اور طرز بیان پر حیران تھے۔ اس قسم کی باتیں نہ ہمیں سوجھی تھیں اور نہ کبھی سنی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید، مذہب کی ضرورت اور تمام مذاہب میں اسلام کی حقانیت پر مولانا نے مسلسل دو گھنٹے تقریر کی۔ تقریر ختم کر چکے تو فرمایا۔

میرے بھائی......! میں اپنا فرض ادا کر چکا۔ اب کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو......!

مولوی عبدالرزاق نے کہا، مولانا......! میں آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ میرا پہلا نقطۂ نظر غلط تھا۔ میں اللہ کو مانتا ہوں اور اپنے پچھلے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگتا ہوں۔

جوش ملیح آبادی نے کہا: مولانا میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا، لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ خدا ہے۔

(یہ تو تھی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی روایت جو انھوں نے مولانا محمد میاں مراد آبادی کے حوالے سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بارے میں بیان کی...... لیکن بہت عرصہ ہوا میں نے کہیں اس ضمن میں جو واقعہ پڑھا تھا اس میں مولانا عبدالرزاق کا نام نہیں تھا۔ جوش ملیح آبادی کا نام بھی نہیں تھا، صرف یہ الفاظ مرقوم تھے کہ ایک مشہور شاعر سے مولانا نے کہا کہ کل میں آپ کو خدا کے وجود کے بارے میں بات کروں گا۔ یہ الفاظ بھی نہیں تھے کہ جوش نے مولانا سے کہا کہ میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا، لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ خدا ہے...... تاہم ''مشہور شاعر'' سے مراد جوش ملیح آبادی ہیں۔

اب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بارے میں سنیے۔ ان کا شمار مولانا آزاد کے قدیم رفقا اور معتقدین میں ہوتا ہے۔ کلکتہ میں مولانا نے دارالارشاد کے نام سے جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا منتظم انہی کو بنایا گیا تھا۔ عربی کے آدمی تھے اور بہت باخبر عالم تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ امام ابن عبدالبر کی مشہور عربی کتاب ''العلم والعلماء'' کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام ابن تیمیہ کی بعض کتابوں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا۔۱۹۲۳ء میں مولانا آزاد نے کلکتہ سے ''الجامعہ'' کے نام سے جو ہفت روزہ عربی رسالہ جاری کیا تھا اس کے ایڈیٹر یہی عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ آزادی کے بعد مولانا آزاد نے وزارت تعلیم کی طرف سے ''ثقافتہ الہند'' کے نام سے عربی میں جو ماہانہ رسالہ دہلی سے جاری کیا تھا، اس کے ایڈیٹر بھی یہ ہی تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس رسالے کے ایڈیٹر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ہوئے جو دہلی یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے چیئرمین تھے اور میرے دوستوں میں سے تھے ۲۰۰۵ء میں وفات پا گئے ہیں۔ مولانا آزاد کی وفات کے بعد مولانا عبدالرزاق نے مولانا کے حالات میں دو تین کتابیں لکھیں۔

میرے خیال میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام سے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی یا مولانا محمد میاں کو سہو ہو گیا ہے۔ منکر خدا وہ نہیں تھے، کوئی اور صاحب ہوں گے)

۱۶۔ مولانا اکبر آبادی نے تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پنڈت سندر داس نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی نے ایک مرتبہ ان سے کہا تھا کہ مولانا آزاد بہت بڑے عالم وفاضل ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے۔ ہم ان کے مشوروں کے محتاج رہتے ہیں۔ ملکی معاملات میں ان کی رائے کو آخری رائے سمجھا جاتا ہے اور کانگرس کے اکثر فیصلے مولانا آزاد کی رائے کے مطابق ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں روحانیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس مولوی حسین احمد مجھے ملتے ہیں تو ان میں ایک روحانی کشش محسوس کرتا ہوں (مولانا اکبر آبادی نے ''مولوی حسین احمد'' ہی کہا تھا۔ ممکن ہے گاندھی جی نے اسی طرح کہا ہو، اور پھر اسی طرح مولانا اکبر آبادی نے بیان کر دیا)۔

پنڈت سندر داس کی یہ بات بیان کرنے کے بعد مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کہا کہ مولانا آزاد کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ انھوں نے کبھی اپنے آپ کو چھپایا نہیں۔ مثلاً وہ سگریٹ پیتے تھے تو سب کے سامنے پیتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگوں کے جانے کے بعد یا اِدھر اُدھر چھپ چھپا کر پئیں (مولانا اکبر آبادی نے یہ الفاظ اس انداز سے کہے کہ سامعین کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ خود مقرر بھی مسکرائے)

مولانا اکبر آبادی نے فرمایا، یہ ہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گیا ہے اولئك یبدل الله سیاتھم حسنات۔ ان میں کسی قسم کی برائیاں ہوں تو اللہ ان برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔

۱۷۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے پنڈت جواہر لال نہرو کے سابق سیکرٹری متھائی کی کتاب کا ذکر بھی کیا۔ انھوں نے کہا متھائی نے اس کتاب میں مولانا آزاد پر بعض الزامات عائد کیے تھے۔ متھائی گھٹیا ذہنیت کا مالک تھا اور محکمانہ اعتبار سے بہت بری شہرت رکھتا تھا۔ اس کی کتاب شائع ہوئی تو ہندوستان کے سنجیدہ ذہن کے لوگوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کے مندرجات کو قابل اعتنا نہیں گردانا۔ مولانا کے سیاسی مخالفوں نے بھی اسے لائق توجہ قرار نہیں دیا۔ تاہم بعض حضرات نے اس کا جواب دیا اور مولانا کے دفاع کے ساتھ ساتھ خود متھائی کے ذاتی کردار کی وضاحت کی اور اس کی فطرت کا تجزیہ کیا۔ جواب دینے والوں میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی۔

مولانا اکبر آبادی نے کہا مجھے پتا چلا ہے کہ پاکستان کے بعض لوگ متھائی کی کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کے اس حصے کو خوب اچھالا، جس کا تعلق مولانا آزاد سے تھا۔ میرے خیال میں وہ لوگ خود متھائی کے عمل و کردار سے واقف نہیں ہیں۔ اگر انھیں اس سے تھوڑی بہت واقفیت ہوتی تو اسے قطعاً قابل التفات نہ ٹھہراتے۔ غالباً وہ مولانا کی ان خدمات سے بھی آگاہ نہیں ہیں جو انھوں نے آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سرانجام دیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے متعدد مشہور تعلیمی اور تصنیفی ادارے محض مولانا آزاد کی کوششوں سے محفوظ رہے۔

مولانا اکبر آبادی کی تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹا جاری رہی اور لوگوں نے اطمینان وسکون سے سنی۔ ان کی یہ پہلی اور آخری پبلک تقریر تھی جو مجھے سننے کا موقع ملا اور جس سے میں بہت محظوظ اور متاثر ہوا۔

مولانا اکبر آبادی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے برصغیر میں علمی اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ تصنیف وتالیف اور تعلیم وتدریس میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی اور اس سلسلے میں ان کا تجربہ بہت وسیع تھا۔ قدیم وجدید پر ان کی نظر تھی، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس دور میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ قدیم وجدید کا سنگم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے کچھ عرصہ بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کو مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل مقرر کردیا تھا اور یہ خدمت انھوں نے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دی۔

یہاں یہ عرض کردوں کہ تقسیم ملک کے بعد کلکتہ کے مسلمان بہت بڑی تعداد میں مشرقی پاکستان چلے گئے تھے، جن میں مدرسہ عالیہ کے اساتذہ اور طلبا بھی شامل تھے۔ وہ مدرسے کے کتب خانے کی بہت سی کتابیں ساتھ لے گئے تھے۔ بس ایک عمارت باقی رہ گئی تھی، باقی سب کچھ ضائع ہوگیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے مدرسہ عالیہ کو دوبارہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا تو ان کی نظر مولانا سعید احمد پر پڑی۔ چناں چہ انھوں نے حکومت بنگال کو خط لکھا کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو مدرسہ عالیہ کا پرنسپل مقرر کردیا جائے، وہ اسے پہلی حالت میں لے آئیں گے۔

مولانا آزاد نے اپنے خط میں ان کے نام کے ساتھ ''اکبرآبادی'' لکھا تھا۔ اس کے بعد مولانا سعید احمد نے اسے اپنے نام کا حصہ بنالیا اور پھر وہ اسی نسبت سے مشہور ہوگئے۔ وہ اگرچہ پیدائشی طور پر اکبرآباد (آگرہ) سے تعلق رکھتے تھے، لیکن آزادی سے پہلے ان کی جو کتابیں شائع ہوئیں، ان پر بحیثیت مصنف ان کا نام سعید احمد ایم اے لکھا تھا۔ ''اکبرآبادی'' کا لفظ مرقوم نہیں تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مولانا آزاد کی دی ہوئی نسبت ''اکبرآبادی'' کو اپنالیا اور وہ اپنے آپ کو سعید احمد اکبرآبادی لکھنے لگے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وہ کئی سال شعبہ دینیات کے استاد رہے۔ بعض دیگر تعلیمی اداروں کے ارباب انتظام نے بھی ان کو اس ذمے دارانہ منصب پر فائز کیا اور وہ ان کی توقعات پر پورا اترے۔ اپنے ملک (ہندوستان) سے باہر کی بعض یونیورسٹیوں کے اصحاب بست وکشاد نے بھی تعلیم وتدریس کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں اور وہاں کے علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

آزادی سے کچھ عرصہ قبل وہ دہلی کے سینٹ سٹیفنسن کالج میں پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں ضیاء الحق بھی جو بعد میں صدر پاکستان بنے، اس کالج میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے۔ مولانا اکبرآبادی نے ایک مرتبہ خود اس کا ذکر کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور فرمایا کہ جب جنرل ضیاء الحق پاکستان کے صدر بنے تو دہلی کے بعض حضرات نے ان سے کہا کہ یہ آپ کے شاگرد ہیں۔ اسلام آباد میں ان کی صدر سے ملاقات ہوئی تو صدر نے کہا: آپ کی عمر تو بے شک بڑھ گئی ہے، لیکن چہرے کے خدوخال وہی ہیں۔

تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کے لیے تین اصحاب علم نے دہلی کے قرول باغ میں ''ندوۃ المصنفین'' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں ایک ادارہ قائم کیا تھا اور اس کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ ''برہان'' جاری کیا گیا تھا، جس کے فرائض ادارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے سپرد ہوئے تھے۔ ان اصحاب ثلاثہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔

۱۹۴۷ء میں جب دہلی پر خون کی گھٹا چھائی اور قتل وغارت اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا تو قرول باغ کا علاقہ بھی اس کی زد میں آگیا اور ندوۃ المصنفین کی مطبوعات، کتب خانہ، عمارت اور تمام سامان فسادی عناصر نے نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد حالات میں کچھ تبدیلی آئی تو ندوۃ المصنفین کے بانیوں نے دہلی کی جامع مسجد کے قریب اردو بازار میں از سر نو کام کا آغاز کیا اور محنت وسعی سے اس تصنیفی واشاعتی ادارے کو نئی زندگی سے روشناس کرایا اور کام کی رفتار کو آگے بڑھایا۔

یہ تینوں بزرگ میدان علم وتحقیق کے شہسوار تھے اور انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بے حد لگن اور کوشش سے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ ان میں سے مولانا حفظ الرحمٰن ۲۔ اگست ۱۹۶۲ء کو عازم فردوس ہوئے، مفتی عتیق الرحمٰن نے ۱۲۔ مئی ۱۹۸۴ء کو سفر آخرت اختیار کیا اور اس سے ٹھیک ایک سال بارہ دن بعد ۲۴۔ مئی ۱۹۸۵ء کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بہشت بریں کو اپنا ٹھکانا بنایا۔

مولانا اکبر آبادی صاحب نظر مصنف اور منجھے ہوئے مقالہ نگار تھے۔ سوچ سمجھ کر قلم اٹھاتے اور پھر خوب صورت اسلوب سے صفحات قرطاس کو اپنے افکار وتصورات سے مزین کرتے جاتے۔ ان کی تصنیفات ان کی اصابت فکر کی آئینہ دار اور تحقیق وکاوش کی غماز ہیں۔ ''برہان'' میں ان کے مطبوعہ مقالات ان کے علم وادراک اور دقت نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ **فہم قرآن:** اس کتاب کا ایک حصہ قرآن سے متعلق اور ایک حصہ حدیث رسول ﷺ کی جمع وتدوین کے بارے میں ہے۔ پچاس برس سے زائد عرصہ ہوا کہ سب سے پہلے میں نے ان کی یہ ہی کتاب پڑھی تھی، جس کا نقش تاثر اب تک لوح ذہن پر قائم ہے۔

۲۔ **وحی الٰہی:** اپنے موضوع کی یہ ایک علمی تصنیف ہے۔

۳۔ **اسلام میں غلامی کی حقیقت:** غلامی ایک اہم مسئلہ ہے اور شریعت اسلامی نے غلام کو جو حقوق عطا کیے ہیں اور غلامی کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں، اس کتاب میں اسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ **غلامان اسلام:** اس میں ان غلاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جنھیں رسول اللہ ﷺ کا شرف صحبت حاصل تھا یا جو تابعین کی وسعت پذیر فہرست میں شامل تھے۔

۵۔ **صدیق اکبر:** یہ کتاب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے۔

۶۔ **عثمان ذوالنورین:** اس میں خلفیۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کی حیات طیبہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

۷۔ **مسلمانوں کا عروج وزوال:** اپنے موضوع سے متعلق یہ لائق مطالعہ کتاب ہے۔

۸۔ **خطبات اقبال پر ایک نظر:** اس میں علامہ اقبال کے خطبات کا دینی نقطہ نگاہ سے جائزہ لیا گیا ہے۔

۹۔ **نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت:** یہ کتاب ان کے دو مقالوں پر مشتمل ہے، جو پہلے ''برہان'' میں شائع ہوئے اور بعد کو انھیں کتابی شکل دے دی گئی۔ اس میں اس مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ مولانا ممدوح نے لکھا ہے کہ ہندوستان نہ دارالکفر ہے، نہ دارالحرب ہے اور نہ دارالامن ہے...... یہ دارالقوم ہے، جس میں مختلف مذاہب کی بہت سی قومیں آباد ہیں۔

۱۰۔ **چار علمی مقالات:** یہ ''برہان'' میں ان کے شائع شدہ چار علمی وتحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ ہندوستان کے سیاسی معاملات کو مولانا اکبر آبادی اپنے رسالے ''برہان'' میں کھل کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیر بحث لاتے اور بغیر کسی جھجک اور رو رعایت کے ان پر اظہار رائے کرتے تھے۔ جن مسائل ومعاملات کا تعلق وہاں کے مسلمانوں سے ہوتا، ان کے بارے میں ان کا قلم بالخصوص جوش میں آجاتا تھا۔ اس کے لیے "برہان" کے اداریے دیکھے جاسکتے ہیں، وہ اس کی شہادت دیں گے۔

وہ ہندوستان کی بزم علم کے ممتاز رکن، دبستان دیوبند کے لائق احترام بزرگ، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور شیخ الہند اکیڈیمی کے صدر تھے اور صدر کی حیثیت سے دیوبند کے مجمع علما میں ان کا دفتر تھا۔ علی گڑھ میں گھر تھا اور ان کے اہل وعیال وہیں مقیم تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وہ سالہا سال منسلک رہے تھے اور وفات سے کچھ عرصہ پہلے علی گڑھ میں اقامت گزیں تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ مولانا انور شاہ کشمیری صاحب کے فیض یافتہ اور اس دور کے عالی مرتبت اساتذہ کے آخری تلامذہ میں سے تھے۔ اب غالباً مولانا انور شاہ کے چند ایک شاگرد ہی اس دنیائے فانی میں موجود ہوں گے۔

مولانا سعید احمد کئی مہینوں سے بیمار تھے۔ مئی ۱۹۸۴ء میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوا، اس سے بھی وہ متاثر تھے۔ اس سے دو ماہ بعد ان کے بڑے بیٹے عمر سعید اچانک وفات پاگئے تھے، اس المیے سے بھی وہ بہت مغموم تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عمر سعید کی وفات کے دن انھوں نے کسی معاملے میں بیٹے کو سخت ڈانٹ پلائی تھی۔ عمر سعید نیند آور گولیاں کھا کر سونے کے عادی تھے۔ باپ کے ذہن میں یہ بات سماگئی تھی کہ ان کی ڈانٹ سے دل برداشتہ ہوکر بیٹے نے مقررہ مقدار سے زیادہ گولیاں کھالیں، جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس اعتبار سے وہ اپنے آپ کو بیٹے کی موت کا باعث قرار دینے لگے تھے۔

بیٹے کی وفات سے کچھ عرصہ بعد اگست ۱۹۸۴ء میں ان کو علی گڑھ میں کتے نے کاٹ لیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کے پیٹ میں ٹیکے لگائے۔ چند روز بعد وہ جگہ جہاں ٹیکے لگائے گئے تھے، متورم ہوگئی اور انھیں بخار آنے لگا۔ ڈاکٹرں کی تشخیص کے مطابق وہ ملیریا بخار تھا اور انھیں کونین کی گولیاں کھلانا شروع کردی گئیں۔ کونین کے زیادہ استعمال نے ان کے جگر کو متاثر کیا اور خون پیدا ہونا بند ہوگیا۔ جگر کی خرابی نے یرقان کی شکل اختیار کرلی اور انھیں بغرض علاج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بہت توجہ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ان کی صاحب زادی کو (جو کراچی رہتی ہیں) باپ کی بیماری کا پتا چلا تو علی گڑھ پہنچیں اور بہتر علاج کے لیے انھیں کراچی لے آئیں۔ معالجوں سے رجوع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مثانے میں پتھری پیدا ہوگئی ہے اور پیٹ میں، جہاں ٹیکے لگائے گئے تھے، سرطان نمودار ہوگیا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اس کا علاج آپریشن تھا، لیکن کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ آپریشن کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔

مولانا اکبر آبادی جس طرح تندرستی کے عالم میں خوش وخرم رہتے تھے، پتا چلا ہے کہ حالت مرض میں بھی اسی طرح ہشاش بشاش رہتے تھے۔ نماز بروقت ادا کرتے تھے۔ تھوڑا بہت مطالعے کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور کراچی کے جو اہل علم ملاقات اور عیادت کو آتے، ان سے بھی بات چیت ہوتی، جس میں بعض اوقات طوالت بھی آجاتی، بالآخر موت کا وقت آگیا۔ ۳۔ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ (۲۴۔ مئی ۱۹۸۵ء) کو افطار سے تھوڑی دیر پہلے وہ غسل خانے سے وضو کر کے اپنے کمرے کو جارہے تھے کہ چلتے چلتے حرکت قلب بند ہوگئی اور پل بھر میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ انھوں نے کراچی میں وفات پائی اور اسی شہر کی سرزمین میں مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مرحوم کے دارالعلوم (کورنگی) کے احاطۂ قبرستان میں مفتی صاحب کے مرقد کے قریب دفن کیے گئے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۱۹۰۸ء کو آگرہ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ آگرہ سے میٹرک پاس کیا۔ پھر ان کے والد (ڈاکٹر محمد ابرار حسین) نے بیٹے کو دینیات کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخل کرادیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ پھر ایف اے اور بی اے کیا۔ بعدازاں ایم اے کا امتحان دیا اور علمی اعتبار سے بڑا کام کیا اور بڑا نام پایا۔

وہ اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے اور کم وبیش زندگی کی ستتر (۷۷) بہاریں دیکھ چکے تھے، لیکن ان کا شمار ہمارے نزدیک ان شخصیتوں میں ہوتا تھا جن کے بارے میں موت کی الم ناک خبر سننے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ بے شک عمر کی کسی منزل میں داخل ہو جائیں، خیال یہ ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہتا ہے کہ ابھی اس دنیا میں ان کی ضرورت ہے اور ان کا دائرۂ فیض رسانی اور وسیع ہونا چاہیے اور لوگوں کو ان سے مستفید ہونے کے مزید مواقع میسر آنے چاہئیں...... لیکن یہ ہماری ایسی خواہش ہے جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ موت کا سایہ ہر شخص پر ہر آن منڈلا رہا ہے، کسی کو اس سے مفر نہیں۔ ہر متنفس چھوٹا ہو یا بڑا، عالم ہو یا جاہل، نبی ہو یا ولی، غوث ہو یا قطب، سب کے درِ حیات پر بالآخر فرشتہ اجل عزرائیل آ دستک دیتا ہے اور اپنی اپنی باری پر ہر ذی روح کو موت کی وادی میں دھکیلتا جاتا ہے۔

کل نفس ذائقه الموت

یہاں ہیر وارث شاہ کے دو شعر یاد آرہے ہیں۔ رانجھا جب جوگی بن کر ہیر سے ملاقات کے لیے رنگ پور کھیڑیاں گیا اور بھیک مانگتے ہیر کے دروازے پر پہنچا تو سہتی کے ہاتھوں اس کا ٹھوٹھا (کاسۂ گدائی) ٹوٹ گیا۔ جوگی نے اس پر خفگی کا اظہار کیا تو وارث شاہ کی زبان میں سہتی نے اس سے کہا:

جو جمیاں مرے گا سبھ کوئی گھڑیا بھج سی واہن سب ویہن گے وے
میر، پیر، ولی، غوث، قطب جان ایہہ سبھ پسارڑے ڈھین گے وے
جدوں رب اعمال دی خبر پچھے ہتھ پیر گواہیاں کہن گے وے
جدوں عمر دی اودھ میعاد پگی عزرائیل ہوری آ بہن گے وے

ان دو شعروں میں دردناک انداز میں موت کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور انسانی زندگی کو فانی اور عارضی قرار دیا گیا ہے۔

بتایا گیا ہے کہ جو پیدا ہوا، وہ مر جائے گا اور جو تعمیرات ہوئی ہیں، وہ منہدم ہو جائیں گی۔ بڑے چھوٹے، پیر، فقیر، ولی، قطب اور پیغمبر سب پر موت طاری ہوگی۔ زندگی کے آخری وقت میں عزرائیل انسان کی جان لینے کے لیے آجاتا ہے۔ حساب کتاب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ہاتھ پاؤں گواہیاں دیتے ہیں کہ انھوں نے کس وقت کیا کیا عمل کیے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مٹی کا ٹھوٹھا (کشکول) ٹوٹ گیا تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ یہ دنیا عارضی ہے، یہاں کوئی چیز بھی باقی نہیں رہے گی۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا اکبر آبادی کی وفات کے بعد یہ افسوس ناک انکشاف ہوا کہ جن تین اہل علم (مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ) نے ندوۃ المصنفین قائم کیا تھا اور جنھوں نے خود بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں اور بہت سے حضرات کی کتابیں شائع فرمائیں، ان کی اولاد میں سے کوئی شخص نہ تو اس قابل ہے کہ تصنیفی وتالیفی خدمت انجام دے سکے اور نہ کسی میں یہ صلاحیت ہی پائی جاتی ہے کہ اس تحقیقی ادارے ندوۃ المصنفین اور اس کے ترجمان ''برہان'' کو زندہ رکھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ادارہ ختم ہو گیا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے بہت ہی قریبی حلقے سے معلوم ہوا کہ مولانا افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میری اولاد میں سے کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے اب تک کیا لکھا ہے، کیا لکھتا ہوں، میری کتابوں کے کیا کیا نام ہیں اور کون سی کتاب کس موضوع سے متعلق ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دیں کہ اس فقیر کا یہ مضمون ''مولانا سعید احمد اکبر آبادی'' کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۸۸ء کے ''قومی ڈائجسٹ'' (لاہور) میں چھپا تھا اور اس پر ادارۂ ''قومی ڈائجسٹ'' کے رکن جناب تنویر قیصر شاہد نے حسب ذیل نوٹ لکھا تھا۔

''سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے استاد محترم، برصغیر کی ایک بلند پایہ شخصیت، کلکتہ کے ایک دینی مدرسے کے پرنسپل، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامیات کے روح رواں، ندوۃ المصنفین کے بانی، رسالہ ''برہان'' (دہلی) کے مدیر اعلیٰ، قریباً ایک درجن کتابوں کے صاحب نظر مصنف اور منجھے ہوئے مقالہ نگار کی علمی کاوشوں اور داخلی وخارجی زندگی کا نقاب کشا تذکرہ جو بہت سے لوگوں کے لیے حیران کن بھی ہوگا اور معلومات افزا بھی، ایک ایسے شخص کی دل کشا باتیں جس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تصنیف وتالیف رہا، ان کے قریبی دوست محمد اسحاق بھٹی کے قلم سے۔''

لیکن اس کے بعد یہ مضمون ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ''قومی ڈائجسٹ'' کے حوالے سے اپنے مجلّے ''حکمت قرآن'' (لاہور) میں ''مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی شخصیت اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ان کے خیالات وتاثرات'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس پر ڈاکٹر اسرار احمد نے جو نوٹ لکھا اس میں تحریر فرمایا کہ ''مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۷۔ مارچ ۱۹۸۴ء کو جناح ہال لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضرات کی نشست میں جو تقریر کی تھی، اس کا عنوان تھا ''مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت وکردار اور ان کے علمی وعملی کارنامے'' یہ تقریر ٹیپ سے اتار کر انجمن کے مجلّہ ''حکمت قرآن'' میں شائع کر دی گئی تھی۔ بعدازاں اسے ''حکمت قرآن'' ہی سے لے کر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے کچھ توضیحی اور بعض اختلافی حواشی کے ساتھ نہایت آب وتاب سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا، جس کا عکس راقم کی کتاب ''جماعت شیخ الہند'' کا مستقل جز بن چکا ہے۔ اب مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی یہ تحریر ایک اضافی شہادت کے طور پر شائع کی جارہی ہے تاکہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو خیالات اپنی اس تقریر میں ظاہر فرمائے تھے، ان کی ان کے ساتھ نسبت میں کوئی شک نہ رہے۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کا حافظہ قابل داد بلکہ قابل رشک ہے کہ انھوں نے محض سن کر تقریر کو اتنی تفصیل اور صحت کے ساتھ تحریر فرمادیا۔ اس تقریر کے علاوہ اس تحریر میں چند باتیں مزید بھی ہیں یقیناً قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوں گی۔'' (اسرار احمد)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس فقیر کا جن الفاظ میں تذکرہ فرمایا اس پر یہ فقیر ان کا شکر گزار ہے۔

☆☆☆☆☆

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میر علی احمد تالپور

(وفات ۵۔اپریل ۱۹۸۷ء)

تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما میر علی احمد تالپور ۵۔اپریل ۱۹۸۷ء کو وفات پا گئے۔ وہ کچھ عرصے سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو علاج کے لیے لندن گئے اور وہاں کے لندن کلینک میں داخل ہوئے۔ لیکن صحت یاب نہ ہو سکے اور دردِ دل کی شدت سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۹۔اپریل کو ان کی میت لندن سے حیدر آباد لائی گئی اور ۱۰۔اپریل کو انھیں اسی شہر میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

تالپور خاندان کا شمار صوبہ سندھ کے قدیم حکمران خاندانوں میں ہوتا ہے۔ شرافت ونجابت کے اعتبار سے اس خاندان کو ہمیشہ خاص شہرت حاصل رہی ہے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی جب اپنے رفقا کے ساتھ جہاد کے لیے دہلی سے عازم سرحد ہوئے تھے تو علاقہ سندھ سے گزرتے ہوئے اس خاندان کے بزرگوں سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے وہاں کے حالات اور اپنی بساط کے مطابق سید صاحب سے پورا تعاون کیا تھا اور ان کی مہمان نوازی کے فرائض انجام دیے تھے۔

میر علی احمد تالپور اسی خاندان کے فردِ فرید اور جوہرِ قابل تھے۔ وہ ۳۱۔اگست ۱۹۱۱ء کو حیدر آباد (سندھ) کے ایک نواحی گاؤں ٹنڈو میر محمود میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی۔ بعد ازاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا اور اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ وہ مسلکاً اہلِ حدیث تھے اور اس مسلک کے حامل علماء وزعماء سے گہرا تعلق رکھتے اور ان سے نہایت عزت واحترام کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ ان کے حدودِ مطالعہ بہت وسیع تھے۔ تفسیر، سیرت، تاریخ، رجال اور ادب وشعر وغیرہ تمام علوم سے ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو بے پناہ دلچسپی اور قلبی لگاؤ تھا۔ ان کی مجلس میں ان میں سے کسی موضوع پر گفتگو شروع ہو جاتی تو ان کے معلومات کے تار تیزی سے حرکت کرنے لگتے اور پھر بات سے بات پیدا ہوتی چلی جاتی۔ ان کا نہج کلام مؤثر اور دھیما تھا اور نچی تلی بات کرتے تھے۔

برصغیر کے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں میں میر علی احمد تالپور غالبًا واحد شخص تھے جنھوں نے حصولِ علم کے بعد قافلۂ شیفتگان حریت سے وابستگی اختیار کی اور برطانوی سامراج سے پنجہ آزما ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے سیاسی افکار وہی تھے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے تھے اور ان کے سیاسی مراسم و روابط انہی لوگوں اور انھی جماعتوں سے تھے جو آزادیٔ وطن کی تحریک میں پیش پیش تھیں۔ ماضی کے واقعات بیان کرنے اور دل کی بات کہنے میں وہ ہمیشہ بے باک رہے وہ بغیر کسی حجاب اور رو رعایت کے اپنے قدیم ساتھیوں سے تعلقات کا برملا اظہار کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے وہ نیاز مندانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ایک دن ان سطور کا راقم مولانا غزنوی کی خدمت میں حاضر تھا کہ ان کے کمرے کا دروازہ کھلا اور پوری قد و قامت کے ایک جوان رعنا جن کی بڑی بڑی کالی سیاہ مونچھیں چڑھی ہوئی تھیں اور جسم کی ڈیل ڈول قد کے عین مطابق نہ فربہی کا غلبہ اور نہ دبلے پتلے، کمرے میں داخل ہوئے اور ادب و اعتقاد کے لہجے میں ''السلام علیکم'' کہا مولانا اپنی جگہ سے اٹھے، ان کے سلام کا جواب دیا او اس خوب صورت نوجوان نے عقیدت مندانہ انداز میں گردن جھکا کر اپنے دونوں ہاتھ مولانا کے ہاتھوں میں تھما دیے یہ میر علی احمد تالپور تھے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ وحدت مغربی پاکستان کی کابینہ کے رکن تھے اور لاہور میں شملہ پہاڑی کے قریب ایک کوٹھی میں اقامت گزیں تھے۔ وہ کچھ دیر بعض امور سے متعلق مولانا سے مصروف گفتگو رہے۔ اس کے بعد انھوں نے نہایت مؤدبانہ الفاظ میں مولانا سے جانے کی اجازت لی اور جاتے ہوئے انھیں کسی وقت اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی۔

اس سے کئی دن بعد نمازِ مغرب کے بعد مولانا نے ان کو ٹیلی فون کیا اور ان کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ راقم الحروف بھی مولانا کے ساتھ تھا۔ تقریبًا ایک گھنٹے تک وہاں نشست

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہی۔ میر صاحب مرحوم نے مولانا سے کہا کہ ہم مسلکی اعتبار سے اہلِ حدیث ہیں اور سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریک اور ان کے دینی و مذہبی نقطۂ نظر سے ہمارے خاندان اور ہمارے آباؤ اجداد کو ہمیشہ دلی اور روحانی تعلق رہا ہے اور یہ تعلق اب تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔ انھوں نے سید صاحب کے کاروانِ مجاہدین کی سندھ میں آمد سے متعلق تفصیلات بیان کیں اور تالپور خاندان نے ان کی جس اسلوب میں پذیرائی کی، اس کے بارے میں بعض ایسی باتیں بتائیں جو ان سطور کے راقم کے لیے نئی تھیں۔

مرحوم کئی سال صدر ضیاء الحق کی مارشل لا حکومت میں وزیر دفاع رہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض ایسی علمی و ادبی محفلوں میں بھی شامل ہوتے اور ان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے، جن کے ڈانڈے انتہائی حساس اور نازک ترین سیاست سے مل جاتے تھے۔ کم و بیش تین برس پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ایک صاحبِ علم دوست مولانا عبدالرشید ارشد نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ ''الہلال'' کے دورِ اول (۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء) کے مکمل فائل عکسی صورت میں شائع کیے اس کی افتتاحی تقریب کے لیے انھوں نے میر علی احمد تالپور سے رابطہ پیدا کیا۔ میر صاحب نے منظوری دے دی اور خود ہی اس کی تاریخ مقرر کردی۔ تقریب کے انعقاد کا اہتمام فلیٹیز ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ بہت لوگ وقت مقررہ پر وہاں پہنچے لیکن میر صاحب کسی مجبوری کی بناء پر نہ آسکے۔ معذرتی پیغام بھجوایا اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا۔ لوگوں نے کئی قسم کی باتیں کیں اور تقریباً سب کے ذہن اس طرف گئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سلسلہ کی کسی تقریب میں پاکستان کا ایک مرکزی وزیر کیوں کر شامل ہوسکتا اور اس کی صدارت کرسکتا ہے۔

بہرحال دوسرے دن وہ تشریف لائے۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ باہر بھی لوگ کھڑے تھے۔ میر صاحب کرسیٔ صدارت پر بیٹھے اور جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ متعدد اصحابِ علم نے مولانا ابوالکلام کی شخصیت، ان کے علم وفضل اور الہلال کی دعوت سے متعلق مقالے پڑھے۔ ایک صاحب نے اپنے مقالے میں جب یہ الفاظ کہے کہ مولانا آزاد کی سیاست کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کے علم وادراک کی فراوانیوں کے بارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اختلاف نہیں ہوسکتا تو میر صاحب نے فوراً قلم پکڑا اور یہ بات کاغذ پر لکھی۔ مقالوں کا سلسلہ ختم ہوا تو انھوں نے صدارتی تقریر کرنا شروع کی۔ لب ولہجہ نہایت عمدہ، تلفظ بالکل صحیح، روانی اور سلاست قابلِ داد اور موقع محل کے مطابق شعر۔

انھوں نے بتایا کہ سترہ سال کی عمر میں وہ مولانا کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہوگئے تھے اور انھیں یہ فخر حاصل ہے کہ آج تک وہ عقیدت قائم ہے اور زندگی کے آخری سانس تک قائم رہے گی۔ انھوں نے کہ کہا کہ میرے پاس مولانا کے ''الہلال'' کے فائل موجود ہیں وہ ان کے مضامین باقاعدہ پڑھتے اور ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ انھوں نے ''الہلال'' کے فائل بہترین غلاف میں اونچی جگہ پر رکھے ہیں تاکہ ان کی طرف کسی کی پیٹھ نہ ہو اور سوئے ادب کا احتمال باقی نہ رہے وہ صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہونے کے بعد روزانہ ان فائلوں کی زیارت کرتے اور ذرا بھی گرد پڑ جائے تو اسے خود جھاڑتے ہیں۔

انھوں نے دورانِ تقریر میں فرمایا کہ ایک بھائی نے ابھی اپنے مقالے میں کہا ہے کہ مولانا آزاد کی سیاست سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کے علم وفضل سے اختلاف نہیں ہوسکتا۔ میں اس کو نہیں مانتا۔ میں کہتا ہوں کہ نہ مولانا کی سیاست سے اختلاف ہوسکتا ہے، نہ ان کے علم وفضل سے۔ ان کی سیاست، ان کی دعوت دورِ اول میں بھی صحیح تھی۔ بعد میں بھی صحیح تھی اور آج کے حالات کے مطابق بھی صحیح تھی۔ انھوں نے زور دے کر کہا مولانا آزاد نے کبھی غلطی نہیں کی اور کسی معاملے میں نہیں کی۔ نہ تفسیر میں، نہ تحقیق وکاوش کے کسی گوشے میں اور نہ سیاست میں۔ وہ اپنے اندازِ کار اور اپنے نقطۂ نظر میں ہمیشہ حق بجانب رہے۔ ان کے نزدیک وہی صحیح تھا جس کی وہ دعوت دیتے تھے۔ جب وہ خود آپ کو صحیح قرار دیتے ہیں تو ہم کون ہوتے ہیں جو ان کی تغلیط کریں اور انھیں غیر حق بجانب قرار دیں۔

یہ بہت بڑی بات تھی جو پاکستان کے مارشل لاء حکومت کے مرکزی وزیر نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں کہی۔ اور یہ بات ہر شخص نہیں کہہ سکتا، میر علی احمد تالپور جیسا جرأت مند شخص ہی کہہ سکتا تھا۔

انھوں نے مولانا آزاد کے علم وفضل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میرے ایک دوست نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو امریکہ میں مقیم ہیں مجھ سے خط لکھ کر پوچھا کہ اردو کے کس مفسر کی تفسیر قرآن مجھے پڑھنی چاہیے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ ''اس شخص کی تفسیر پڑھا کرو جس نے اپنے بعد وراثت نہیں چھوڑی۔'' میر صاحب کو داد تو ان کے ہر جملے پر ملتی رہی لیکن اس جملے پر ان کو حاضرین کی طرف سے بہت داد دی گئی۔

میر علی احمد پاپور نے ۷۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ وہ کئی سال ملک کے منصب وزارت پر فائز رہے۔ ان کی سیاسی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ سلجھے ہوئے مقرر اور تجربہ کار سیاست دان تھے۔ مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک اور پرانے زمانے کے لوگوں کی طرح وضع دار بزرگ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سید صباح الدین عبدالرحمان

(وفات ۱۸۔نومبر ۱۹۸۷ء)

علامہ شبلی نعمانی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اہل علم کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو تصنیف وتالیف اور مختلف موضوعات میں درک وانہماک کو اپنا مستقل مشغلہ بنائے اور اپنے شب وروز اس کام کے لیے وقف کردے۔ اس کے لیے ان کے نزدیک ایک بہت بڑا کتب خانہ نہایت ضروری تھا، جس سے مصنفین استفادہ کرسکیں۔ وہ چاہتے تھے کہ برصغیر میں اصحاب تصنیف کا یہ ایک ایسا ''گوشہ عافیت'' ہو، جس کا شہروں کی ہنگامہ خیزیوں اور بازاروں کی شورانگیزیوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ ان مکروہات سے دور صرف علمی کاموں میں مصروف رہیں۔ ندوۃ العلما کے سالانہ جلسے منعقدہ مارچ ۱۹۱۰ء میں یہ تجویز انھوں نے شرح وبسط کے ساتھ پیش کی تھی۔

ابتداء میں ان کا خیال تھا کہ یہ ''گوشہ عافیت'' دارالعلوم ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے قریب کہیں قائم کیا جائے، لیکن اس کے بعد ارادہ بدل دیا اور اس کے لیے اپنے وطن اعظم گڑھ کو ترجیح دی اور بارہ ایکڑ پر پھیلا ہوا اپنا ذاتی باغ اور اس میں تعمیر شدہ مکان دارالمصنفین کے لیے وقف کردیا۔ یہ بہت بڑا ایثار تھا جو انھوں نے کیا۔

دارالمصنفین کے لیے جو خاکہ انھوں نے مرتب کیا اور جن خطوط پر اسے چلانا چاہا، اس کی ضروری شقیں مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۱۔فروری ۱۹۱۴ء کے الہلال میں شائع کی تھیں۔

۱۴۔اگست ۱۹۱۴ء کو باغ کا رقبہ دارالمصنفین کے حوالے کردیا گیا۔ ۱۸۔نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ انتقال سے تین دن بعد ۲۱۔نومبر کو علامہ شبلی کے مخلص دوستوں اور ایثار پیشہ شاگردوں نے علامہ کی مجوزہ سکیم کے مطابق دارالمصنفین کو ہر صورت میں چلانے کا فیصلہ کیا۔ سید سلیمان ندوی جو اس زمانے میں پونا کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے۔ مولانا مسعود علی ندوی نے انتظامی امور کی باگ ڈور ہاتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں لی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے جوان دنوں مولانا آزاد کے ساتھ ''الہلال'' میں کام کر رہے تھے، کلکتہ سے اعظم گڑھ کا عزم کیا اور اپنی علمی و تصنیفی خدمات دارالمصنّفین کے سپرد کر دیں۔ ۱۹۱۵ء میں دارالمصنّفین کی تصنیفی سرگرمیوں کا علمی طور پر باقاعدہ آغاز کر دیا گیا۔

دارالمصنّفین کے اصل اور بنیادی اغراض و مقاصد صرف تین تھے۔

۱۔ ملک میں اعلیٰ پائے کے مصنفین اور اہل قلم پیدا کرنا۔

۲۔ اونچے درجے کی کتابیں معرض تصنیف میں لانا اور بہترین کتابوں کا ترجمہ کرنا۔

۳۔ علمی و تحقیقی اور تاریخی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کرنا۔

معمولی سرمایے سے کام شروع ہوا۔ رفقائے دارالمصنّفین کے لیے چھوٹے چھوٹے سکونتی مکان بھی اسی احاطے میں تعمیر کیے گئے اور رفقا کے کام کے لیے کمرے بھی وہیں بنائے گئے تاکہ لکھنے پڑھنے والوں کا ہر وقت آپس میں رابطہ رہے۔ پھر آہستہ آہستہ بہت اچھا کتب خانہ بھی قائم کیا گیا۔ اللہ نے اس کارِ خیر کو جس کا بنیادی سرمایہ محض دلوں کا خلوص اور اللہ پر توکل تھا، اتنی ترقی دی کہ یہ ادارہ بہت جلد نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہو گیا۔

دارالمصنّفین کی تصنیفات کا سلسلہ بڑا وسیع ہے اور اس کی مطبوعات ہر اہم اور ضروری موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ سیرتِ رسول، سیرتِ صحابہ و صحابیات، حالاتِ تابعین، سوانحِ مشاہیر اسلام، تاریخِ اسلام، تاریخِ علوم و فنون، تاریخِ تمدن ممالک اسلامی، تاریخِ ہند اور تاریخِ برصغیر، فلسفہ۔ غرض ہر موضوع پر رفقائے دارالمصنّفین نے کام کیا اور تصنیف و تالیف اور ترجمہ و تشریح کی ایسی روایت قائم کی، جس کی اس سے قبل برصغیر کی علمی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے دارالمصنّفین کی مطبوعات کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

دارالمصنّفین کے تذکرے میں اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ اس کے کارکنوں کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ رفقائے اعزازی: یہ وہ ممتاز اہل قلم اور معروف اربابِ علم ہیں جو دارالمصنّفین کو اپنے علمی مشوروں اور قلمی تعاون سے مستفید کرتے ہیں۔

۲۔ رفیق: وہ حضرات جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کا فن سیکھنے کا شوق رکھتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور اس کے لیے دارالمصنّفین میں مقیم ہیں۔

۳۔ مصنفین: وہ رفیق جو پانچ سال کی تصنیفی تربیت حاصل کر چکے ہوں۔

مصنفین اور رفقا مستقل طور پر دارالمصنّفین کے احاطے میں رہتے ہیں اور ان کی ضروریات کے مطابق ان کے ماہانہ وظائف مقرر ہیں۔ ایثار وقربانی اور بے لوث خدمت کا جذبہ دارالمصنفین کے کارکنوں کی اہم خصوصیت ہے۔ اس کے پہلے ناظم سید سلیمان ندوی بتیس سال تک یہاں خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کا زیادہ سے زیادہ وظیفہ اڑھائی سو روپے ماہانہ تھا۔

مولانا عبدالسلام ندوی چالیس برس دارالمصنّفین سے وابستہ رہے اور متعدد تحقیقی کتابیں تصنیف کیں، ان کا آخری دور کا وظیفہ ایک سو ستر روپے تھا۔ گریڈ اور سکیل سے یہ لوگ واقف ہی نہیں ہیں۔ یہ وہ مرض ہے کہ تصنیف وتالیف اور علم وتحقیق کے جس ادارے میں راہ پالیتا ہے، اس کے ارکان کی قوتِ عمل کو مجروح کر دیتا ہے۔ بے شک ضروریات ہر شخص کے ساتھ ہیں اور تصنیفی اداروں کے اربابِ انتظام کو اس طرف توجہ مبذول رکھنی چاہیے اور کام کرنے والوں کی حالات وضروریات کے مطابق خدمت کرنی چاہیے۔ لیکن یہ کہ اصل نقطۂ نظر گریڈ کو بنالیا جائے اور مرکز توجہ سکیل ہی کو قرار دے لیا جائے، اہلِ علم کو زیب نہیں دیتا۔ اہلِ علم کا شیوہ کام کرنا ہے، گریڈوں کے چکر میں پڑنا ان کا شیوہ نہیں۔ یہی وہ جذبہ صادقہ ہے جو دارالمصنّفین کی شہرت ومقبولیت کا باعث بنا اور جس کی وجہ سے وہاں قابلِ قدر تحقیقی کام ہوا۔

تصنیفات کے علاوہ دارالمصنّفین کا ماہانہ رسالہ ''معارف'' اپنا ایک مستقل مقام رکھتا ہے، جس کے مضامین ومندرجات کو اربابِ تحقیق میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی۔ یہ رسالہ رمضان ۱۳۳۴ھ (جولائی ۱۹۱۶ء) کو سید سلیمان ندوی کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ اللہ کے فضل سے اب تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا سعید احمد انصاری، سید ریاست علی ندوی، حاجی معین الدین ندوی، ابوظفر ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور بہت سے حضرات اہلِ علم نے دارالمصنّفین میں بے پناہ تصنیفی خدمات انجام دیں اور کتنے ہی بزرگوں نے اپنی زندگیاں اس کے لیے وقف کر دیں۔ ان کی حیات مستعار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے شب و روز کا ایک ایک لمحہ دارالمصنفین کی امانت تھا۔ ان کے سوچ بچار کا ہر گوشہ، فکر و ذہن کا تمام تر اثاثہ اور عمل و حرکت کا ہر پہلو دارالمصنفین کی نذر تھا۔

ان لائق تکریم حضرات کی فہرست میں سید صباح الدین عبدالرحمان کا اسم گرامی بھی شامل ہے جو ۱۹۳۵ء میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے اور زندگی کے آخری لمحے تک اس سے وابستہ رہے۔انھوں نے اس کی ترقی کے لیے بعض اعتبارات سے سب سے زیادہ محنت اور تگ و دو کی۔

سید صباح الدین عبدالرحمان صوبہ بہار کے ایک قصبے دیسنہ میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔سید سلیمان ندوی کا وطنی تعلق بھی اسی قصبے سے تھا۔ ابتدائی تعلیم دیسنہ کے قدیم مکتب میں حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء میں مظفر پور سے ایف۔اے کرنے کے بعد پٹنہ گئے اور ۱۹۲۹ء میں پٹنہ کالج سے بی۔اے کیا۔ بعدازاں مدرسہ شمس الہدیٰ میں داخل ہوئے،لیکن اسی اثنا میں بیمار ہوگئے اور کافی عرصہ بیمار رہے،جس کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ رک گیا اور واپس دیسنہ چلے گئے۔صحت یاب ہونے کے بعد علی گڑھ کا عزم کیا اور مسلم یونیورسٹی سے بی۔ٹی کی سند حاصل کی۔

ان کی تعلیمی حالت اور ذہنی وفکری استعداد سے متاثر ہوکر ۱۹۳۵ء میں سید سلیمان ندوی جو اس زمانے میں دارالمصنفین کے ناظم تھے، انھیں دارالمصنفین اعظم گڑھ لے گئے اور انھیں رفقائے دارالمصنفین میں شامل کرلیا گیا۔اسی دوران (۱۹۳۶ء) میں انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو اور ۱۹۳۷ء میں ایم۔اے فارسی کے امتحانات پاس کیے۔

تصنیفی زندگی کا آغاز دارالمصنفین میں سید سلیمان ندوی کی زیرنگرانی ہوا۔ پھر جلد ہی ایک محقق اور انشاپرداز کی حیثیت سے مشہور ہوگئے۔ ادب اور تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔اس میں انھوں نے بہت کام کیا اور جو کچھ لکھا پوری تحقیق سے لکھا۔ دارالمصنفین کے انتظامی اور مالیاتی امور کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔''معارف'' کی ادارت اور اس کی ترتیب وتدوین کے ذمے دار بھی یہی تھے، پھر تصنیفی خدمات بھی انجام دیتے تھے اور مختلف مقامات میں سلسلۂ سفر بھی جاری رہتا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت سی صلاحیتوں کے مالک تھے اور اللہ نے ان کو بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔

انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جو کتب حوالہ میں شامل ہیں۔ ان کتابوں میں مندرجہ ذیل کتابوں نے بالخصوص شہرت پائی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) بزمِ صوفیہ (۲) بزمِ تیموریہ (۳) بزمِ مملوکیہ (۴) اسلام میں مذہبی رواداری (۵) عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو مورخین کی نظر (۶) ہندوستان امیر وخسرو کی نظر میں (۷) غالب مدح وقدح کی روشنی میں (۸) ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر (۹) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام (۱۰) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک (۱۱) ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (۱۲) ہندوستان کے تمدنی جلوے (۱۳) مقالات سید سلیمان ندوی (۱۴) سید سلیمان ندوی کی تصانیف (ایک مطالعہ) اور بعض دیگر تصانیف۔

سید صباح الدین عبدالرحمان اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے، لیکن تصنیف وتالیف، علم وتحقیق اور ادب وصحافت کی صورت میں انھوں نے اپنا ورثہ چھوڑا ہے وہ صفحات قرطاس پر ہمیشہ نقش رہے گا اور ان کی خدمات بوقلموں رہتی دنیا تک لوگوں کے لیے سرمایۂ تحقیق ثابت ہوں گی۔

سید صباح الدین عبدالرحمان کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں دیکھا۔ اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام تھے۔ اپریل کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ اکرام صاحب نے رفقاے ادارہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔ مولانا محمد حنیف ندوی، شاہ محمد جعفر پھلواروی، شاہد حسین رزاقی اور ان سطور کا راقم گئے تو اکرام صاحب اپنی سیٹ سے اٹھے اور ان کے ساتھ ہی ایک اور صاحب کھڑے ہوئے۔ اکرام صاحب نے ان کی طرف اشارہ کر کے رفقاے ادارہ سے کہا: ”آپ ہیں سید صباح الدین عبدالرحمان!“ پھر باری باری سب رفقاے ادارہ کا ان سے تعارف کرایا گیا۔ وہ سر پر رام پوری ٹوپی لیے اور سفید پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ لمبا قد، گورا رنگ اور تیکھے نقش ونگار۔! انھوں نے انکسار اور تواضع سے سب سے خیر وعافیت پوچھی۔

۱۹۶۹ء تک چھپی ہوئی میں نے ان کی تقریباً تمام کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور ”معارف“ کا بھی ایک عرصے سے قاری تھا۔ ان کے قلم کا زور، تحریر میں ادبیت کی چاشنی، زیر بحث موضوع کے بارے میں مدلل گفتگو اور صاف ستھرا اسلوب بیان اپنے اندر بڑی کشش رکھتا اور قلب وذہن پر خاص قسم کا اثر ڈالتا ہے۔ برصغیر کی اسلامی تاریخ ان کا اصل موضوع تھا۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موضوع سے میں بھی تھوڑی بہت دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں انھیں دیکھ کر انتہائی خوش ہوا اور ان کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ وہ چند روز پیشتر مشرقی پاکستان گئے تھے اور بعض ناگفتہ بہ وجوہ کی بنا پر وہاں علیحدگی کی تحریک چل رہی تھی، جس کے زہریلے اثرات وہاں کے ہر مقام میں تیزی سے پھیل رہے تھے۔ سید صاحب ممدوح یہ اثرات و حالات وہاں بچشم خود دیکھ کر آئے تھے اور اس صورت حال سے جو وہاں پیدا ہوگئی تھی، بہ درجہ غایت آزردہ خاطر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ بعض مقامات میں انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا اور ایک دو مرتبہ بڑے تکلیف دہ معاملات پیش آئے۔ وہ کچھ دن وہاں رہنا چاہتے تھے، لیکن خطرناک حالات کے پیش نظر مزید قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلے آئے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے تمام رفقا اور اس کے ڈائریکٹر شیخ اکرام بہت اعزاز کے ساتھ ان سے پیش آئے اور مختلف معاملات پر گفتگو جاری رہی۔ انھوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ تقسیم ملک کے بعد دارالمصنفین کی مطبوعات کی مانگ ہندوستان میں صرف پچیس فی صد رہ گئی ہے، جب کہ پاکستان میں ان کی مانگ پچھتر فی صد ہے، لیکن یہاں کے بعض ناشر ناجائز طور سے اور ہمیں اطلاع دیے بغیر ہماری کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ وہ چاہتے تھے، اس سلسلے میں اکرام صاحب اگر ان کی کچھ مدد کر سکتے ہوں تو ضرور کریں۔

اس ضمن میں سید صاحب ممدوح کی تگ و دو مسلسل جاری رہی اور وہ ہر شخص سے ملے، جس سے مدد کی کوئی امید ہو سکتی تھی، چناں چہ ان کی بھاگ دوڑ کا یہ نتیجہ نکلا کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اور دارالمصنّفین کے درمیان یہ معاہدہ طے پا گیا کہ دارالمصنّفین کی ایک سو پندرہ مطبوعات نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان میں شائع کرے گا اور ان کے حقوقِ طباعت کے حصول کا معاوضہ پندرہ لاکھ روپے دارالمصنّفین کو ادا کیا جائے گا۔ ۳۰۔ اگست ۱۹۷۶ء کو اس معاہدے کی باقاعدہ تقریب نیشنل بک فاؤنڈیشن کے کراچی آفس میں منعقد ہوئی جس پر سید صباح عبدالرحمان نے دارالمصنّفین کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دستخط کیے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سید صباح الدین عبدالرحمان کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں میں محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق کی کتاب ''الفہرست'' کا ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر چکا تھا۔ یہ کتاب ضروری حواشی اور اشاریے سمیت تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور مصنف کی وفات (۳۹۰ھ) تک کے علوم وفنون، تصنیفات وتالیفاف اور مصنفین ومؤلفین کے سلسلے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وقت یہ ترجمہ کتابت کے مرحلے سے نکل کر طباعت کی منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ اکرام صاحب کسی اہلِ علم سے میرا تعارف کراتے وقت الفہرست کے ترجمے کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے بھی اس کا ذکر کیا، اور وہ ازراہِ نوازش اس سے خوش ہوئے۔

سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کے میزبان بھی ان کے ساتھ تھے جو ان کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور ملتان روڈ پر چوبرجی کوارٹرز (ورجہ اے) میں سکونت پذیر تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر کھانے یا چاے کے لیے غریب خانے پر تشریف لے جانے کی زحمت گوارا فرماسکیں تو شکرگزار ہوں گا۔ فرمایا بہت مصروف ہوں، مختلف حضرات سے ملاقاتوں کا پروگرام کچھ اس قسم کا ہے کہ وقت نکالنا ممکن نہیں۔ البتہ تم آج رات آٹھ بجے میرے پاس آؤ اور میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ چند منٹ کی پہلی ملاقات میں اس عاجز کو اس اعزاز کا مستحق گردانا ان کی بے حد مہربانی تھی۔ میں وقت مقررہ پر پہنچا۔ ان کے ساتھ کھانا کھایا اور بہت سی باتیں سننے کا شرف حاصل ہوا۔

انھوں نے بتایا کہ اعظم گڑھ شہر اور گردونواح کے لوگ دارالمصنفین کے ارکان ورفقا کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان کے علم وتحقیق میں منہمک رہنے کی بنا پر انھیں ہندو لوگ ''علمی بھکشو'' کہتے ہیں۔

واپس جا کر ''معارف'' کی کئی قسطوں میں سید صاحب موصوف نے پاکستان کا سفرنامہ تحریر فرمایا، جس میں ادارہ ثقافت اسلامیہ اور اس کے رفقا کا تذکرہ بڑی فراخ حوصلگی سے بہترین اسلوب میں کیا۔ ''الفہرست'' کے ترجمے اور حواشی وغیرہ کا ذکر بھی فرمایا...... بعض معاملات میں میری ان سے خط وکتابت بھی رہی اور ان کے چند خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں پاکستان آئے تو دو مرتبہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں تشریف لائے اور اس مرتبہ بھی سفر پاکستان کی تصنیفات ''معارف'' میں شائع ہوئیں۔ مولانا حنیف ندوی نے اس وقت تک ادارے میں جو کام کیا تھا، اس کی تفصیل اور نوعیت بیان کی اور پھر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے دور طالبِ علمی کے بارے میں لکھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے ریکارڈ میں ان کے زمانۂ طالب علمی کا ذکر بہت عمدہ الفاظ میں مرقوم ہے۔ لکھا ہے کہ پنجاب کے شہر گوجراں والا سے تعلق رکھنے والا محمد حنیف بڑا ذہین اور لائق طالبِ علم ہے۔ عربی ادبیات میں اس طالبِ علم کو خاص طور سے دلچسپی ہے اور دارالعلوم ندوۃ العلما کے تمام طلبا پر عربی ادبیات میں اسے فوقیت حاصل ہے۔ یہ ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء کی تحریر ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپریل ۱۹۷۱ء میں بھی لاہور آئے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر تشریف لائے تھے۔ اس موقعے پر میں نے ان سے مولانا شبلی کی "الفاروق" کے متعلق بعض باتیں دریافت کی تھیں جو انھوں نے نوٹ کر لی تھیں، اور اعظم گڑھ جا کر وہ ان کا جواب دینا چاہتے تھے۔ لیکن یہ کاغذ ان سے کہیں گم ہو گیا تھا۔ مندرجہ ذیل مکتوب گرامی میں انھوں نے مجھے وہ باتیں دوبارہ لکھ کر بھیجنے کو کہا۔ میں نے تعمیل ارشاد کی تو پھر اس کا جواب مجھے نہیں ملا۔ ان کا یہ خط یہاں درج کیا جا رہا ہے جو دارالمصنفین کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا تھا۔

۱۲۔ مئی ۱۹۷۱ء

مکرمی، السلام علیکم!

یاد ہوگا کہ گزشتہ دسمبر میں آپ لوگوں سے لاہور کے قیام میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں آپ نے مولانا شبلی کی الفاروق کی کچھ تحقیقی فروگزاشتوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ وہ میں نے کہیں نوٹ کر لیا تھا، لیکن وہ کاغذات گم ہو گئے ہیں۔ آپ سے عرض ہے کہ وہ مجھ کو لکھ کر بھیج دیں۔ تاکہ میں یہاں باضابطہ طور پر مطالعہ کر کے اس پر اپنی رائے کا اظہار کر سکوں۔ ممکن ہے کہ اپنے سفرنامے میں ذکر کردوں جو معارف میں چھپ رہا ہے۔ معلوم نہیں معارف آپ لوگوں تک پہنچ رہا ہے کہ نہیں۔ جون کے معارف میں آپ لوگوں کا ذکر خیر ہے۔ آپ جلد از جلد جواب دیں۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ خدا کرے آپ ہر طرح مع الخیر ہوں۔

ادارہ کے تمام لوگوں سے میرا بہت بہت سلام مسنون پہنچا دیں۔

والسلام صباح الدین عبدالرحمان

اس خط کے علاوہ بعض معاملات سے متعلق دو خط انھوں نے پھر تحریر فرمائے، جو اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت تلاش کے باوجود میرے کاغذات سے دست یاب نہیں ہوئے۔

سید صباح الدین عبدالرحمان کو اللہ نے بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا اور تحقیق و تدقیق میں ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ وہ علامہ سید سلیمان ندوی کے قریبی عزیز اور تربیت یافتہ تھے۔

وہ ۱۰۔نومبر ۱۹۸۷ء کو اپنے مسکن دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ کئی دن مختلف علمی کاموں اور میٹنگوں میں مشغول رہے۔ ۱۸۔نومبر کی دوپہر کو اپنے ایک رفیق سید شہاب الدین دیسنوی کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلما سے بذریعہ رکشہ لکھنؤ کی قدیم ترین درس گاہ فرنگی محل جارہے تھے کہ ڈالی گنج کے پل پر پہنچے تو اچانک رکشہ ایک آوارہ گائے سے ٹکرا گیا اور وہ رکشے سے نیچے گر پڑے۔ سر اور دماغ میں اتنی شدید چوٹ آئی کہ بے ہوش ہو گئے اور اسی حالت میں اسپتال پہنچا دیے گئے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی ان کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

اسی وقت اس سانحہ کی اطلاع ٹیلی فون سے ان کے گھر دارالمصنّفین (اعظم گڑھ) پہنچا دی گئی۔ ڈھائی بجے ہندوستان ریڈیو (لکھنؤ) سے ان کی وفات کی خبر نشر ہوئی جس سے ایک کہرام بپا ہو گیا۔

اسپتال سے ان کی میت دارالعلوم ندوۃ العلما میں لے جائی گئی، جہاں شام کے وقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور بے شمار لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ اس کے بعد ندوۃ العلما کے اساتذہ و طلبا میت کو ٹرک میں رکھ کر لکھنؤ سے اعظم گڑھ کو روانہ ہوئے اور طلوع فجر سے پہلے چار بجے کے قریب وہاں پہنچے۔

۱۹۔نومبر کو ساڑھے نو بجے صبح دارالمصنّفین میں دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھائی گئی، جس میں اعظم گڑھ شہر اور قرب و جوار کے ہزاروں مسلمان شریک ہوئے۔ اس موقعے پر ہندو بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ دس بجے صبح ان کی وصیت کے مطابق علامہ شبلی کے پہلو میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی بھی ۱۸۔نومبر کو فوت ہوئے تھے۔

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم وادخلھم جنت الفردوس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میاں عبدالمجید مالواڈا

(وفات ۲۲۔ جون ۱۹۹۲ء)

لمبا قد، متناسب جسم، گندمی رنگ، خشخشی داڑھی جسے سیاہ اور سفید بالوں کا خوب صورت مجموعہ کہنا چاہیے۔ چہرے پر معصومیت کے آثار نمایاں، اونچی پیشانی، کشادہ سینہ، دل اخلاص کی دولت سے مالا مال۔ شلوار قمیص پہنے ہوئے، سر پر قراقلی ٹوپی، ادب واحترام کا پیکرِ متحرک۔ یہ تھے وہ میاں عبدالمجید، جنھیں ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کے قیام کے وقت اس کے ناظم مالیات بنایا گیا تھا۔

میاں عبدالمجید لاہور کی ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور برادری میں ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو بے حد تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کسی زمانے میں لاہور کے علاقہ مصری شاہ کی تقریباً تمام زمین ان کی ملکیت تھی۔ ان کے پردادا کا نام حاجی رحیم بخش تھا جو پنچایتی قسم کے متقی بزرگ تھے۔ مصری شاہ کا ''رحیم روڈ'' انھی کے نام سے موسوم ہے۔

حاجی رحیم بخش کے بیٹے مولوی الٰہی بخش وکیل تھے، جنھوں نے دین داری اور پرہیز گاری میں بڑی شہرت پائی۔ وہ بہت اچھے مناظر بھی تھے۔ عیسائیوں پادریوں سے مختلف مقامات میں انھوں نے مناظرے کیے اور ہر مناظرے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔ مصری شاہ کے الٰہی بخش پارک کا نام انھی کے نام پر رکھا گیا۔ وہیں ان کا قبرستان ہے اور وہ وہیں مدفون ہیں۔

مولوی الٰہی بخش کا ذکر لاہور کی بعض دینی اور رفاہی سرگرمیوں کے سلسلے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ہفت روزہ ''اہل حدیث'' کی مختلف اشاعتوں میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ ان کے ساتھ حضرت حافظ محمد لکھوی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ دونوں بزرگ ہم عصر تھے اور خدمت دین اور خدمت خلق میں مشغول رہتے تھے۔ مولوی الٰہی بخش کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایت کے مطابق وہ دلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین کے حلقۂ درسِ حدیث میں شامل رہے تھے۔ مولوی الٰہی بخش اپنے دور کے مشہور وکیل تھے۔ وکالت کے سلسلے میں ہوشیار پور چلے گئے تھے۔ پھر ۱۹۱۹ء میں وہاں سے لاہور آئے۔ ۱۱۔ جون ۱۹۲۰ء کو فوت ہوئے۔

مولوی الٰہی بخش وکیل کے فرزند گرامی میاں عبدالعزیز مالواڈا جنھوں نے ۱۸۹۶ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ نہ صرف لاہور کے بلکہ پورے متحدہ ہندوستان کے معروف قانون دان اور مشہور سیاسی رہنما تھے۔ ان کی شہرت وعظمت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے بڑے بڑے تقریباً تمام زعما ان کے مکان بیروں یکی دروازہ آئے اور تھوڑے یا زیادہ عرصے کے لیے بہ طور مہمان ان کے یہاں رہے۔ علامہ اقبال، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ظفر علی خاں اور لاہور سے تعلق رکھنے والے دوسرے حضرات کا تو ان سے مقامی نوعیت کا رابطہ رہتا ہی تھا، ان کے علاوہ قائداعظم محمد علی جناح، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، نواب زادہ لیاقت علی خاں، پنڈت مدن موہن مالویہ، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ان کے بھائی بٹھل بھائی پٹیل، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور دوسرے کتنے ہی لیڈران کے مکان پر تشریف لائے اور ملک کے سیاسی مسائل پر باہم مشورے کرتے رہے۔

مذہبی اور دینی رہنماؤں میں مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا سید حسین احمد مدنی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی وغیرہ بہت سے بزرگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ ان کے ہاں رہتا تھا۔

برصغیر کے رہنماؤں کے علاوہ افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خاں بھی ان کے گھر آئے، پھر افغانستان کے ایک اور حکمران نادر خاں نے بھی ایک مرتبہ یہاں قیام کیا۔ مہتر آف چترال کو بھی میاں عبدالعزیز نے ایک یا دو مرتبہ اپنے یہاں ٹھہرایا اور لاہور کے بہت سے سرکردہ لوگوں سے ان کا تعارف کرایا۔

مشہور سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کو ہمارے قارئین میں سے ابھی بہت لوگ جانتے ہوں گے۔ وہ مسلمانوں کے خلاف انتہائی تعصب رکھتے تھے، لیکن میاں عبدالعزیز کو بے حد محترم گردانتے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہاتھ جوڑ کر نگاہیں نیچی کر کے ان کے سامنے کھڑے ہوتے اور انھیں گورو جی کہہ کر پکارتے تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ لاہور کے دو بڑے وکیلوں نے سیاست دانوں کے سیاسی نوعیت کے مقدمات ہمیشہ بلا فیس لڑے اور دونوں وکیل اہل حدیث تھے۔ وہ تھے میاں محمود علی قصوری اور میاں عبدالعزیز مالواڈا۔ میاں محمود علی قصوری کے متعلق مفصل مضمون میری کتاب ''قصوری خاندان'' میں چھپا ہے۔ میاں عبدالعزیز مالواڈا اور ان کے خاندان کے بارے میں تفصیلات کتابی شکل میں شائع ہوگئی ہیں۔ یہ ضخیم کتاب اردو بازار لاہور کے مشہور اشاعتی ادارے ''کتاب سرائے'' کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

مسجد شہید گنج (لاہور) کے کیس میں میاں عبدالعزیز مالواڈا کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اس کیس کی فائل ان کے پوتے میاں عبدالمعید کے پاس موجود تھی، جو میں نے دیکھی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں آزاد ہند فوج کے بعض فوجی افسروں کا کیس آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے میاں صاحب ممدوح نے لڑا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا مشہور کیس بھی جس کا تعلق سرکار کے منحرف رپورٹ لدھا رام سے تھا، میاں صاحب نے لڑا تھا۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی پر ۱۹۴۲ء میں قتل کا مقدمہ قائم ہوا تھا، اس کا دفاع بھی میاں صاحب موصوف نے کیا تھا، اور ان تمام مقدمات میں وہ کامیاب رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مقدمے انھوں نے فیس لیے بغیر لڑے۔

میاں عبدالعزیز کے نام ہندوستان اور دیگر ممالک کی بے شمار شخصیتوں کے کم و بیش پینتیس ہزار خطوط تھے جو میں نے ان کے پوتے اور میاں عبدالمجید کے بیٹے میاں عبدالمعید کے گھر میں دیکھے۔ ان خطوط کو دورِ گزشتہ کے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ کی حیثیت حاصل تھی۔ بعض امریکی سکالروں نے ان خطوط کو دیکھا تو نہایت متعجب ہوئے۔ وہ لاکھوں ڈالروں کے عوض ان خطوط کو میاں عبدالمعید سے خریدنا چاہتے تھے لیکن وہ اپنے جد امجد کے نام آئے ہوئے یہ خطوط فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان خطوط کو وہ مرتب کر کے چھاپنا چاہتے تھے۔ لیکن ۲۔ مارچ ۲۰۰۰ء کو وہ اچانک وفات پا گئے۔ معلوم نہیں اب وہ خطوط کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں بڑے میاں عبدالمنان ہیں اور چھوٹے میاں سلمان۔ دونوں اللہ کے فضل سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ خطوط شاید محفوظ نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھے ہوں گے۔ میاں عبدالعزیز مالواڈا لاہور کارپوریشن کے پہلے منتخب میئر تھے۔ ان سے قبل لاہور کا انگریز ڈپٹی کمشنر کارپوریشن کا پریذیڈنٹ ہوتا تھا۔

میاں صاحب ممدوح نے ۹۹ برس عمر پا کر ۲۸۔ جولائی ۱۹۷۱ء کو وفات پائی۔

میاں عبدالمجید انہی میاں عبدالعزیز مالواڈا بارایٹ لا کے فرزند ارجمند تھے جو ۱۲۔ جولائی ۱۸۹۹ء کو ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ میاں عبدالعزیز اس وقت ہوشیار پور میں وکالت کرتے تھے۔

میں نے میاں عبدالمجید کو پہلی دفعہ مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے قیام کے وقت ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو دیکھا تھا۔ اس سے تھوڑا عرصہ بعد میں مرکزی جمعیت کے ناظم دفتر کی حیثیت سے لاہور آیا تو میرا ان سے قریبی رابطہ پیدا ہوا۔ ان دنوں وہ اپنی ایک فلور مل چلا رہے تھے جو مصری شاہ میں تھی اور اس کا نام ''مجیدیہ فلور ملز'' تھا۔ تین چار دن کے بعد وہ مرکزی جمعیت کے دفتر (واقع شیش محل روڈ) تشریف لایا کرتے تھے، زیادہ تر سائیکل پر آتے تھے۔ ان کی چھوٹی سیاہ رنگ کی کار تھی جسے وہ خود ہی چلاتے تھے، کبھی کبھی اس کار پر بھی تشریف لایا کرتے تھے۔

وہ گرمیوں میں شلوار قمیص پہنتے تھے۔ سر پر خاکستری سے رنگ کی قراقلی ٹوپی رکھتے تھے۔ سردیوں میں کبھی گرم انگریزی سوٹ اور کبھی شلوار قمیص اور شیروانی زیب تن کرتے تھے۔ ہر قسم کا لباس ان کے جسم پر موزوں آتا تھا۔

انسان دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور اس کی باتیں یاد رہ جاتی ہیں، بالخصوص وہ باتیں جن سے سننے والوں نے اچھا اثر لیا ہو، یادوں کا ناقابل فراموش حصہ بن جاتی ہیں۔ اسی قسم کی بعض باتیں میاں عبدالمجید صاحب سے تعلق رکھتی ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

میاں صاحب لاہور کے کھاتے پیتے خاندان کے فرد تھے اور صالح بزرگ تھے۔ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے۔ چھوٹے بڑے سفر میں عام طور سے قطب نما اپنے پاس رکھتے تھے تاکہ نماز کے وقت اس کی مدد سے قبلے کی طرف رخ کر سکیں۔ اس معاملے میں اللہ نے ان کو بڑی فراست سے نوازا تھا۔ پشاور سے لے کر دہلی تک انھوں نے بے شمار مسجدوں کے صحیح رخ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نشان دہی کی تھی۔ مسجد کی تعمیر کے وقت بہت سے اہل حدیث اور دیوبندی و بریلوی حضرات انھیں لے جاتے اور وہ قطب نما کی مدد سے حساب لگا کر بتا دیتے تھے کہ قبلے کا صحیح رخ کیا ہے۔

قرآن مجید، کتب سیرت، ادعیہ ماثورہ اور مسائل دینیہ سے متعلق بزرگانِ دین کی تصانیف سے میاں صاحب کو بہت لگاؤ تھا اور ان کی نشرواشاعت میں وہ بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ اس کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

اس فقیر کی وساطت سے (۱۹۵۳ء میں) جب انھیں پتا چلا کہ علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی مشہور تصنیف ''رحمتہ للعالمین'' کا انگریزی ترجمہ ان کے بیٹے قاضی عبدالعزیز منصور پوری نے کیا ہے تو وہ نہایت خوش ہوئے اور اس کی اشاعت کے لیے کوشش کرنے لگے۔ اس سلسلے میں ایک ٹرسٹ بنایا گیا جس میں قاضی عبدالعزیز منصور پوری کے تین بیٹوں قاضی عبدالباقی، قاضی عبدالکبیر اور قاضی حسن معزالدین کے علاوہ مولانا عطاء اللہ حنیف، پروفیسر عبدالقیوم، مولانا محمد حنیف ندوی، خود میاں عبدالمجید اور ان سطور کا راقم شامل تھے۔ دس گیارہ ہزار روپے بھی جمع ہوگئے تھے جو خود میاں صاحب اور ایک اور صاحب نے عطا کیے تھے۔ یہ رقم اور اس میں ملا کر کچھ اور رقم ایک بینک میں جمع کرادی گئی تھی اور بینک سے رقم نکلوانے کے لیے دو آدمیوں کے دستخط بینک کو دیے گئے تھے، ایک میاں صاحب کے اور دوسرے اس فقیر کے۔

مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد میاں صاحب کے مکان پر ''رحمتہ للعالمین ٹرسٹ'' کے ارکان کی میٹنگ ہوتی تھی، لیکن افسوس ہے یہ انگریزی ترجمہ ٹرسٹ کی طرف سے شائع نہ ہوسکا۔ اس کے لیے وصول شدہ رقم باہم مشورے سے اسی قسم کی ایک اور کتاب کی اشاعت کے لیے ایک ادارے کو دی گئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ''رحمتہ للعالمین'' کی تینوں جلدوں کا انگریزی ترجمہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے بڑے پوتے قاضی عبدالباقی نے کئی سال کی بے حد محنت سے ایڈٹ کر کے ۲۰۰۳ء میں ''قاضی محمد سلیمان منصور پوری ٹرسٹ'' کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔ سلمان آرٹ پریس لاہور نے یہ کتاب اس کی شان کے مطابق نہایت خوب صورت انداز میں شائع کی ہے۔ پہلی جلد ۳۹۰ صفحات، دوسری جلد ۳۶۲ صفحات اور تیسری جلد ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

ایک بزرگ صوفی نذیر حسین تھے جو اگست ۱۹۴۷ء میں امرتسر کی سکونت ترک کر کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گوجراں والا میں آباد ہوئے تھے اور ان کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ گرم کمبل بنانے کا کام گوجراں والا میں غالباً پہلے پہل انھی نے شروع کیا تھا۔ بڑے وجیہ اور خوش مزاج وخوش اندام شخص تھے۔ کئی سال مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب صدر رہے جب کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی جمعیت کے صدر تھے۔ وہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے عقیدت منداور ان کے فرزندِ گرامی قاضی عبدالعزیز منصور پوری کے دوست تھے۔ رحمۃ للعالمین کے انگریزی ترجمے سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ لائل پور میں بھی ان کا کوئی کاروبار تھا۔ ۱۹۵۳ء کے مارچ کی بات ہے کہ میاں عبدالمجید نے مجھے فرمایا کہ ہم دونوں لائل پور جا کر صوفی نذیر حسین سے رحمۃ للعالمین کے انگریزی ترجمے کی اشاعت کے بارے میں بات کریں۔ اس زمانے میں بذریعہ سڑک لاہور سے لائل پور جانے کا راستہ ایک ہی تھا اور وہ تھا شرق پور اور جڑاں والا کا راستہ۔

ہم لائل پور پہنچے تو صوفی نذیر حسین وہاں موجود نہیں تھے۔ وہ اپنے کاروباری سلسلے میں سرگودھا گئے تھے اور واپسی کا کچھ پتا نہ تھا۔ ہم اسی وقت لاہور کو روانہ ہوگئے۔ جڑاں والا کے قریب ہمارا گاؤں (چک نمبر ۵۳ گ ب) ہے وہاں آئے تو میں میاں صاحب سے اجازت لے کر گاؤں چلا گیا۔ یہ واقعہ انھیں زندگی کے آخری دور تک یاد رہا۔ کہا کرتے تھے کہ وہ سن بھی ۵۳ تھا اور تمھارا گاؤں بھی چک ۵۳ ہے۔ ہم مشترکہ احباب کی کسی مجلس میں ہوتے تو جس انداز میں میں نے گاؤں جانے کی ان سے اجازت لی تھی، وہی انداز اختیار کر کے یہ واقعہ بیان کرتے۔

ملاقات میں چند روز کا وقفہ پڑ جاتا تو مجھے گھر ٹیلی فون کرتے، میں موجود نہ ہوتا تو پوچھتے، ''۵۳ گئے ہیں۔'' یہ الفاظ وہ پیار کے لہجے اور مشفقانہ اسلوب میں کہتے۔

اسی سفر میں ہم لاہور سے لائل پور جاتے ہوئے کھنڈا موڑ کے قرب وجوار میں پہنچے تو بائیں جانب اشارہ کر کے بتایا کہ کسی زمانے میں وہ یہاں بھی رہے ہیں۔ وہاں انھوں نے کئی مربعے زمین ٹھیکے پر لی تھی اور اس کے انتظام کے سلسلے میں وہاں ان کی آمدورفت رہتی تھی۔

وفات سے بہت سال پیشتر انھوں نے لائل پور کے معروف خطاط صوفی عبدالرشید (مرحوم) سے قرآنِ مجید کی کتابت کرائی تھی۔ ۱۹۷۸ء (۱۳۹۸ھ) میں انھوں نے بہ صورت قرآن، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی ''تفسیر ثنائی'' کی اشاعت کا اہتمام کیا تو وہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتابت شدہ قرآن مجید اس میں لگا دیا گیا۔ مکمل قرآن مجید کے ساتھ مکمل تفسیر ثنائی کی اشاعت ان کا بہت بڑا دینی کارنامہ ہے۔ ۱۹۷۸ء سے لے کر اب تک یہ تفسیر ہزاروں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا انھیں یقیناً اجر عطا فرمایا ہوگا۔

یہ خدمت انھوں نے خالصتاً لوجہ اللہ انجام دی ہے۔ اس میں ان سطور کے راقم سے بھی وہ برابر مشورہ لیتے رہے۔ میں نے اس میں حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کے مختصر سوانح حیات بھی تحریر کیے ہیں۔ تصحیح وغیرہ کی خدمت بھی انجام دی۔

مولانا عطاء اللہ حنیف سے بھی میاں صاحب کا بہت تعلق تھا۔ اس تفسیر اور قرآنِ مجید کی اشاعت کے متعلق مولانا مرحوم نے ہر قدم پر ان کو بہترین مشورے دیے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب کی عربی تفسیر بھی جو ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' کے نام سے موسوم ہے، میاں صاحب عمدہ ٹائپ میں چھاپنا چاہتے تھے۔ وہ تفسیر ادارہ ثقافت اسلامیہ کی لائبریری میں موجود تھی۔ میاں صاحب نے مجھے کئی دفعہ کہا کہ میں حساب لگا کر انھیں بتاؤں کہ ایک ہزار کتاب کی طباعت پر کتنے روپے خرچ ہوں گے۔ لیکن افسوس ہے میں ان کے ارشاد پر عمل نہ کر سکا۔

مختلف اوقات و مواقع پر پڑھی جانے والی جو دعائیں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں اور کتبِ حدیث میں منقول ہیں جنھیں ''ادعیہ ماثورہ'' کہا جاتا ہے، ان کی نشر و اشاعت کا بھی انھیں بہت خیال رہتا تھا۔ ہم گناہ گاروں کے نزدیک یہ ان کی ایسی نیکی تھی، جس کا صلہ بارگاہِ خداوندی سے انھیں ضرور ملا ہوگا۔

کسی زمانے میں ''فقہ محمدیہ'' ایک مشہور کتاب تھی جو سات جلدوں پر مشتمل تھی اور جس میں مندرج مسائل احادیث رسول ﷺ کے مطابق اور مسلکِ اہل حدیث سے ہم آہنگ تھے۔ اس کے مصنف مولانا محی الدین لاہوری تھے جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ یہ کتاب متعدد مرتبہ لاہور اور کان پور وغیرہ مختلف شہروں میں شائع ہوئی تھی اور بہت پڑھی جاتی تھی۔ پہلے یہ کتاب عام تھی۔ پھر کم یاب ہوئی، اب بہت مدت سے نایاب ہے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف نے میاں عبدالمجید کو اس کتاب کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشاعت کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ اگرچہ اس میں حوالوں کا التزام کیا گیا ہے تاہم بہت سے مقامات پر حوالوں کی ضرورت ہے۔ ہر جگہ جدید انداز سے حوالے دینے چاہئیں۔ اس کے لیے انھوں نے مولانا ابوبکر صدیق اور میرا نام تجویز کیا۔ میں نے تو اپنی تصنیفی مصروفیات کی بنا پر معذرت کردی لیکن ابوبکر صدیق نے خاصا کام کردیا تھا۔ میاں صاحب کو میرے متعلق جو ''حسنِ ظن'' تھا اس کی بنا پر حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے مشورے سے تمام مسودہ میرے سپرد کردیا تھا، مگر افسوس ہے کہ یہ اہم کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ترجمہ قرآن میں جن مقامات پر لغزش کھائی ہے میاں صاحب چاہتے تھے کہ اس کی نشان دہی کردی جائے اور بتایا جائے کہ صحیح ترجمہ اور اس کا اصل مطلب کیا ہے۔ اس خدمت کے لیے بھی وہ اس فقیر کو ''قابلِ اعتماد'' قرار دیتے اور باربار اصرار فرماتے تھے کہ میں یہ کام مکمل کردوں تاکہ وہ اسے رسالے کی صورت میں چھپوادیں۔ لیکن افسوس ہے میں ان کے اس حکم کی بھی تعمیل نہ کرسکا۔

اصل بات یہ ہے کہ تفسیر ثنائی کے سلسلے میں تو میں نے ان کے ساتھ پورا تعاون کیا اور اس کے لیے وہ اپنے کسی پوتے کے ساتھ میرے پاس بار بار ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی اور میرے گھر میں تشریف لاتے رہے جس کا مجھے بے حد احساس تھا لیکن بعض دیگر علمی معاملات میں اپنی مصروفیات کی بنا پر میں انھیں زیادہ وقت نہ دے سکا اور میری مصروفیات کا انھیں احساس بھی تھا۔ اس کا ذکر بھی وہ بعض حضرات سے کیا کرتے تھے، جس کا مجھے پتا چل جاتا تھا۔ میرے نزدیک وہ صالح ترین اور مخلص ترین شخص تھے۔ اب وہ مجھے یاد آتے ہیں اور ان کا پُرصداقت جذبۂ خدمتِ دین ذہن میں آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ میں ان کے اکثر ارشادات کی تعمیل نہ کرسکا۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کئی سال سے ان کی قوتِ بصارت بھی ختم ہوگئی تھی اور ثقلِ سماع کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ کان میں آلۂ سماعت لگائے رکھتے تھے۔ پھر آلۂ سماعت نے بھی کام دینے سے انکار کردیا تھا۔ جب تک آلۂ سماعت کے ذریعے سے تھوڑا بہت سننے کا سلسلہ جاری رہا، وہ چھوٹا سا ریڈیو کان پر رکھ لیتے اور خبریں اور اسلامی نوعیت کے پروگرام سنتے۔ مجھے عام طور پر ٹیلی فون کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بتاتے کہ کل فلاں موضوع پر تمھاری تقریر سنی تھی اور آج اتنے بجے فلاں موضوع پر سنی۔

اگر ان کے نقطہ نظر کے مطابق کوئی ریڈیو مقرر کہیں غلطی کا ارتکاب کرتا تو مجھے اس کی اطلاع دیتے اور فرماتے کہ میں اس پروگرام کے پروڈیوسر یا مقرر کو بتادوں کہ اس کی فلاں بات صحیح نہیں ہے۔ اگر ریڈیو کا کوئی شخص قرآن مجید کا کوئی لفظ صحت سے نہ پڑھ پاتا یا کسی حدیث کا ترجمہ میاں صاحب کے خیال کے مطابق صحیح نہ ہوتا تو فوراً ٹیلی فون کرتے کہ میں اس کو توجہ دلاؤں۔ یعنی ریڈیو والوں کو صحیح بات بتانے کا ذریعہ انھوں نے اپنے طور پر اس فقیر کو قرار دے رکھا تھا۔

دورِ گزشتہ کے بہت سے واقعات میاں عبدالمجید کے ذہن میں محفوظ تھے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کسی زمانے میں ان کا گھر ملک اور بیرون ملک کے بے شمار شخصیتوں کی میزبانی کا شرف حاصل کر چکا تھا (یہ محل نما مکان یکی دروازہ کے باہر تھا۔ اب یہ مالواڈا کمپلیکس کی شکل اختیار کر گیا ہے) میاں صاحب عہدِ رفتہ کی باتیں بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد بارہا ان کے گھر تشریف لائے۔ ان کی تشریف آوری کے موقعے پر اس عہد کے متعدد بڑے لوگ ان سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔ علامہ اقبال اور ان کے دوست خاص طور پر مولانا کے پاس تشریف لاتے اور مختلف مسائل پر بحثیں ہوتیں۔

ہال کمرے میں پڑے ہوئے بعض صوفوں پر ہاتھ لگا کر میاں صاحب کہا کرتے تھے کہ ایک موقعے پر مولانا آزاد آئے تو علامہ اقبال یہاں بیٹھے تھے۔ سر شہاب الدین یہاں تشریف فرما تھے اور جب لوگ زیادہ ہو گئے تو مولانا کے کہنے سے صوفے اٹھوا دیے گئے اور سب لوگ نیچے قالینوں پر بیٹھ گئے۔

اب میاں عبدالمجید کی صرف باتیں یاد رہ گئی ہیں، وہ بھی ان لوگوں کو یاد ہیں جن کا ان سے کچھ تعلق رہا ہے۔ ۷۔ اپریل ۱۹۸۸ء کو میری لڑکی سمیہ زیرک کی شادی ہوئی تو میاں صاحب اپنے ایک پوتے کے ساتھ تشریف لائے۔ وہ نابینا ہو گئے تھے اور سنتے بھی بہت اونچی آواز سے تھے۔ انھوں نے بچی کو تفسیر ثنائی والے قرآن مجید کا ہدیہ عطا فرمایا اور دعا کی۔ نکاح مبارک مسجد کے خطیب مولانا فضل الرحمٰن ازہری نے پڑھایا تھا۔ میاں صاحب دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے رہے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ان سے کہا کہ ہم لوگ دعا کر چکے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں تو انھوں نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دعا ختم کی۔

علمائے کرام کی وہ بہت عزت کرتے تھے، لیکن ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ بڑے بڑے القاب لگانے کے عادی نہ تھے۔ صرف ''مولوی صاحب'' کہہ کر پکارتے تھے، مثلاً مولوی ثناء اللہ صاحب، مولوی ابراہیم صاحب، مولوی عبدالواحد غزنوی صاحب، مولوی داؤد غزنوی صاحب وغیرہ۔ لفظ مولانا کا لاحقہ میں نے ان سے صرف مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے سنا۔

میاں صاحب کا کتب خانہ بہت سی نایاب وکم یاب کتابوں پر مشتمل تھا۔ مولانا ثنا اللہ صاحب امرتسری کے اخبار ''اہل حدیث'' کی اکثر فائلیں مجلد صورت میں ان کے کتب خانے میں محفوظ تھیں۔ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کو کہیں سے اخبار ''اہل حدیث'' کا کوئی شمارہ مل جاتا تو میاں صاحب کے اس اخبار سے دلی تعلق کی بنا پر وہ شمارہ ان کے گھر پہنچا دیتے تھے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین کے ابتدائی طباعت کے نسخے بھی (جواب تقریباً نایاب ہیں) ان کے کتب خانہ میں موجود تھے۔

میاں صاحب کسی شخص سے متعلق بات چیت میں انتہائی محتاط تھے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ ان کی کسی بات یا ان کے طرزِ عمل سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ کسی مستحق کی اعانت کرتے تو اس کا طریقہ یہ تھا کہ کسی شخص کو اس کا پتا نہ چلے۔ جمعیت اہل حدیث کے فنڈ میں بھی وہ اسی انداز سے اپنا حصہ ڈالتے تھے کہ جو کچھ دینا ہے خاموشی سے دے دیا۔ ان کے زمانۂ نظامتِ مالیات میں جمعیت کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ بعض مواقع پر وہ اپنی گرہ سے اچھی خاصی رقم ادا کرتے اور اس کی واپسی کا خیال دل سے نکال دیتے۔ اخبار ''الاعتصام'' کے انھوں نے کتنے ہی خریدار بنائے اور بعض حضرات کی طرف سے سالانہ زرِ خریداری وہ خود ہی ادا کر دیتے تھے۔

۱۹۵۳ء میں اخبار کے مندرجات مضامین اور مالیات پر غور کرنے کی غرض سے ایک بورڈ بنایا گیا تھا جو مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا ظفر اقبال، مولانا محمد علی قصوری، مولانا عطاء اللہ حنیف، میاں عبدالمجید اور ان سطور کے راقم پر مشتمل تھا۔ ہر مہینے اس بورڈ کی میٹنگ میاں صاحب کے مکان پر ہوتی تھی۔ مالیات کے سلسلے میں کوئی مسئلہ پیش آتا تو بورڈ کے ارکان میں سے کوئی صاحب کہہ دیتے کہ اس پر غور کرنا میاں صاحب کی ذمہ داری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ میاں صاحب خاموش ہو جاتے اور مسئلہ حل ہو جاتا۔ کئی سال اسی طرح معاملہ چلتا رہا۔ کسی طرف سے اخبار یا جمعیت کے لیے انھیں تھوڑی بہت رقم موصول ہوتی تو فوراً بینک میں جمع کرا دیتے۔ اخبار اور جمعیت کے الگ الگ اکاؤنٹ تھے جو پاکستان سنٹرل کوآپریٹو بینک میں کھولے گئے تھے۔ بینک سے رقم نکلوانے کے لیے چیک پر مولانا داؤد غزنوی اور میاں صاحب (دونوں) کے دستخط کرائے جاتے تھے۔

جماعت سے تعلق رکھنے والوں کا میاں صاحب بہت خیال رکھتے اور ان کی غمی خوشی میں شریک ہوتے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی نے گوجرانوالا میں وفات پائی تو لاہور سے جماعت کے بے شمار لوگ ان کے جنازے میں شرکت کے لیے گوجرانوالا گئے۔ میاں صاحب بھی اپنے احباب و متعلقین کے ساتھ شریک جنازہ ہوئے۔

چودھری عبدالقادر کا تعلق ساہی وال (منٹگمری) سے تھا۔ وہ مرکزی جمعیت کے زمانہ قیام سے جمعیت سے وابستہ تھے اور نہایت مخلص اور ملنسار بزرگ تھے۔ ان کا ساہیوال میں انتقال ہوا اور ہمیں پتا چلا تو لاہور سے ہم پانچ آدمی میاں صاحب کی گاڑی سے ساہی وال پہنچے اور جنازے میں شرکت کی۔ تدفین کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے۔ وہ پانچ آدمی تھے۔ (۱) مولانا عطاء اللہ حنیف (۲) میاں عبدالمجید (۳) مولانا محی الدین سلفی (۴) میاں عبدالمعید اور (۵) ان سطور کا راقم عاجز۔ گاڑی میاں عبدالمعید چلا رہے تھے۔ ان پانچ میں سے صرف یہ فقیر زندہ ہے۔ چار اپنی اپنی باری سے سفر آخرت اختیار کر گئے ہیں۔

میاں عبدالمجید کے چار بیٹے تھے، جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ میاں عبدالوحید، میاں عبدالمعید، میاں عبدالواجد اور میاں عبدالواحد! ان میں سے میاں عبدالواحد زندہ ہیں اور تین اس ترتیب سے وفات پا گئے ہیں۔ میاں عبدالمعید ۲۔ مارچ ۲۰۰۰ء کو، میاں عبدالواجد ۱۳۔ نومبر ۲۰۰۳ء کو اور میاں عبدالوحید ۲۳۔ جنوری ۲۰۰۶ء کو فوت ہوئے۔

قرآنِ مجید سے میاں صاحب کو انتہائی قلبی لگاؤ تھا اور وہ روزانہ قرآنِ پاک پڑھتے تھے، لیکن بصارت ختم ہوگئی تو دیکھ کر قرآن پڑھنا ممکن نہ رہا۔ اس کا انھیں بہت احساس تھا۔ رمضان المبارک میں بالخصوص اس پر اظہار افسوس کرتے لیکن پھر اس کا یہ حل نکالا کہ قرآن کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوٹی بڑی جو سورتیں زبانی یاد تھیں، وہ روزانہ دو تین مرتبہ پڑھ لیتے تھے۔

نمازِ جمعہ وہ مسجد مبارک میں پڑھا کرتے تھے اور اول وقت میں پہلی صف میں آ کر بیٹھ جاتے۔ جب تک بینائی قائم رہی ان کا یہ معمول رہا کہ جمعے کے بعد سب دوستوں سے ملتے اور ان سے خیر و عافیت پوچھتے۔ بے حد پیار سے بات کرتے۔ کڑوا بول وہ بول ہی نہ سکتے تھے۔

جز ندارد محبت سازم، نوا ندادر

رمضان المبارک میں نمازِ تراویح میاں صاحب اس مسجد میں پڑھتے تھے جو ان کے والدِ مکرم میاں عبدالعزیز کے نام سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کا نام ''عزیز مسجد'' ہے اور مصری شاہ میں عزیز روڈ پر ہے۔

اپنے مسلک سے میاں عبدالمجید کو بڑا پیار تھا۔ مولانا محمد متین ہاشمی دیوبندی عالم تھے جو طویل عرصے تک میاں صاحب کے مکان میں اقامت گزیں رہے تھے۔ ان سے اور ان کے بچوں سے میاں صاحب کو بڑی محبت تھی۔ کہا کرتے تھے کہ مولوی متین ہاشمی بے شک بڑے عالم ہیں لیکن ہیں حنفی، پکے دیوبندی۔ یعنی میاں صاحب کے نزدیک ان کا پکے دیوبندی اور حنفی ہونا ایک ''نقص'' تھا۔

مولانا محمد متین ہاشمی نے ۱۰۔ جنوری ۱۹۹۲ء کو وفات پائی۔ میاں صاحب اپنے بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ ان کے جنازے میں شریک تھے۔ (مولانا محمد متین ہاشمی کے حالات میں نے اپنی کتاب ''نقوشِ عظمت رفتہ'' میں لکھے ہیں)۔

میاں عبدالمجید نے پیر کے دن ۲۲۔ جون ۱۹۹۲ء کو صبح پونے چھ بجے وفات پائی اور اس سے چند منٹ بعد ان کے فرزند میاں عبدالمعید نے ٹیلی فون پر مجھے اس الم ناک واقعہ کی اطلاع دی۔ میاں صاحب عمر عزیز کی ۹۳ منزلیں طے کر چکے تھے۔ یعنی عیسوی حساب سے انھوں نے بیس دن کم ترانوے (۹۳) سال کو پہنچ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کی خبر سن کر نہایت افسوس ہوا اور بیتے دنوں کی بہت سی باتیں سطح ذہن پر ابھر آئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

میاں صاحب کا جنازہ نمازِ عصر کے بعد ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ان کی کوٹھی اسد جان روڈ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھاؤنی کے سامنے کے پارک میں مولانا فضل الرحمٰن ازہری نے پڑھایا، جس میں میاں صاحب کے اعزہ واقارب اور احباب و متعلقین کے علاوہ جماعت کے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہوئے۔

نماز جنازہ کے بعد ان کی میت ان کے آبائی قبرستان الٰہی بخش پارک (مصری شاہ) لے جائی گئی۔ وہاں ان کا جنازہ دوسری مرتبہ مولانا محمد سلیمان انصاری مرحوم نے پڑھایا۔ وہ پہلے جنازے میں بھی شامل تھے۔ شام کے ٹھیک سات بجے اس اعلیٰ کردار کے مالک اور صاحب تقوی شخص کو سپردِ خاک کردیا گیا۔

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

میاں عبدالمجید جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی خوبیوں کا علم ہر شخص کو نہیں ہوسکتا، انہی لوگوں کو ہوسکتا ہے، جن کا ان سے کچھ تعلق رہا ہو۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر پر صحبت نہیں رہی

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکیم عنایت اللہ نسیم

(وفات ۹۔ دسمبر ۱۹۹۴ء)

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ سے کوئی دو ہفتے بعد کی بات ہے، ایک دن مولانا محمد حنیف ندوی اور میں اپنے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) کے لان میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ اچانک آواز گرجی: ''السلام علیکم!'' ہم دونوں نے بہ یک وقت سر اوپر اٹھائے تو سامنے ایک صاحب کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر مولانا محمد حنیف ندوی اپنی نشست سے اٹھے اور ان سے بغل گیر ہو گئے۔ میں انھیں نہیں جانتا تھا لیکن تقاضاے اخلاق کے پیشِ نظر میں بھی آنے والے مہمان کے اعزاز میں مولانا کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا، چنانچہ مولانا سے ملنے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے میری طرف لپکے اور مجھے بھی ''بغل گیری'' کا سزاوار جانا۔ میں نے انھیں غور سے دیکھا، گورا سرخی مائل رنگ، بھربھرا چہرا اور گٹھا ہوا موزوں جسم، آنکھوں پر نظر کی عینک چڑھی ہوئی، ناک نقشہ توازن کے دل کش دائرے کے اندر، پورا قد، خشخشی سفید داڑھی میں سیاہ بالوں کی آمیزش، سر پر قراقلی ٹوپی، سفید لٹھے کی شلوار اور شیروانی زیب تن، بڑے وجیہہ اور خوب رو، جوانی ڈھل چکی تھی اور وہ وادی کہولت میں قدم رکھ چکے تھے، لیکن چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ اس شخص کا عہد جوانی بڑا ظالمانہ ہوگا اور اس کے عالم شباب نے بڑے بڑوں کے غرور کی گردن توڑی ہوگی۔

ٹٹ جاندے مان حسیناں دے
جدھروں وی سوہنا لنگھ جاندا

مولانا حنیف ندوی نے ان سے میرا تعارف کرایا تو پتا چلا کہ طویل مدت سے غائبانہ طور پر وہ مجھے جانتے ہیں۔ پھر مجھ سے کہا کہ یہ ہیں ہمارے پرانے اور مخلص دوست حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی۔ میں نے بھی ان کا نام سن رکھا تھا، لیکن بالمشافہ ملاقات کا موقع آج پہلی مرتبہ میسر آیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھیں دیکھ کر ان کے تین اور عزیز آنکھوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے، وہ تھے ملک ہدایت اللہ سوہدروی، ملک ابویحییٰ امام خاں نوشہروی اور حکیم عبداللہ نصر۔

سوہدرے کی ککے زئی برادری کے یہ وہ ارکان ثلاثہ تھے، جن سے اس فقیر کو عرصہ دراز سے نیاز مندی کا شرف حاصل تھا اور جو ادب و انشا اور علم و تحقیق سے گہرا رابطہ رکھتے تھے۔ ککے زئی ہونے کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک کے نام کے ساتھ لفظ ''ملک'' کا لاحقہ تھا، اس لیے ہم انھیں ''خانوادہ ملوک'' یا از راہ مزاح ''طبقہ ملائکہ'' سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ ان چاروں حضرات پر الگ الگ تفصیل سے لکھا جائے۔ اور ان کے بارے میں جو کچھ میں جانتا ہوں، اس سے دوسروں کو بھی مطلع کیا جائے، لیکن آج کی مجلس میں صرف حکیم عنایت اللہ نسیم کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے۔

ان کا وطن ''سوہدرہ'' ضلع گوجراں والا کی تحصیل وزیر آباد کا ایک مشہور اور پرانا قصبہ ہے اور وزیر آباد سے جانب مشرق تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر سیالکوٹ روڈ پر واقع ہے۔ اس قصبے میں ککے زئی برادری اچھی خاصی تعداد میں آباد ہے۔ اس برادری کے ایک رکن ملک باگے خاں کے تین بیٹے تھے...... ملک عبداللہ، ملک محمد حسین اور حکیم عبدالرحمان۔

ملک عبداللہ کی صرف ایک بیٹی تھیں، جن کا نام زینب بی بی تھا، وہ فوت ہو چکی ہیں۔ حکیم عبدالرحمان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ملک محمد حسین کے دو بیٹے تھے اور دو بیٹیاں تھیں، بڑے بیٹے کا نام عنایت اللہ اور چھوٹے کا نام ملک محمد ظفر ہے۔

عنایت اللہ نسیم جو آگے چل کر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی کے نام سے مشہور ہوئے، ستمبر ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا غلام نبی سے حاصل کی۔ میٹرک جوبلی ہائی سکول وزیر آباد سے کیا۔ وزیر آباد سے سوہدرہ پانچ میل کے فاصلے پر ہے اور حکیم صاحب آمد و رفت کا دس میل کا یہ فاصلہ روزانہ پیدل طے کرتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کا گاؤں ''کرم آباد'' سوہدرہ کے قریب ہے۔ آہستہ آہستہ حکیم صاحب کے مولانا ظفر علی خاں سے بھی تعلقات پیدا ہوئے۔

میٹرک پاس کر چکے تو مولانا ظفر علی خاں نے ان کو علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں داخل ہو گئے اور وہاں تعلیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طب کا پانچ سالہ نصاب مکمل کیا۔ علی گڑھ کے ماحول اور اندازِ تعلیم سے اثر پذیر ہو کر انھوں نے سیاسیات میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی اور تقریر و خطابت کے جوہر بھی بے دار ہونے لگے، چناں چہ ان دنوں دہلی میں آل انڈیا طبیہ کالجز کا ایک مباحثہ ہوا، جس میں حکیم صاحب نے بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت سے شرکت کی اور اول نمبر پر آئے، جس کے نتیجے میں گولڈ میڈل کے مستحق قرار پائے۔

حکیم صاحب کا مذہبی جذبہ، بڑا تیز تھا اور اسلام سے سچی محبت ان کے رگ و پے میں رچی ہوئی تھی۔ جن لوگوں سے وہ اظہار بے زاری کرتے تھے، ان میں قادیانی بھی شامل تھے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کا پرنسپل قادیانی تھا، جس کا نام عطاء اللہ بٹ تھا۔ حکیم نورالدین کے بیٹے عبدالسلام عمر بھی ان دنوں یونیورسٹی میں مقیم تھے۔ چودھری ظفر اللہ اس وقت وائسرائے کونسل کے ممبر تھے اور اپنے عہدے کی بنا پر بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ تقسیم اسناد کے جلسے کا موقع آیا تو مہمان خصوصی کے طور پر چودھری ظفر اللہ کو بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس پر حکیم عنایت اللہ نسیم اور ان کے ہم خیال لوگ بپھر گئے اور ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ حکیم صاحب پنجاب آئے، مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ملاقات کی، مولانا ظفر علی خاں کو صورت حال سے آگاہ کیا اور علامہ اقبال سے ملے اور معاملے کی نزاکت ان کے گوش گزار کی، پھر دہلی آئے اور جمعیت علمائے ہند کے اکابر علما سے رابطہ پیدا کیا اور اخبار ''الجمعیت'' میں چودھری ظفر اللہ کے خلاف اداریہ لکھوایا۔ لاہور میں اخبار ''زمیندار'' نے بھی یونیورسٹی کے ارباب انتظام کے فیصلے کی شدید مخالفت کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونیورسٹی کے اصحاب اختیار کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور چودھری ظفر اللہ کو جو دعوت دی گئی تھی، وہ واپس لینا پڑی، پھر یہ ہوا کہ چند روز کے بعد یونیورسٹی کے طلباء اور بعض اساتذہ سے مل کر قادیانیوں کے خلاف ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا، جس میں مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ بخاری کو دعوت دی گئی اور ان سے تقریریں کرائی گئیں۔ یہ جلسہ نہایت کامیاب رہا اور اس کے بعد قادیانیوں کو یونیورسٹی میں زور آزمائی کی جرات نہ ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تکمیل تعلیم کے بعد وہ طبیہ کالج میں استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے پر مامور ہوئے اور کئی سال اس منصب پر فائز رہے۔ اپنے اخلاق اور میل جول کی وجہ سے وہ طلباء اور اساتذہ میں بڑے مقبول اور ہر دل عزیز تھے، ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا اور وہ ہر ایک کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

سیاسیات کے میدان میں بھی انھوں نے خوب کام کیا۔ وہ مسلم لیگ کے حامی تھے اور مسلم لیگ کے ہر جلسے میں وہ شامل ہوتے تھے۔ تحریک پاکستان میں ان کی خدمات بہت نمایاں ہیں۔ تقریر اور تحریر دونوں اعتبار سے انھوں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ اس ضمن میں یہ بات میرے خیال میں لائق تذکرہ ہے کہ ہمارا کسی شخص سے اختلاف ہوا ہو تو اسے مختلف فیہ معاملے تک محدود نہیں رہنے دیتے، ہر معاملے اور ہر مسئلے میں اس سے اختلاف کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور پھر اس کے اظہار کے لیے نرم گرم ہر قسم کی زبان اور ہر نوع کا انداز اختیار کرنا اپنا فرض قرار دیتے ہیں۔ اور جو الزام ہمارے ذہن میں آسکتا ہے، اس پر عائد کرنا ہمارے نزدیک ملک وملت اور اسلام کی اصل خدمت گردانا جاتا ہے، لیکن حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی میں یہ بات نہ تھی۔ ان کا ذہن اس قسم کے معاملات سے پاک تھا۔ وہ جس معاملے میں اختلاف ہوتا، اسے اس معاملے تک محدود رکھتے، اس کو پھیلانے اور اس کی وجہ سے مخالف کی ہر بات کو غلط ٹھہرانے کے عادی نہ تھے۔ وہ مسلم لیگ کے مخالفوں کے بھی مداح تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے علم وکمال کا کھلے دل سے اعتراف کرتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالقادر قصوری اور دیگر غیر لیگی علماء وزعما کا انتہائی احترام سے تذکرہ کرتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ طبقہ علماء میں جن کے ساتھ ان کے دوستانہ علائق تھے، ان میں کوئی بھی مسلم لیگی نہ تھا، مثلاً مولانا محمد اسماعیل، مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف سے ان کے گہرے روابط تھے اور ان میں سے کسی کا رجحان مسلم لیگ کی طرف نہ تھا۔

اس اعتبار سے حکیم صاحب کی شخصیت قابل تعریف ہے کہ وہ اختلاف کی حدود کو خوب پہنچانتے تھے۔ اور اس فن میں مہارت رکھتے تھے کہ کس سے کس طریقے سے میل جول رکھنا چاہیے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے وطن (سوہدرے) آگئے تھے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی تھی لیکن جب مولانا امین احسن اصلاحی جماعت سے علیحدہ ہوئے تو وہ بھی اس سے الگ ہو گئے۔

حکیم صاحب ادب و شعر کا بھی ذوق رکھتے تھے اور تصنیف و تالیف سے بھی ان کو لگاؤ تھا۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں:

۱۔ مولانا ظفر علی خاں اور ان کا عہد (اس کتاب نے بڑی شہرت پائی اور مقبولیت حاصل کی۔)
۲۔ طبی فارما کوپیا (یہ کتاب طب کے موضوع پر ہے اور چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔)
۳۔ طب قدیم و جدید کا موازنہ (یہ کتاب بھی طب سے متعلق ہے۔)
۴۔ علی گڑھ کے تین نامور فرزند۔
۵۔ سیرتِ رسول ﷺ
۶۔ قائد اعظمؒ
۷۔ مردم دیدہ

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے مختلف رسائل و جرائد میں بہت سے مضامین سپرد قلم کیے۔ وہ بڑے محنتی اور مطالعے کے شائق تھے، ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے۔ حالات زمانہ سے باخبر رہنا اور سیاست کے نشیب و فراز کا علم رکھنا ان کے نزدیک ضروری تھا، چناں چہ وہ کئی اخبار روزانہ پڑھتے تھے اور وقت کی رفتار سے آگاہ تھے۔

معاشرتی اور سماجی بہود کے معاملات سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا، جس کا نام ''البدر سوشل ویلفیئر سوسائٹی'' رکھا، پھر البدر کمپلکس بنایا جس میں بچیوں کی تعلیم کے لیے دینی درس گاہ، دست کار سکول اور دارالمطالعہ وغیرہ کئی ادارے قائم کیے، جن کی نگرانی اور انتظام وہ خود ہی کرتے تھے۔

جیسا کہ ابتدائے گزارشات میں عرض کیا گیا، حکیم صاحب سے پہلی ملاقات ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ہوئی تھی۔ اس وقت پاکستان کو دولخت ہوئے اور مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کا روپ دھارے چند ہی روز گزرے تھے، اس لیے پاکستان کے لوگ انتہائی مغموم اور نہایت محزون تھے۔ حکیم صاحب پر بھی اس المیے کا بے حد اثر تھا اور وہ جتنی دیر یہاں رہے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس موضوع پر باتیں کرتے رہے اور اس وقت باتیں ہی ہو سکتی تھیں، اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پورے پاکستان میں یہ ہی موضوع چلا رہا تھا، جو بدرجہ غایت اذیت رساں تھا اور اذیت ہی کے لہجے میں لوگ اس پر گفتگو کرتے تھے۔

اس پہلی ملاقات میں ان سے جو روابط پیدا ہوئے، وہ ان کی زندگی کے آخری لمحے تک قائم رہے۔ وہ کئی دفعہ ہمارے دفتر تشریف لائے اور از راہ کرم متعدد خطوط اس فقیر کے نام تحریر فرمائے۔ وہ جب آتے ایک نوجوان ان کے ساتھ ہوتے تھے، جن کا نام عبدالقیوم ہے۔ ایک یا دو مرتبہ عبدالقیوم اکیلے بھی ان کا کوئی پیغام لے کر آئے۔

برصغیر کی بعض شخصیتوں سے متعلق ''قومی ڈائجسٹ'' اور دیگر رسائل وجرائد میں میرے شائع شدہ مضامین ان کی نظر سے بھی گزرتے تھے۔ ان مضامین کے سلسلے میں بذریعہ خطوط یا ملاقات انھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ یہ ان کی شفقت تھی جو میری تحریری مساعی میں اضافے کا باعث بنتی تھی۔ مضامین کے علاوہ انھوں نے اس فقیر کی تصنیفی خدمات کو بھی لائق اعتبار ٹھہرایا اور میری حقیرانہ علمی کوششوں کی تحسین فرمائی۔ اس ضمن میں جب بھی انھوں نے کچھ ارشاد فرمایا، میں نے جواب میں ان کا نیاز مندانہ شکریہ ادا کیا اور دعا کرنے کی درخواست گزار ہوا۔

اکثر پڑھے لکھے حضرات کے چہروں پر یبوست وعبوست کے آثار چھائے رہتے ہیں، لیکن حکیم صاحب میں یہ بات نہ تھی، وہ ہنس مکھ اور خوش کلام صاحب علم تھے۔ بعض دفعہ ''گستاخانہ لطیفہ'' بھی بڑے تحمل سے سنتے اور اس کی داد دیتے۔ اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں:

انھیں ثقل سماع کا عارضہ تھا اور خاصے بہرے ہوگئے تھے۔ آلہ سماعت ہر وقت کان میں جھومر بنا رہتا تھا، لیکن پھر بھی سننے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے ان کی معلومات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ واقعی ''بہرالعلوم'' ہیں۔ یہ لفظ سن کر پہلے تو متعجب ہوئے اور سمجھے کہ میں ''بحرالعلوم'' کہہ رہا ہوں، کہا میں اتنے بڑے مرتبے کا حامل کہاں ہوں! پھر جب میں نے ان کو یہ لفظ لکھ کر دیا اور ذہن میں واقعات کے ہجوم کی طرف توجہ دلائی تو خوب ہنسے، فرمایا: ''تم نے کہاں سے یہ لفظ تلاش کیا ہے، بہرالعلوم...... اردو لغت میں نیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اضافہ ہے۔'' کئی سال سے ان کا معمول تھا کہ لاہور آتے تو شیش محل روڈ پر مولانا عطاء اللہ حنیف سے ضرور ملتے۔ رات رہنا ہوتا تو انھی کے ہاں رہتے۔ ان کی آمد پر ازراہ کرم مولانا اس فقیر کو بھی اطلاع بھجوا دیتے اور میں حاضر ہو جاتا۔ مولانا کی وفات کے بعد بھی انھوں نے یہ وضع داری قائم رکھی۔ اب مولانا کے صاحب زادے (جنھیں میں اپنا ''برخوردار پیر'' کہا کرتا ہوں) حافظ احمد شاکر ان کی میزبانی کا فریضہ انجام دینے لگے۔ وہ بھی ان کی تشریف آوری پر راقم کو یاد فرماتے تھے اور ان سے بہت سی باتیں ہو جاتی تھیں۔

مولانا ظفر علی خان کے وہ نہایت مداح بلکہ عقیدت مند تھے۔ ان کے بے شمار اشعار انھیں حفظ تھے۔ ان کا کلام سنانے پر آتے تو سناتے ہی چلے جاتے، بلکہ سنانے کے لیے بہانے کے متلاشی رہتے۔ یوں ہی کسی نے ذرا سا اشارہ کیا، ان کی زبان تیزی کے ساتھ مولانا کے شعر اگلنے لگی۔

انھوں نے مجھے کئی دفعہ سوہدرے آنے کی دعوت دی اور اپنی قائم کردہ ''البدر سوشل ویلفیئر سوسائٹی'' کے بارے میں بھی تفصیلات بتائیں۔ اور اسے دیکھنے کے لیے ارشاد فرمایا، لیکن افسوس کہ میں تعمیل ارشاد نہ کر سکا۔

میں ان کی زندگی میں ان پر مضمون لکھنا چاہتا تھا۔ ایک دفعہ کچھ معلومات طلب کیں تو عزیزی عبدالقیوم کے ہاتھ بھیج بھی دیں، پھر ایک مرتبہ میری طلب پر بذریعہ ڈاک چند باتیں لکھ کر ارسال فرمائیں، لیکن افسوس کہ میں ان کی زندگی میں ان کے متعلق کچھ نہ لکھ سکا۔

اسے ایک حزینہ سے تعبیر کرنا چاہیے کہ ہم کسی کی زندگی میں تو کچھ لکھتے نہیں اور موت کے بعد صف تحریر بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں، یعنی اس کی موت کے انتظار میں رہتے ہیں کہ یہ مرے تو ہم اس پر کچھ لکھیں۔ ہم مردہ پرست لوگ ہیں، کوئی مر جاتا ہے تو اس کے متعلق واقعات بھی ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں اور قلم بھی فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں سب باتیں دبی رہتی ہیں۔ انجماد ذہن کی یہ بیماری نہایت خطرناک ہے۔ مرنے کے بعد ذہن کھلا اور ہم نے لکھا اس کا مرنے والے کو کتنے نفلوں کا ثواب ہوا۔ پنجابی محاورے والی بات ہوئی کہ سوئے ہوئے بچے کا منہ چوما، بچے کو لطف آیا نہ ماں کو!

حکیم صاحب مرحوم کا ۲۷۔ جون کو تحریر کیا گیا آخری خط مجھے جون ۱۹۹۴ء کے آخر میں ملا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خط کی تقریب یہ ہے کہ جون کے آخری ہفتے میں میری کتاب ''قصوری خاندان'' چھپی۔ یہ کتاب مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے خاندان کے حالات پر محیط ہے۔ یہ کتاب حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ حسن اتفاق سے حکیم صاحب کے صاحب زادے حکیم راحت نسیم صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ان کو یہ کتاب حکیم صاحب کو پہنچانے کے لیے دی۔ کتاب کے مطالعے کے بعد حکیم صاحب نے مجھے جو خط ارسال فرمایا اس کے الفاظ یہ ہیں:

''محترم و مکرم جناب اسحاق بھٹی! السلام علیکم! کتاب ''قصوری خاندان'' موصول ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم دے آمین! آپ نے نہ صرف قصوری خاندان بلکہ جماعت اہلِ حدیث کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ جی چاہتا ہے کسی وقت مل کر آپ سے زبانی گفتگو ہو۔ کچھ سنوں اور کچھ سناؤں، مگر بدقسمتی سے ارتھرائٹس کی شدت سے میں اب چلنے پھرنے سے ایک حد تک معذور ہوں۔ اگر کوئی صورت پیدا ہوئی تو ممکن ہے لاہور حاضر ہو کر کچھ عرض کر سکوں، بہرحال کتاب کی ترسیل پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

حکیم صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اور اس فقیر کے مشفق۔ ۹۔ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

(یہ مضمون ''قومی ڈائجسٹ'' لاہور، اپریل ۱۹۹۵ء سے لیا گیا ہے۔)

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاجی محمد رفیق زبیدی

(وفات ۲۔ نومبر ۱۹۹۶ء)

میرے زمانہ بچپن کے ایک دوست محمد رفیق زبیدی تھے جو ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور ہمارے شہر (کوٹ کپورہ) کے محلہ میاں اسماعیل میں رہتے تھے۔ ہمارے ہوش سے بہت پہلے ان کے والد حاجی خیرالدین اپنے اہل وعیال سمیت کلکتے چلے گئے تھے۔ وہ اس دور کے اچھے درزی تھے اور کلکتے جا کر وہ یہ ہی کام کرنے لگے تھے، جس میں اللہ تعالیٰ نے برکت پیدا کی اور انھوں نے خوب کمایا۔ کلکتہ سے وہ جاوا سماٹرا (انڈونیشیا) چلے گئے اور وہاں سے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ معلوم نہیں وہ کتنا عرصہ کلکتے رہے۔ یہ بھی پتا نہیں کہ جاوا سماٹرا میں ان کا قیام کتنے سال رہا۔ اس کا بھی علم نہیں کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں وہ کتنی مدت مقیم رہے۔ بس اتنا پتا ہے کہ ۱۹۳۳ء کے پس وپیش وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے وطن (کوٹ کپورے) واپس آئے۔ اس زمانے میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں تشریف لے گئے تھے اور میں ان کے حلقۂ درس میں شامل تھا۔ ایک دن ایک لڑکا ہمارے مختصر سے قافلۂ طلبہ میں آیا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ اس کے ماں باپ اور بہنیں سب حاجی ہیں اور یہ بھی حاجی ہے اور اس کا نام محمد رفیق ہے۔ پہلے یہ خاندان کہیں باہر رہتا تھا، اب یہ لوگ واپس آگئے ہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں چار پانچ سال بڑا تھا، لیکن قد وقامت میں چھوٹا تھا۔ ناظرہ قرآن مجید اس نے مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں پڑھا تھا۔ وہ عربی لہجے میں قرآن پڑھتا تھا جو ہمارے لیے بالکل ''اجنبی'' لہجہ تھا اور اس اجنبی لہجے کی سماعت میں بڑی کشش تھی۔ اسے سب حاجی کہتے تھے اور اذان کے وقت بعض نمازیوں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ہی (حاجی) اذان کہے۔ لیکن اس کے قد کے مطابق اس کی آواز پست تھی اور آواز میں بچپنے کی آمیزش بھی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چند روز میں میرا وہ گہرا دوست بن گیا تھا۔ وہ ہمارے گھر آتا تھا اور میں اس کے ساتھ اس کے گھر جاتا تھا۔ میرے والدین اس سے شفقت کا برتاؤ کرتے اور اس کے والدین اور دیگر رشتے دار مجھے پیار کا مستحق قرار دیتے تھے۔ ہم نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین'' اور اردو کی بعض کتابیں اکٹھے پڑھیں۔ صرف نحو اور حدیث کی بعض کتابوں میں بھی ہم دونوں ہم جماعت تھے۔ جنوری ۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے فرمان کے مطابق مولانا عطاء اللہ صاحب مرکز الاسلام تشریف لے گئے تو ہم بھی ان کے ساتھ گئے اور یہ پورا سال ہم وہیں رہے۔

سال ختم ہوا تو فیروز پور کی انجمن اہل حدیث کے ارکان مولانا عطاء اللہ حنیف کو مولانا محمد علی لکھوی کی اجازت سے فیروز پور لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ فیروز پور چلا گیا، لیکن حاجی رفیق کو مولانا عطاء اللہ حنیف نے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے نام رقعہ لکھ کر دیا اور وہ کھنڈیلہ چلے گئے۔ ایک سال وہاں رہے۔ اس کے بعد دہلی آکر مدرسہ زبیدیہ میں حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے اور ان ہی سے سند فراغت لے کر محمد رفیق زبیدی کہلائے۔

اب حاجی محمد رفیق کے متعلق کچھ مزید باتیں۔

مرکز الاسلام میں مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین دونوں سے حاجی رفیق کا دوستانہ تھا۔ ان کے قد و قامت کے مطابق ان کی چھوٹی سی کالی گرگابی تھی جو پرانی ہو کر وہیں پڑی رہتی تھی جہاں مسجد کے نمازیوں کی جوتیاں پڑی ہوتی ہیں اور ایک ان کا نیلے رنگ کا تہبند تھا، جسے چھوٹا ہونے کی وجہ سے ''تہمتی'' کہنا چاہیے۔ یہ تہمتی ان کے رہائشی کمرے میں لکڑی کے کیلے پر لٹکی رہتی تھی۔ یہ تو ایک سال کے بعد مزید تعلیم کے لیے کھنڈیلے چلے گئے تھے۔ اس کے بعد غالباً مرکز الاسلام ان کا جانا نہیں ہوا، لیکن میں فیروز پور کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا محی الدین اور معین الدین سے ملنے کے لیے مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد مرکز الاسلام چلا جاتا تھا۔ اس وقت ان کی پرانی گرگابی بھی وہیں پڑی ہوتی تھی اور ''تہمتی'' بھی اسی کیلے پر لٹکی ہوتی تھی۔ مولانا معین الدین نماز کے بعد اس جوتی میں ضرور پاؤں ڈالتے تھے۔ ان کا پاؤں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو اس میں نہیں ڈل سکتا تھا، البتہ پاؤں کا انگوٹھا اس میں آجاتا تھا۔ اس "تہمتی" کا مولانا معین الدین نے ایک دلچسپ نام رکھا تھا جو میں نے حاجی رفیق کو ان کی بیماری کے دنوں میں سنایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہا واقعی معین الدین نے صحیح نام رکھا تھا۔

۱۹۳۷ء میں فیروز پور میں آل انڈیا مجلس احرار کا جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس جلسے کے انتظام سے مولانا محمد علی لکھوی کا بہت زیادہ تعلق تھا۔ شدید گرمیوں کا موسم تھا کہ مرکز الاسلام کے طلبہ کو مولانا محی الدین کی قیادت میں جلسے کی تشہیر کے لیے قرب وجوار کے دیہات میں بھیجنے کا پروگرام طے پایا۔ دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا سے دو نہریں نکلتی تھیں۔ ایک کا نام نہر صادق آباد تھا جو بہاول پور کو جاتی تھی، یہ پختہ اینٹوں کی نہر تھی۔ اس نہر پر مرکز الاسلام کے طلبہ کا تشہیری قافلہ پہنچا تو گرمی کی شدت سے گھبرا کر حاجی رفیق نے نہانے کے لیے اس نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس نہر سے نکلنا کتنا مشکل ہے۔

اب لڑکوں نے شور مچا دیا حاجی مر گیا۔ حاجی ڈوب گیا۔ اتنے میں مولانا محی الدین لکھوی نے کوئی مضبوط کپڑا اس کی طرف پھینکا، اس نے ہوش وحواس قائم رکھے اور اس کپڑے کو پکڑا۔ پھر لڑکوں نے اسے کھینچا اور وہ نہر سے باہر آگیا۔ یہ نہایت خطرناک وقت تھا، لیکن اللہ نے اسے محفوظ رکھا۔

حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی اپنے عہد کے عالی مرتبت عالم دین اور بہت بڑے مدرس تھے۔ وہ رفیق پر بے حد شفقت فرماتے تھے اور گھر کے بہت سے کاموں کی انجام دہی انھوں نے رفیق کے سپرد کر رکھی تھی۔ وہ رفیق کو پیار سے "مٹا" کہا کرتے تھے۔ مٹا ادھر آؤ۔ مٹا یہ کام کرو۔

رفیق نے ایک مرتبہ بتایا کہ قصبہ کھنڈیلہ کے قریب دو خشک پہاڑیاں تھیں۔ ان کے درمیان پانی کا ایک نالا چلتا تھا جس کی گہرائی آدمی کی کمر سے کچھ اوپر تک تھی۔ ہندو اس نالے کے پانی کو پاک سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جس لڑکی کی شادی نہ ہوتی ہو یا جس عورت کا شوہر اچھا نہ ہو یا وہ ساس اور نند وغیرہ کے رویے سے تنگ ہو یا اولاد سے محروم ہو، وہ ہفتے کے روز اگر اس پانی میں سے کمر کے اوپر تک کپڑا اٹھا گزرے تو اپنے من کی مراد پائے۔ اس روز بہت سے اوباش لوگ یہ منظر دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہوجاتے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سادھوسنتوں اور پنڈتوں کے بھی اس دن وارے نیارے ہوتے تھے۔

مولانا کھنڈیلوی کے علم و فضل، ان کے طریقِ تدریس، علمائے کرام سے ان کے میل جول اور طلبہ سے ان کی شفقت کی رفیق صاحب بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک سال وہ وہاں رہے۔

دوسرے سال مولانا کھنڈیلوی کی اجازت سے حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی کی خدمت میں دہلی مدرسہ زبیدیہ میں چلے گئے اور مولانا ممدوح ہی سے فراغت کی سند لی۔ حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی کی فراوانیٔ علم اور تحقیقِ مسائل کے سلسلے میں رفیق نے ایک سے زائد مرتبہ بتایا کہ بعض مسائل کو سمجھنے کی غرض سے مفتی کفایت اللہ مرحوم ان کے پاس آیا کرتے تھے اور نہایت ادب سے دوزانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھتے تھے۔ دہلی کے اور بھی متعدد اہل حدیث اور غیر اہل حدیث اصحاب علم کی ان کی خدمت میں آمد و رفت رہتی تھی اور تمام علما بے حد مود بانہ انداز میں ان سے بات کرتے تھے۔

رفیق کو علما سے ملنے، ان کی باتیں سننے اور ان کی مجلسوں میں بیٹھنے کا بہت شوق تھا۔ مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے جلسوں میں جانے اور مقرروں کی تقریریں سننے کے بھی وہ شائق تھے۔ مطالعہ کا بھی انھیں ذوق تھا، تاریخی کتابیں خاص طور سے خریدتے اور پڑھتے تھے۔ یہ ان کا ہمیشہ معمول رہا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد رفیق نے کیا شغل اختیار کیا؟ یہ بھی سن لیجیے۔

مروجہ تعلیم سے غالباً وہ ۱۹۴۱ء میں فارغ ہوئے تھے۔ یہ دوسری عالم گیر جنگ کا زمانہ تھا۔ انھوں نے فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا۔ فوج متعدد محکموں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ رفیق فوج کے سمندری شعبے میں چلے گئے اور میرین ڈرائیور کے طور پر خدمات سرانجام دینے لگے۔ اس سلسلے میں کلکتہ، بمبئی اور دیگر علاقوں میں رہے۔ زیادہ عرصہ مولمین (برہما) میں گزرا۔ وہاں چھوٹا سمندری جہاز ان کے قبضے میں تھا جسے وہ چلاتے تھے۔ اردو میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔ بعض انگریز فوجی افسروں کو بھی اردو اچھی طرح لکھنے پڑھنے والوں کی ضرورت رہتی تھی۔ اس لیے انگریز افسران پر خوش تھے۔ ہندوستان فوجی افسروں کو بھی لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں ان کی ضرورت رہتی تھی۔ بعض انگریز افسر کہہ دیتے تھے کہ آئندہ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملک میں تمھاری حکومت قائم ہونے والی ہے۔ ہمارا دور اب چند روزہ ہے۔

۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو رفیق گھر آ گئے۔ یہاں آ کر مختلف کام کیے۔ اس وقت ریاست فرید کوٹ میں تحریک آزادی کے لیے پرجا منڈل قائم ہو چکی تھی۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے والد حاجی خیر الدین جو ریاست کی تحریک آزادی کے سلسلے میں تین سال قید کاٹ چکے تھے، دسمبر ۱۹۴۳ء میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے تھے۔ ہم نے حاجی رفیق کو ریاستی پرجا منڈل کا آفس سیکرٹری بنا دیا تھا، جب کہ میں اس کا جنرل سیکرٹری تھا اور گیانی ذیل سنگھ جو آزادیٔ ملک کے بعد ہندوستان کے منصب صدارت پر فائز ہوئے، ریاستی پرجا منڈل کے چیئرمین (یعنی پردھان) تھے۔

آزادیٔ ملک کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ان کا سب کو علم ہے۔ ہم لوگ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں میں آ گئے۔ حاجی رفیق بھی اپنے کنبے سمیت اسی گاؤں میں آباد ہو گئے۔ یہاں آ کر انھوں نے کئی کام کیے۔ ایک دفعہ لاہور میں ایک ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن یہ ملازمت صرف تین مہینے رہی۔ یہ تین مہینے وہ میرے پاس ہی رہے۔ اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ محکمہ انہار میں سرکاری ملازمت مل گئی۔ اس وقت ان کے افسر پاکستان کے مشہور ادیب وصحافی ڈاکٹر انور سدید تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے جو پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا، وہ صاف اور خوب صورت خط میں انھوں نے ان ہی حاجی رفیق سے لکھوایا تھا۔

ایک دفعہ رفیق صاحب نے اپنے گاؤں سے یونین کونسل کا الیکشن بھی لڑا تھا اور اس کے چیئرمین بھی منتخب ہو گئے تھے۔ پانچ یا چھ گاؤں ان کی چیئرمینی میں آتے تھے اور مختلف کام کرانے والوں کا ہجوم ان کے اردگرد رہتا تھا۔

اب رفیق کے والد حاجی خیر الدین کے بارے میں چند باتیں۔

جس زمانے میں حاجی خیر الدین کلکتہ میں درزی کا کام کرتے تھے، ان کی دکان پر ایک فقیر آیا اور اس نے ان سے ایک لمبا سا چغہ سلوایا۔ وہ سلائی کی اجرت دینے لگا تو حاجی خیر الدین نے اجرت نہیں لی اور کہا بابا جی! میرے لیے دعا کرنا۔ وہ فقیر وہیں بیٹھ گیا۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے لکڑیاں جلائیں۔ جب ان کے کوئلے بن گئے تو جیب سے تین دوائیں نکال کر ان کوئلوں پر رکھیں۔تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو وہ دوائیں سونے کی چھوٹی سی ڈلی بن چکی تھیں۔فقیر نے سونے کی وہ ڈلی حاجی خیرالدین کو دی اور چلا گیا۔ اس کے بعد حاجی خیرالدین نے اس کو بہت تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی خیرالدین کو کیمیاگری کا شوق پیدا ہوگیا جو ہمیشہ ان کا ساتھی رہا۔ان کی لکڑی کی ٹال تھی۔ وہیں ایک چھوٹا سا کچا کمرہ تھا، جس میں حاجی صاحب اپنا یہ شوق پورا کرتے تھے۔ جب دیکھو اس کمرے میں راکھ کا ڈھیر پڑا ہوتا تھا۔

حاجی خیرالدین شام سے تھوڑی دیر پہلے ٹال بند کر کے گھر کو روانہ ہوجاتے تھے اور مغرب کی نماز عام طور پر ہمارے محلے کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ وہاں نماز پڑھ کر گھر جاتے۔ میری عمر اس وقت بہت چھوٹی تھی لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ مغرب کی جماعت ہورہی تھی اور میں پہلی صف کے آخر میں بائیں جانب کھڑا تھا۔میرے بائیں جانب ایک آدمی کی جگہ باقی تھی، وہاں حاجی خیرالدین آکر کھڑے ہوگئے۔ ہم حالتِ قیام میں تھے اور پہلی رکعت تھی۔ میں نے نماز میں تین چار دفعہ ہاتھ اِدھر اُدھر ہلائے۔ سلام پھیرنے کے بعد دعا مانگ کر میں اٹھنے لگا تو حاجی خیرالدین نے مجھے بٹھالیا۔نہایت پیار سے کہا نماز میں اللہ کی طرف دھیان رکھنا چاہیے۔ بغیر سخت ضرورت کے جسم پر ہاتھ نہیں پھیرنے چاہئیں۔ تین دفعہ سے زیادہ مرتبہ ہاتھ ہلائے جائیں تو نماز میں نقص پیدا ہوجاتا ہے۔ حاجی صاحب کی وفات پر تقریباً پینسٹھ برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ نماز میں مجھ گنہگار کا اللہ کی طرف دھیان ہو یا نہ ہو، لیکن میں نے جسم پر ہاتھ پھیرنے سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہے۔

حاجی خیرالدین کو تحریک آزادی کے جرم میں ریاستی حکام نے ۱۹۳۹ء میں گرفتار کرلیا تھا۔ گرفتار شدگان میں گیانی ذیل سنگھ بھی تھے۔ اس کی مناسب تفصیل اپنی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' کے اس مضمون میں بیان کرچکا ہوں جو گیانی ذیل سنگھ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ ان لوگوں کو تین تین سال قید بامشقت ہوئی تھی اور پانچ پانچ سو روپے جرمانہ کیا گیا تھا۔ جرمانہ کسی نے ادا نہیں کیا تھا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی بنا پر چھ چھ مہینے مزید قید کاٹنا پڑی تھی۔

ان قیدیوں کو ۱۹۴۱ء کے آخر میں رہا کیا گیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جیسا کہ پہلے بتایا گیا حاجی خیرالدین کی لکڑی کی ٹال تھی۔ وہ حسب معمول ٹال بند کر کے گھر آئے۔ یہ ۱۹۴۳ء کے دسمبر کی بات ہے۔ صبح کو دیکھا تو حاجی صاحب دل کی دھڑکن بند ہو جانے کی وجہ سے وفات پا چکے تھے۔ اس نواح میں اس قسم کی یہ پہلی موت تھی۔ اس سے قبل یہ بیماری وہاں کسی نے نہ سنی تھی۔ سارے شہر میں شور مچ گیا کہ ایک شخص سویا ہوا وفات پا گیا۔ کتنے ہی لوگ ان کے گھر میں جمع ہو گئے۔ لیکن ان کے رشتے دار یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ ان کی موت واقع ہو گئی ہے۔ وہ یہی کہتے رہے کہ حاجی خیرالدین مرے نہیں، ان کا سانس بند ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کو سانس آنے کے بعد ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ سانس بند ہو جانے کا نام ہی موت ہے۔ ہسپتال میں ایک ڈاکٹر سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ ان کا دل فیل ہو گیا ہے اور یہ ایک بیماری ہے، جو ان کی موت کا باعث بنی ہے۔

ان کو دفن کر دینے کے بعد ان کے بعض رشتے دار کہتے رہے کہ ان کی قبر بولتی ہے اور وہ قبر کے اندر سے آوازیں دے رہے ہیں کہ میں زندہ ہوں، مجھے قبر سے نکالو۔ بعض لوگ قبر پر کان لگا کر کہتے بھی تھے کہ ان کی قبر سے آواز آرہی ہے۔ بہرحال حاجی خیرالدین دسمبر ۱۹۴۳ء میں وفات پا گئے۔

ان کی وفات سے دوسرے دن اچانک ان کے بیٹے رفیق آئے تو انھیں باپ کی وفات کا علم ہوا۔ وہ اس لیے آئے تھے کہ ان کے فوجی کیمپ سے ضلع جالندھر کا ایک فوجی بھاگ گیا تھا۔ اس کی تلاش کے لیے پنجاب کے تین فوجیوں کو بھیجا گیا تھا جن میں ایک رفیق تھے۔ یہ تینوں سب سے پہلے لاہور چھاؤنی آئے، وہاں فوجی کے فرار ہونے کی اطلاع دی اور دفتر سے دو دن کے لیے گھر جانے کی اجازت طلب کی جو دے دی گئی۔ ریلوے اسٹیشن سے اتر کر باپ کو سلام کرنے کی غرض سے لکڑی کی ٹال پر آئے تو وہ بند تھی، پتا چلا کہ حاجی صاحب وفات پا گئے ہیں۔ وہاں سے گھر گئے تو صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

میں ۲۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے لیے گھر سے نکلا تھا، رفیق صاحب ہم سے تقریباً ایک مہینا بعد ایک بڑے قافلے کے ساتھ پاکستان آئے۔ میں ان کو شرق پور میں شام کے بعد قافلے میں تلاش کرتا ہوا ملا۔ ان کے اہل وعیال ان کے ساتھ تھے۔ پھر وہاں سے قافلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے ہم تین دن کا سفر طے کر کے اپنے موجودہ گاؤں پہنچے۔ اس کے بعد کام کاج میں ہماری راہیں مختلف ہوگئیں۔ میں لاہور آ گیا۔ لیکن میرے ماں باپ، بہن بھائی اور رشتے دار اسی گاؤں میں رہے۔ میں گاؤں جاتا تو میرا زیادہ وقت رفیق کے ساتھ ان کے گھر میں گزرتا یا ہم دونوں جڑاں والا آجاتے جو ہمارے گاؤں سے تین میل (پانچ کلومیٹر) کے فاصلے پر ہے۔ یہاں دوستوں سے ملتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔ رفیق کو مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا۔ ان کی اچھی خاصی لائبریری تھی۔ میری ہر کتاب ان کے پاس تھی اور اس کا وہ دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۹۶ء کے آخر میں وہ بیمار ہوئے اور مجھے اطلاع پہنچی کہ جڑاں والا کے سرکاری ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں ہسپتال پہنچا تو ان کے کئی رشتے دار وہاں موجود تھے اور طبیعت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ دل پر حملہ ہوا ہے، لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ہسپتال میں میرے ساتھ باتیں کرتے رہے اور اٹھ کر غسل خانے بھی گئے۔ دورِ ماضی کی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ میں دوسرے دن لاہور آ گیا اور ان کو ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

۲۔ نومبر ۱۹۹۶ء کو وہ اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ قے آئی اور اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح یہ میرا بچپن کا جگری دوست اللہ کے دربار میں پہنچ گیا۔ مجھے ٹیلی فون کے ذریعے ان کی موت کی اطلاع ملی تو میں اپنے گاؤں پہنچا۔ ان کے گھر کے اندر ان کی میت پڑی تھی اور باہر صف ماتم پر لوگ بیٹھے تھے۔ ان کا بیٹا عبداللطیف راشد بھی وہیں تھا، لیکن لوگوں نے ان کی موت کا افسوس سب سے زیادہ مجھ سے کیا۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی اپنے قدیم شہر (کوٹ کپورہ) کے گلی کوچوں میں ان کے ساتھ گھومنے پھرنے اور بے تکلفانہ باتیں کرنے کی یادیں میرے ذہن میں سمٹ آئیں۔ اپنا پرانا وطن بھی سب کو یاد رہتا ہے اور پرانے دوست بھی یاد رہتے ہیں۔

اب اس گاؤں میں مجھے جاننے والے اور میرے تعلق والے تو بے شمار لوگ ہیں۔ جن سے میں نہایت محبت سے ملتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے احترام سے پیش آتے ہیں۔ لیکن میرا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پرانا ساتھی اور بچپن کا دوست یا ہم ذوق اب کوئی وہاں نہیں رہا۔ میں مہینوں بعد وہاں جاتا ہوں اور پھر جلد ہی واپس آجاتا ہوں۔ کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کرسکتا۔ رفیق سے تاریخی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ انھوں نے بہت سے علماے کرام کو دیکھا تھا۔ ان سے متعلق بھی گفتگو چلتی تھی، سیاسی قسم کے معاملات پر بھی بحث ہوتی تھی، جماعتی سلسلے میں وہ نئی پرانی بہت سی باتوں کا علم رکھتے تھے، ان کے بارے میں بھی خاص انداز میں بات چیت جاری رہتی تھی، لطائف بھی چلتے تھے اور ماضی کے واقعات کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔

اب ان کے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے، عبداللطیف راشد۔ وہ طویل مدت سے لاہور میں مقیم ہے۔ پہلے ڈاک خانے (جی پی او) میں ملازم تھا، اب اردو بازار میں مسجد کے قریب (الفضل مارکیٹ میں) اس کا اپنا ڈاک خانہ ہے۔ وہ ماشاء اللہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں والا ہے۔ مجھ سے کبھی ملاقات ہوتی ہے تو نہایت احترام سے پیش آتا ہے۔

رفیق کی دو بیٹیاں ہیں۔ ایک مدینہ منورہ میں ہے اور ایک ریاض میں۔ دونوں ماشاء اللہ اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ بڑی بیٹی جو مدینہ منورہ میں مقیم ہے اللہ کے فضل سے نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں والی ہے۔ میں ۲۰۰۰ء میں حج بیت اللہ کے لیے گیا تو ان کے گھر حاضری دی تھی۔

میں گاؤں جاتا ہوں تو رفیق کے مکان کے قریب سے گزرتا ہوا، وہاں ایک آدھ منٹ ضرور رکتا ہوں۔ پھر ماضی کے مختلف واقعات کا ہجوم دل میں جمع ہوجاتا ہے اور میں بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے چل پڑتا ہوں۔ گاؤں کے تقریباً تمام لوگوں کو ہماری دیرینہ دوستی کا علم ہے۔ بعض لوگ اس کا تذکرہ مجھ سے ضرور کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ تمھارا دوست نہیں ہے۔ اس لیے تم گاؤں میں دیر کے بعد آتے ہو۔ ان کی یہ بات صحیح ہے۔

رفیق میرے بزرگوں سے ان ہی الفاظ میں مخاطب ہوتا تھا جن الفاظ میں خود میں ہوتا تھا۔ مثلاً ہم اپنے والد مرحوم کو ''میاں'' کہتے تھے، وہ بھی میاں کہتا تھا۔ ہماری والدہ کو بے بے، ہمارے ماموں کو ماموں اور ہماری خالہ کو خالہ کہہ کر پکارتا تھا۔

اب آخر میں ایک لطیفہ سنیے جو واقعہ بھی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمارے گاؤں میں ایک شخص الٰہی بخش تھے لوگ انھیں ''الٰہیا'' کہا کرتے تھے۔ وہ بالکل ان پڑھ تھے، لیکن بڑے معاملہ فہم تھے۔ اخبار سننے کی انھیں عادت تھی اور عام سیاسی مسائل کو بعض پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ارائیں تھے اور قریب کی رشتے داری میں رفیق کے چچا تھے۔ ایک دفعہ میں گاؤں گیا تو میرے والد نے مجھے بتایا کہ الٰہیا پچھلے پانچ چھ روز میں تین چار دفعہ آیا اور تمھارے متعلق پوچھا کہ وہ کب آئے گا، میں نے اس سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ یہ اس نے نہیں بتایا کہ کیا بات کرنی ہے۔ آج شاید پھر آئے۔

تھوڑی دیر بعد میں خود ان کے گھر چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور رازداری میں کہا کہ یہ جو ہمارا بادشاہ ہے ارائیں، محمد علی، اس کی بادشاہی قائم رہے گی یا نہیں رہے گی؟ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں، لیکن لوگوں سے اخبار کے ذریعے جو باتیں سنتا ہوں، ان سے مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارا ارائیں بادشاہ کمزور ہے اور بادشاہی کی گدی چھوڑنے والا ہے۔

میں نے کہا، چاچا آپ فکر نہ کریں، وہ مضبوط بادشاہ ہے۔ چاچے الٰہیا نے کہا: تم مجھے یوں ہی تسلی دیتے ہو، اس کی بادشاہی ختم ہونے والی ہے۔ پاکستان کی گدی پر کوئی اور بیٹھ جائے گا۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ تم پڑھے لکھے ہو اور اخبار میں کام کرتے ہو۔ ہمارے ٹرک جڑاں والا سے روزانہ رات کو کراچی مال لے کر جاتے ہیں اور ٹرکوں کے سب ڈرائیور کلینر تمھارے واقف ہیں۔ تم ان کے ساتھ کراچی جاؤ، کرایہ بھاڑا تمھارا خرچ نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ ہنستے کھیلتے اور راستے میں کھاتے پیتے ایک رات اور ایک دن میں کراچی پہنچ جاؤ گے۔ صبح نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر سیدھے اس ارائیں کے گھر جاؤ اور اس سے کہو کہ تو کیوں گھبراتا ہے، تگڑا ہو اور بے فکر ہو کر بادشاہی کر۔ ہمارا سارا گاؤں تیرے ساتھ ہے۔ اپنے گاؤں کے علاوہ اردگرد کے بھی کئی گاؤں ہمارے ساتھ ہیں۔ جب تمھیں ضرورت ہو ہمیں آواز دو، ہم تمھارے ساتھ ڈٹ کر کھڑے ہوں گے۔ ہماری موجودگی میں کوئی تمھیں گدی سے نہیں اتار سکتا۔

چند روز کے بعد واقعی چودھری محمد علی وزارت عظمیٰ سے علیحدہ ہو گئے اور ان کی بادشاہی ختم ہو گئی۔ میں پھر گاؤں گیا تو چاچا الٰہی بخش نے مجھ سے کہا کہ وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں اصل قصور تمھارا ہے۔ اگر میرے کہنے سے تم اس کے پاس چلے جاتے اور اسے تسلی دیتے تو اسے پتا چلتا کہ گاؤں کے گاؤں میرے ساتھ ہیں اور وہ آرام سے بادشاہی کرتا۔

الٰہی بخش کے دو بیٹے تھے۔ ایک محمد شفیع اور دوسرا محمد رفیع۔ محمد شفیع تو بہت سال ہوئے وفات پا گیا تھا۔ محمد رفیع ٹرک ڈرائیوری کرتا ہے اور وہ گاؤں ہی میں ہے۔ ان کے بچے میرا خیال ہے پڑھتے ہوں گے۔ اب پہلے والے دیہات نہیں رہے۔ تعلیم کا سلسلہ عام ہے اور ہر گھر میں بچوں کو تعلیم دلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

چاچا الٰہی بخش کی یہ بات اپنے دوست رفیق کا تذکرہ کرتے ہوئے ذہن میں آئی۔ ایک تو اس سے یہ پتا چلا کہ چودھری محمد علی کا دور وزارت عظمیٰ جس انداز سے گزرا، اس کا بعض ان پڑھ لوگوں کو بھی علم تھا اور ان پڑھ لوگوں کے سیاسی تجزیے بسا اوقات مبنی بر صحت ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنی برادری کے منصب داروں سے لوگوں کو قلبی لگاؤ ہوتا ہے۔ بے شک ان منصب داروں کی گردنیں کتنی بھی اکڑی ہوئی ہوں اور وہ انھیں ذرہ بھر اہمیت نہ دیتے ہوں تاہم ان کمزور لوگوں کا برادری تعلق ان مغرور لوگوں سے انھیں بہت حد وابستہ رکھتا ہے۔

یہاں یہ بھی بتادیں کہ میں اپنے اصل وطن سے رخصت ہوتے وقت کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لایا تھا، حالاں کہ میرے پاس اس وقت مختلف موضوعات کی دوسو سے زائد کتابیں تھیں۔ خیال یہ تھا کہ چند روز کے بعد واپس آجائیں گے۔ لیکن میرے دوست رفیق چوں کہ ایک مہینا بعد وہاں سے ایک بڑے قافلے کے ساتھ چلے تھے اور اس وقت انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اپنے آبائی وطن سے یہ آخری روانگی ہے، اب واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے، اس لیے وہ چند کتابیں یا مختصر سا سامان اپنے ساتھ لے آئے ہوں گے، جن میں ایک کتاب سبل السلام تھی جو بلوغ المرام کی شرح ہے۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف ہمارے گاؤں گئے اور انھوں نے رفیق کے گھر سبل السلام دیکھی تو فرمایا: حاجی تم نے یہ کتاب کیا کرنی ہے؟ وہ سمجھ گئے کہ مولانا یہ کتاب لینا چاہتے ہیں۔ عرض کیا: آپ لے جایئے۔ چناں چہ وہ لے آئے۔

محمد رفیق ہی کے رشتے دار اور میرے بچپن کے ساتھی محمد دین اور محمد طفیل تھے جو گاؤں میں میرے منتظر رہتے تھے۔ وہ بھی یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رفیق نے ایک مہر بنا رکھی تھی، جس میں محمد رفیق زبیدی کے الفاظ کندہ تھے۔ ان کا گول چہرہ تھا۔ رنگ گندی تھا، قد چھوٹا تھا، داڑھی سفید ہوگئی تھی جو کچھ عرصے سے تھوڑی سی بڑھا بھی لی تھی۔ داڑھی میں اگرچہ کتر بیونت کا سلسلہ جاری رہا، تاہم یہ فوج میں بھی ان کے ساتھ رہی۔

اب چند باتیں اور سنیے جو حاجی محمد رفیق نے بتائیں۔

۱۔ انھوں نے پہلا حج اپنے والدین کے ساتھ بچپن میں کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر دس گیارہ برس کی ہوگی۔ یہ ۱۹۲۸ء کے پس وپیش کی بات ہے۔ اب تو پورا بیت اللہ شریف ایرکنڈیشنڈ ہے، جس میں صفاو مروہ کا حصہ بھی شامل ہے۔ اس وقت صفاو مروہ اور ان کے درمیان کے حصے پر ٹین کی چھت تھی۔ حاجی رفیق نے بتایا کہ لوگوں سے سنا تھا کہ پہلے یہاں چھت نہیں ہوتی تھی اور صفاو مروہ کے درمیان لوگ دھوپ میں سعی کرتے تھے۔ پنجاب کے ایک شخص قاضی محمد سلیمان حج کے لیے آئے تو انھوں نے یہاں کے حکمرانوں سے کہہ کر صفاو مروہ اور اس کے درمیانی حصے پر ٹین کی چھت کا انتظام کرادیا تھا۔

قاضی صاحب نے پہلا حج ۱۹۲۱ء میں کیا تھا اور اس وقت حجاز پر شریفیوں کی حکومت تھی۔ قاضی صاحب نے اسی زمانے میں مکہ مکرمہ کے گورنر سے مل کر بات کی ہوگی اور ٹین کی چھت ڈلوائی ہوگی۔

۲۔ حاجی رفیق نے اپنے محلے کے ایک شخص کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے کسی سے محبت کا تعویذ لیا۔ تعویذ زعفران سے لکھا گیا تھا۔ تعویذ دینے والے نے اسے ہدایت کی کہ دوپہر کے وقت مٹی کے دیے میں سرسوں کا تیل ڈال کر روئی کی لمبی بتی کو آگ لگائیں اور کسی بچے کو کندھوں پر اٹھا کر جلتا ہوا دیا شیشم کے درخت پر رکھیں۔ جیسے جیسے دیا جلے گا، اس کی محبوبہ کے دل میں اس کے لیے کشش پیدا ہوگی اور وہ اس کی طرف بھاگتی ہوئی آئے گی۔ تعویذ لینے والے نے سفید کپڑے پہنے اور کلف لگا کر نئی سفید پگڑی باندھی اور رفیق کو ساتھ لیا کہ آؤ تم سے ایک کام ہے۔ دونوں باہر کھیتوں میں چلے گئے۔ ان صاحب نے ایک تھیلا کھولا، اس میں سے مٹی کا بڑا سا دیا نکالا، روئی کی لمبی بتی نکالی اور سرسوں کے تیل کی آدھی بوتل اس میں ڈالی۔ بتی کو آگ لگائی اور اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رفیق کے ہاتھ میں تھما کر کندھوں پر اٹھایا کہ اسے درخت کے مناسب مقام پر رکھ دو۔ رفیق ایک جگہ پر دیے کو رکھنے لگا تو وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اسی طرح جلتا ہوا اس شخص کی پگڑی پر گرا، جس سے پگڑی بھی جل گئی، درمیان سے اس کے سر کے بال بھی جل گئے اور سفید کپڑے کچھ تو جل گئے اور جو جلنے سے محفوظ رہے، وہ سرسوں کے تیل سے تر بہ تر ہوگئے۔ اس طرح محبت کا تعویذ انجام کو پہنچا اور محبوبہ بے تابی کے ساتھ اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئی...... تعویذ زندہ باد...... محبت پائندہ باد۔

۳۔ رفیق نے اپنے محلے کے ایک بہت ہی باخبر اور اہل محلّہ کے نزدیک پڑھے لکھے شخص کے بارے میں بتایا کہ ان سے کسی نے پوچھا: میاں جی بابا آدم علیہ السلام کب ہوئے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: بابا آدم! یہ تم نے کیا سوال کیا؟ بابا آدم علیہ السلام کو گزرے کوئی زیادہ مدت نہیں ہوئی، وہ تو کل ہوئے ہیں۔ ان کے تھوڑے عرصے بعد حضرت نوح علیہ السلام آئے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام آگئے۔ پھر کچھ مدت گزری کہ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ پیدا ہوگئے اور اب ہم لوگ ہیں۔ یہ کوئی زیادہ مدت نہیں ہے، سوچیں تو کل کی بات ہے۔

۴۔ ایک شخص نے ان ہی میاں صاحب سے پوچھا کہ فلسطین کہاں ہے اور یہاں سے کتنی دور ہے؟ میاں صاحب نے مغرب کی طرف ہاتھ کر کے فرمایا: ادھر ہے (لہندے) یعنی مغرب کی طرف۔ بالکل قریب ہے۔ یہاں سے چل پڑو۔ سیدھے چلے جاؤ۔ دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ چلتے چلتے تھوڑا بہت جنگلی علاقہ آئے گا، صحرا......! راستے میں پانی کی ضرورت پڑے گی۔ پانی اپنے پاس ہونا چاہیے۔ آگے جاؤ گے تو شام کا ملک آئے گا۔ بس اب تم سمجھ لو کہ فلسطین آگیا...... شام کے ساتھ ہی اس کی حدیں لگتی ہیں۔ پھر سارے عرب ملک قریب قریب ہی ہیں۔ چلتے چلتے مکے مدینے آجاؤ اور حج کر کے گھر کو روانہ ہوجاؤ۔ گھر آنے کے لیے جی چاہے تو سمندری جہاز میں بیٹھ جاؤ...... بس اتنی سی بات ہے۔ عرب کا جنگل بھی دیکھ لیا۔ فلسطین بھی دیکھ لیا۔ حج بھی کرلیا اور سمندری جہاز کی سواری بھی کرلی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میرے مرحوم دوست محمد رفیق بہت دلچسپ آدمی تھے۔ ایک حج تو انھوں نے (جیسا کہ بتایا گیا) دس گیارہ سال کی عمر میں والدین کے ساتھ کیا تھا۔ دوسرا اور آخری حج وفات سے تین چار سال پہلے کیا۔ اس حج میں بیوی بچے سب ان کے ساتھ تھے۔

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ ان کی پہلی بیوی بہت سال ہوئے وفات پا گئی تھیں اور انھوں نے حج کیا تھا۔ رفیق کی بیٹیاں سعودی عرب میں تھیں۔ (ایک مدینہ منورہ میں اور ایک ریاض میں) لڑکا لاہور ہے۔ یعنی پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں میں سے کوئی بھی ان کے پاس گاؤں میں نہیں تھا۔ وہ تنہا تھے۔ انھوں نے ایک مطلقہ عورت سے نکاح کرلیا تھا اور تنہائی ختم ہوگئی تھی۔ دوسری بیوی سے کوئی بچہ نہیں ہوا۔ نکاح سے آٹھ دس سال بعد وہ خود وفات پا گئے۔ ان کی پنشن ان کی بیوہ وصول کرتی ہیں۔ لیکن وہ وہاں نہیں رہتیں۔ اپنے بہن بھائیوں کے پاس ضلع وہاڑی کے ایک گاؤں میں رہتی ہیں اور انھوں نے اپنے شوہر رفیق کے ساتھ حج کیا تھا۔ رفیق کے گھر میں اب کوئی نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسماعیل ضیا

(وفات ۱۰۔ نومبر ۱۹۹۷ء)

میانہ قد، داڑھی صاف، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گندم گوں، کتابی چہرہ، سردیوں میں کوٹ پتلون اور گرمیوں میں پینٹ بوشرٹ میں ملبوس، خوش مزاج، ہنس مکھ، دوستوں کے دوست۔ یہ تھے گوجراں والا کے اسماعیل ضیا۔ والد کا نام حاجی محمد علی تھا جو گوجراں والا کے صنعت کار اور وہاں کی انجمن اہلِ حدیث کے خازن تھے۔ صداقت شعاری اور ایمان داری کی بنا پر شہر میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے اور ہر حلقے میں عزت و اکرام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ طویل قامت اور صحت مند بزرگ تھے۔

یہ تو معلوم نہیں کہ حاجی محمد علی کو شہر کی انجمن اہلِ حدیث کا خازن کب بنایا گیا تھا، البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ زندگی کے آخری دم تک اس منصب پر فائز رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ بے حد مداح تھے اور ان کی تحریروں کا نہایت شوق سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ سیاسی نقطہ نظر بھی وہی تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا، اور گوجراں والا کے مسلمانوں کی اکثریت اسی نقطۂ نظر کی حامل تھی۔

حاجی محمد علی کی وفات کے بعد گوجراں والا کی انجمن اہل حدیث کے خازن ان کے صاحب زادے اسماعیل ضیا کو منتخب کیا گیا تھا۔ اسماعیل ضیا مارچ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے اور گوجراں والا کے اسلامیہ کالج سے بی اے پاس کیا۔ وہ دور اندیش اور ذہین شخص تھے۔ مذہبی خاندان سے تعلق کی وجہ سے مذہب اور دین سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمتہ اللہ علیہ سے ان کا قریبی رابطہ تھا۔ اس رابطے کی بنا پر ان ہی سے انھوں نے دینی تعلیم حاصل کی تھی۔

آزادی سے قبل دورِ طالب علمی میں اسماعیل ضیا نے ''حزب اللہ'' کے نام سے گوجراں والا کے نوجوان مسلم طلبا کی ایک تنظیم قائم کی تھی۔ لائق احترام باپ کی طرح مولانا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابوالکلام آزاد سے وہ بھی بہت متاثر تھے۔ اسی لیے اس تنظیم کا نام انھوں نے مولانا آزاد ہی سے مستعار لیا تھا۔ مولانا نے کسی زمانے میں جماعت حزب اللہ قائم کی تھی، جس کا اس دور کے ہندوستان میں بڑا شہرہ تھا۔

۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار میں ہندو مسلم فسادات نے نہایت شدت اختیار کر لی تھی، جس میں مسلمانوں کو سخت جانی اور مالی نقصان پہنچا تھا۔ اس زمانے میں جمعیت علماے ہند اور مجلس احرار کی طرف سے بہار کے فساد زدہ مسلمانوں کی مدد کے لیے اپیل کی گئی تھی۔ اس اپیل پر گوجراں والا کے مسلمان نوجوانوں کی تنظیم حزب اللہ کے ارکان نے اسماعیل ضیا کی قیادت میں چندہ جمع کر کے جمعیت علماے ہند کے دفتر دہلی بھیجا تھا۔ اسماعیل ضیا کی عمران دنوں صرف سولہ سال کی تھی۔ اسی زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے ان کی خط وکتابت شروع ہوئی جو اس وقت جمعیت علماے ہند کے ناظم اعلیٰ تھے۔ یہ خط وکتابت کافی عرصہ جاری رہی۔ آزادی کے بعد اسماعیل ضیا دہلی گئے تو مولانا سیوہاروی سے بھی ملاقات کی تھی اور مولانا ممدوح ان سے بہت اچھی طرح ملے تھے۔ اس وقت مولانا ممدوح سے ان کی جو گفتگو ہوئی، اس کے بعض حصے اس مضمون میں درج کیے گئے ہیں جو مولانا سیوہاروی کے بارے میں لکھا گیا ہے اور اس کتاب میں درج ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں اسماعیل ضیا نے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے گوجراں والا میں ''آزاد لائبریری'' قائم کی تھی۔ آزادیٔ وطن کے بعد یہ لائبریری کھیالی دروازے کے اندر چوک بیری والا کی ایک بلڈنگ میں منتقل ہوگئی تھی۔ آزاد لائبریری کافی عرصہ قائم رہی اور پڑھے لکھے لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے۔ میں فروری ۱۹۵۰ء میں اخبار ''الاعتصام'' کے سلسلے میں گوجراں والا گیا تو میرا قیام اسی بلڈنگ کے ایک کمرے میں رہا تھا۔

کالج کی تعلیم سے کچھ عرصہ بعد اسماعیل ضیاء کو ''اولڈ بوائز ایسوی ایشن اسلامیہ کالج گوجراں والا'' کے صدر منتخب کیا گیا تھا وہ کاروبار بھی کرتے تھے اور سیاسیات میں بھی حصہ لیتے تھے۔ اپنے شہر کی انجمن اہل حدیث سے بھی ان کا تعلق تھا۔ کاروباری کی حیثیت سے وہ مغربی پاکستان سلک ایسوی ایشن کے نائب صدر تھے۔

سیاسیات کے ابتدائی دور میں ان کا تعلق نیشنل عوامی پارٹی سے تھا۔ ۱۹۶۶ء میں مولانا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبدالحمید بھاشانی گوجراں والا تشریف لائے تو اسماعیل ضیاء نے مجلس استقبالیہ کی طرف سے انھیں خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اسماعیل ضیاء کچھ عرصہ انجمن اہل حدیث گوجراں والا کے سیکرٹری بھی رہے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل کی جامع مسجد (چوک نیائیں) کی مجلس انتظامیہ کے بھی وہ رکن تھے اور باپ کی طرح ان کی رائے اور مشورے کو اہمیت دی جاتی تھی۔

گوجراں والا کی آبادی ماڈل ٹاؤن میں ان کی کوشش سے مسجد صدیقیہ تعمیر کی گئی جو اس علاقے میں اہل حدیث کی بارونق اور وسیع مسجد ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ پنجاب اسمبلی کے رکن تھے، اسی علاقے میں اچھی خاصی جگہ الاٹ کرا کے اہل حدیث کی ایک اور مسجد تعمیر کرانے کا عزم کیا اور یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ اس کا نام مسجد مکرم رکھا گیا۔

جی چاہتا ہے کہ مسجد مکرم سے متعلق یہاں کچھ تفصیل عرض کر دی جائے۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فقیر کے سوا کوئی شخص اس واقعہ کو تحریر کی زبان نہیں دے گا۔

جس جگہ پر گوجراں والا کی یہ عظیم الشان مسجد تعمیر ہوئی وہ کمیٹی کی جگہ تھی اور اس پر شہر کی ایک معروف اور بڑی شخصیت نے غیر قانونی طور پر قبضہ کر کے پانی کا نل لگا دیا تھا اور چھوٹی سی دیوار تعمیر کر کے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد مرحوم تھے۔ اسماعیل ضیا پنجاب اسمبلی کے رکن تھے اور ان کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔ پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ اسماعیل ضیا نے حضرت مولانا محمد اسماعیل مرحوم و مغفور کے فرزند گرامی حکیم محمود اور بعض دیگر حضرات سے مشورہ کر کے اس پلاٹ پر مسجد تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا اور مسجد کے لیے وزیر اعلیٰ کے نام اس پلاٹ کی الاٹ منٹ کے لیے درخواست لکھی۔ اس سلسلے میں اسماعیل ضیاء لاہور آئے اور مجھ سے بھی بات کی، چناں چہ انھوں نے مجھے ساتھ لیا اور وزیر اعلیٰ سے ملے اور درخواست پیش کی۔ وزیر اعلیٰ نے درخواست منظور کی تو اسماعیل ضیاء نے گوجراں والا کے ڈپٹی کمشنر سے رابطہ کیا۔ ڈپٹی کمشنر کو شہر کی اس معروف اور بڑی شخصیت سے قبضہ چھڑا کر ان کو قبضہ دینے پر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ چند روز کے بعد اسماعیل غیاء دوبارہ ڈپٹی کمشنر سے ملے او ان سے کہا کہ مجھے آپ کی مجبوری کا احساس ہے۔ آپ کو قبضہ دلانے میں تامل ہے تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا میں وزیراعلیٰ سے دوبارہ بات کروں؟ لیکن انھوں نے ان کو وزیراعلیٰ سے دوبارہ بات کرنے سے روک دیا اور چند روز کے بعد وہ پلاٹ مسجد کے لیے الاٹ ہوگیا۔

الاٹ منٹ کے بعد یہ حضرات فوری طور پر مسجد کی تعمیر کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ تعمیر کا افتتاح سعودی عرب کے سفیر متعینہ پاکستان سے کرایا جائے۔ اس زمانے میں پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر مرحوم ریاض الخطیب تھے۔ اسماعیل ضیاء نے مجھ سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تو میں نے اپنے مرحوم دوست مولانا عطاء اللہ ثاقب سے بات کی، ان کے ریاض الخطیب سے اچھے مراسم تھے۔ چناں چہ یہ حضرات اسلام آباد جاکر ریاض الخطیب سے ملے اور انھوں نے مقررہ تاریخ پر گوجراں والا تشریف لانے کا وعدہ کیا۔

اب اسماعیل ضیا نے اردو میں خطبہ استقبالیہ لکھا اور میں نے اسی وقت اپنے نہایت مشفق اور بزرگ دوست شاہ محمد جعفر پھلواروی سے اس کا عربی ترجمہ کرایا۔ شاہ صاحب مرحوم دلچسپ آدمی تھے۔ فرمایا یہ وہابیوں کا کام مفت ہی میں ہوگا۔ میں نے عرض کیا اس کے بدلے میں ہم آپ کی خدمت میں بہت بڑی جزاک اللہ پیش کریں گے۔ فرمایا آپ سے یہی توقع تھی۔ بہر حال سفیر ممدوح گوجراں والا تشریف لائے اور تعمیر مسجد کا افتتاح فرمایا اور خطبہ استقبالیہ شیشے کے خوب صورت فریم میں مولانا عطاء اللہ ثاقب نے پڑھا اور سفیر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

گوجراں والا میں اب اہلِ حدیث کی یہ بہت بڑی اور خوب صورت مسجد ہے۔ اس کے پہلے خطیب حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم کے صاحب زادے حکیم محمود تھے۔ ان کی وفات کے بعد فریضۂ خطابت ان کے فرزند گرامی حافظ اسعد محمود صاحب انجام دیتے ہیں۔ یہ نوجوان ماشاء اللہ اپنے جدِ امجد حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی طرح بہت اچھے خطیب ہیں اور گوجراں والا کے زیادہ تر لوگ اسی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرتے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر کے ابتدائی دور میں جن لوگوں کا جو حصہ ہے اس فقیر نے وہ مختصر الفاظ میں عرض کردیا ہے۔

میں دراصل کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پنجاب اسمبلی کی رکنیت کے زمانے میں گوجراں والا کے علاقہ ماڈل ٹاؤن میں ہمارے دوست اسماعیل ضیاء کی کوشش سے اہلِ حدیث کی دو مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ ایک مسجد صدیقیہ اور دوسری مسجد مکرم۔ ان کا یہ بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے، جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا اجر ان شاء اللہ انھیں بارہ گاہِ الٰہی سے ہمیشہ ملتا رہے گا۔

اسماعیل ضیاء ہمیں کہا کرتے تھے کہ جماعت اہلِ حدیث کے سلسلے کا کوئی کام پنجاب کی حکومت سے متعلق ہو تو انھیں بتایا جائے، وہ اس کے لیے کوشش کریں گے۔

میاں محمود علی قصوری مرحوم کا بھی یہ ہی معاملہ تھا، چناں چہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) کی اچھی خاصی زمین پر بہت سے لوگوں نے مکانات تعمیر کر لیے تھے اور فیصل آباد کا ایک ایم این اے (مختار رانا) قبضہ گروپ کی حمایت کر رہا تھا۔ اس نواح کے بعض لوگوں کو جن میں مولانا عبدالقادر ندوی کے بعض رشتے دار شامل تھے، اس نے گرفتار کرا دیا تھا۔ اس کی اطلاع مجھے بذریعہ ٹیلی فون فیصل آباد سے مولانا محمد اسحاق چیمہ نے دی۔ میں اسی وقت میاں محمود علی قصوری سے ملا۔ میرے عزیز دوست ضیاء کھوکھر بھی میرے ساتھ تھے۔ میاں صاحب سے میں نے سارا واقعہ بیان کیا۔

میاں صاحب کا بڑا سا وزٹنگ کارڈ تھا جو ان کے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کے مطابق تھا۔ انھوں نے اس کی پشت پر اس ایم این اے کے نام اس مضمون کا رقعہ لکھ کر مجھے دیا کہ یہ ہماری جماعت (اہلِ حدیث) کا معاملہ ہے، آپ قابض گروہ کی مدد نہ کریں بلکہ جماعت کے لوگوں کی مدد کریں اور یہ جگہ قبضہ کرنے والوں سے خالی کرا کے اصل مالکوں کو دلائیں۔ میاں محمود علی قصوری کا یہ رقعہ لے کر میں فوری طور پر فیصل آباد پہنچا۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ ضلع کچہری میں موجود تھے، اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے رقعہ ان کو دیا۔ انھوں نے متعلقہ ایم این کو پہنچایا جو ضلع کچہری میں موجود تھا اور مسئلہ حل ہو گیا۔

مجھے تفصیل کا علم نہیں، لیکن اب بھی شاید قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں بہت تھوڑی تعداد سی میں سہی، جماعت اہلِ حدیث سے تعلق رکھنے والے ارکان ضرور ہوں گے۔ کیا وہ جماعت کے لوگوں کے کام کراتے ہیں؟ حکومتیں حزب اختلاف کے ارکان کے کام ضرور کرتی ہیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان اپنی جماعت سے تعلق رکھنے والوں کے کام کراتے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنی جماعت کے مرد اور خواتین اساتذہ کی تقرری کے لیے تو وہ خاص طور سے کوشش کرتے ہیں۔ ''کوشش'' ان کے لیے بہت ہلکا لفظ ہے، کہنا چاہیے کہ خون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پسینا ایک کر دیتے ہیں اور اس پر مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔ جمعیت علماے اسلام کے ارکان بھی اپنے مسلک (دیوبندیت) سے منسلک افراد کے کام کراتے ہیں۔ اسمبلیوں کے اہلِ حدیث ارکان کو بھی اپنی جماعت کے لوگوں کی مدد کرنی چاہیے، ممکن ہے اس سلسلے میں وہ احتیاط سے کام لیتے ہوں۔ میرا خیال ہے ''احتیاط'' کے لفظ سے میرے مقصد کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

ان سطور میں گزارشات کا تعلق اسماعیل ضیاء سے ہے۔ وہ نہایت معاملہ فہم تھے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی وفات کے بعد جامع مسجد کی خطابت کے لیے مولانا عبداللہ صاحب کا تقرر اسماعیل ضیاء کی تجویز بلکہ اصرار سے ہوا تھا، ورنہ بعض حضرات کو اس سے اختلاف تھا۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ تقریر وخطابت میں بھی وہ یگانہ حیثیت رکھتے تھے، علم وتحقیق میں بھی ان کا مقام بلند تھا اور ذہانت وفراست میں بھی وہ بڑے مرتبے کے حامل تھے۔ گوجراں والا میں انھوں نے بے پناہ خدمات سرانجام دی تھیں اور وہاں کے لوگ ان سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے ۲۰۔فروری ۱۹۶۸ء کو وفات پائی تو جامع مسجد اہل حدیث کے لیے خطیب کی ضرورت پڑی۔ اس سلسلے میں وہاں کی انجمن اہل حدیث اور جامع مسجد کی انتظامیہ کا اجلاس ہوا تو اسماعیل ضیاء نے خطابت کے لیے مولانا عبداللہ صاحب کا نام پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ بعض معاملات میں اختلاف کے باوجود مولانا عبداللہ صاحب سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں اور ہم ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں۔ نیا آدمی معلوم نہیں کیسا ہوگا؟ کن شرائط پر آئے گا، اور ہمارا اس سے اور اس کا ہم سے نباہ ہو سکے گا یا نہیں۔ اس پر کچھ بحث ہوئی۔ بالآخر ارکانِ مجلس نے ضیاء صاحب سے کہا کہ اس ضمن میں وہ ہی مولانا عبداللہ صاحب سے بات کریں گے اور ان سے پوچھیں کہ وہ یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اسماعیل ضیاء نے مولانا عبداللہ صاحب سے بات کی تو انھوں نے فوراً خطابت کی ذمے داری قبول کر لی۔

سیاسیات سے اسماعیل ضیاء کو گہرا تعلق تھا اور اس میں وہ باقاعدہ عملی حصہ لیتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے مارشل لا نافذ کیا تو یہ اس کے شدید ناقدوں میں سے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایوب خاں نے بنیادی جمہوریتوں کی طرح ڈالی اور اس کے تحت ۱۹۶۰ء میں اور پھر ۱۹۶۴ء میں انتخابات ہوئے تو اسماعیل ضیاء نے بھی اس میں حصہ لیا اور دونوں دفعہ کامیاب ہوئے۔ ان کا تعلق حکومت کے مخالف لوگوں سے تھا۔

جنوری ۱۹۶۴ء میں فاطمہ جناح اور ایوب خاں کے درمیان صدارتی مقابلے میں اسماعیل ضیاء نے فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی اور گوجراں والا میں وہ فاطمہ جناح کے پولنگ ایجنٹ تھے۔ اس وقت حضرت مولانا محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انھوں نے امداد کی درخواست کی اور وہ مولانا کو بنیادی جمہوریتوں کے بعض ارکان کے پاس جانے میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۷۰ء میں اسماعیل ضیاء نے میاں محمود علی قصوری مرحوم اور شیخ رفیق احمد کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور اس کے ٹکٹ پر گوجراں والا سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ ان کا مقابلہ گوجراں والا کی ایک سیاسی شخصیت غلام دست گیر خاں سے ہوا تھا۔ اس حلقے میں گوجراں والا کے بعض دیہات بھی شامل تھے، اسماعیل ضیاء نے ان دیہات کے چکر سائیکل پر لگائے تھے اور اپنے مدِّ مقابل غلام دست گیر خاں سے کئی ہزار زیادہ ووٹ حاصل کر کے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ بعد ازاں ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دوبارہ حصہ لیا تو اس میں بھی کامیاب ہوئے۔

میں ۱۹۷۰ء میں بھی اور ۱۹۷۷ء میں بھی اپنے دوست اسماعیل ضیاء کی انتخابی حمایت کے لیے گوجراں والا گیا اور اس ضمن میں اپنے تعلق والے بہت سے لوگوں سے ملا۔

یہاں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے چند روز پیشتر عید کے دن حکومت نے اسماعیل ضیاء کو گرفتار کر لیا تھا۔ یہ یحیٰی خاں کا دور تھا اور مارشل لا کی حکومت تھی۔ سمری ملٹری کورٹ سے ان کو ایک سال قید اور ایک لاکھ روپے جرمانے کی سزا ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۷۸ء میں ضیاء الحق کے دور میں بھی گرفتار کر لیے گئے تھے اور راولپنڈی کی سمری ملٹری کورٹ نے انھیں ایک سال کی سزا دی تھی۔

ضیاء الحق کے مارشل لا کے زمانے میں انھوں نے ''ایوانِ فکر'' کے نام سے ایک حلقہ قائم کیا، جس میں متعدد مواقع پر لاہور اور مختلف مقامات کے بہت سے حضرات کو دعوت دی گئی اور اس کے اجتماعات میں انھوں نے سیاسی تقریریں کیں۔ ایوانِ فکر کے اجتماعات کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاسی تقریروں سے وہاں کے لوگ خاصے متاثر ہوئے اور ان کی زبانیں کھلیں۔

سماجی خدمات میں بھی اسماعیل ضیاء کا کافی حصہ تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا، جس کا نام ''الفاروق اجتماعی ترقیاتی ادارہ'' رکھا۔

مذہبیات میں وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار و تصورات سے بہت متاثر تھے اور علمائے دین کے طبقے سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد اسماعیل سلفی، قاضی عبدالرحیم، مولانا محمد حنیف ندوی اور حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے بے حد عقیدت مند تھے۔ مولانا آزاد کو انھوں نے بہت پڑھا اور ان کے بارے میں جو کتابیں چھپیں ان کا بھی خوب مطالعہ کیا۔ مولانا آزاد ۱۹۴۶ء میں پنجاب کی وزارت سازی کے سلسلے میں لاہور آئے اور فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اسماعیل ضیاء اس وقت اپنے چند دوستوں کے ساتھ مولانا سے ملے تھے اور مولانا کا فلیٹیز ہوٹل کے جن کمروں میں قیام رہا تھا وہ کمرے اسماعیل ضیاء نے ایک مرتبہ مجھے دکھائے تھے۔ مختلف حضرات کی اردو اور انگریزی تصانیف اسماعیل ضیاء کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔ وہ صاف ذہن اور صحیح الفکر شخص تھے۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے انھوں نے مجھ سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ''تاریخ دعوت وعزیمت'' اور علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ''الجمال والکمال'' (تفسیر سورہ یوسف) لیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے بعض مقامات پر کالی پینسل سے نشان بھی لگائے۔

اسماعیل ضیاء سے میری پہلی ملاقات فروری ۱۹۵۰ء میں اس وقت ہوئی تھی جب میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے معاون مدیر کی حیثیت سے گوجراں والا گیا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل کی جامع مسجد میں ہمارا تعارف مولانا محمد حنیف ندوی نے کرایا تھا۔ اسماعیل ضیاء اس وقت سفید کھدر کا پاجامہ اور کرتا پہنے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں وہ کبھی کبھی ''الاعتصام'' میں کسی نہ کسی موضوع پر مضمون لکھا کرتے تھے۔ زبان، انداز اور معلومات کے اعتبار سے ان کا مضمون جان دار ہوتا تھا۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب اور مولانا محمد حنیف ندوی صاحب کا وہ بہت احترام کرتے تھے اور وہ دونوں بزرگ ان پر شفقت فرماتے تھے۔

گفتگو میں اسماعیل ضیاء قرآن کی آیات اور احادیث برمحل پڑھتے تھے۔ صحابہ کرام اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ائمہ عظام کے بہت سے واقعات انھیں یاد تھے جو وہ تقریر یا عام گفتگو میں بیان کیا کرتے تھے۔ صاف ستھرے اسلوب میں بات کرتے تھے۔ اپنے مسلک میں پختہ تھے اور علمائے اہل حدیث کا تذکرہ احترام کے لہجے میں کرتے تھے۔ سیاسیات یا مذہبیات میں جن علمائے کرام سے وہ زیادہ متاثر تھے، ان کا ذکر بالخصوص عقیدت مندانہ جذبات سے کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ بتایا کہ وہ نو برس کے ہوں گے کہ چوک نیائیں میں گوجراں والا کی انجمن اہلِ حدیث کا جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں علامہ محمد اسد کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ انھوں نے انگریزی میں تقریر کی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اس جلسے میں ایک انگریز آیا ہے۔ بہت لوگ (مسلمان اور غیر مسلمان) ان کی تقریر سننے آئے تھے۔ تقریر کا اردو ترجمہ ملک نصر اللہ خاں مرحوم نے کیا تھا۔

علامہ محمد اسد اصل آسٹریا کے باشندے تھے اور یہودیت ترک کر کے مسلمان ہوئے تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنبلی تھے۔ امام ابن حزم سے بھی متاثر تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ میں نے ان پر مفصل مضمون اپنی کتاب ''برصغیر کے اہلِ حدیث خدامِ قرآن'' میں لکھا ہے۔ انھوں نے ۲۰۔ فروری ۱۹۹۲ء کو وفات پائی۔

اسماعیل ضیا ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے بعض مضامین کے بارے میں مجھ سے زبانی یا بذریعہ مکتوب اظہار رائے کرتے رہتے تھے، حالاں کہ بہت مدت سے ''الاعتصام'' سے میرا کوئی دفتری یا ادارتی تعلق نہ تھا، البتہ کبھی کبھی کسی موضوع پر اس میں میرا کوئی چھوٹا بڑا مضمون چھپ جاتا تھا۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۹۷ء کے ''الاعتصام'' میں میرا ایک مختصر سا مضمون چھپا جس کا عنوان تھا ''لاہور میں درسِ قرآن کے حلقے''۔ مضمون میں درس قرآن کے جن حلقوں کا ذکر کیا گیا تھا، ان میں خواجہ عبدالحی فاروقی مرحوم کے حلقۂ درس قرآن کا ذکر بھی تھا، جو انھوں نے 1915ء میں اکبری دروازے کے باہر اکھاڑا ابوتاہل میں قائم کیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انگریزی حکومت نے خواجہ صاحب مرحوم کو لاہور میں نظر بند کر رکھا تھا اور نظر بندی کے دور میں انھوں نے یہاں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان کے درس میں زیادہ تر کالجوں اور پنجاب یونیورسٹی کے طلبا شریک ہوتے تھے۔

اسماعیل ضیا نے یہ مضمون پڑھ کر مجھے خط لکھا کہ مضمون تشنہ ہے۔ اس موضوع پر تفصیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے لکھنا چاہیے تھا اور درسِ قرآن دینے والے کے فقہی مسلک کی وضاحت بھی کرنا چاہیے تھی۔ انھوں نے لکھا کہ خواجہ عبدالحی اہلِ حدیث تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ایک دفعہ گوجراں والا تشریف لائے تو مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم کی درخواست پر جامع مسجد اہلِ حدیث میں انھوں نے خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا تھا۔ خواجہ صاحب ممدوح کے درسِ قرآن کا میں نے واقعی اختصار سے ذکر کیا تھا اور وہاں اختصار ہی کی ضرورت تھی، لیکن ان پر مفصل مضمون میں نے اپنی کتاب ''نقوشِ عظمتِ رفتہ'' میں لکھا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار لاہور نے شائع کی ہے۔ ''برصغیر کے اہلِ حدیث خدامِ قرآن'' میں بھی ان پر میں نے مضمون لکھا تھا۔

گوجراں والا میں ایک بزرگ قاضی عبدالرحیم فروکش تھے، جنھیں وہاں کے لوگ اب بھول چکے ہیں۔ کسی زمانے میں ان کا شمار مجلس خلافت اور کانگریس کے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ مستند عالم دین اور نہایت متقی بزرگ تھے۔ طباعت ان کا پیشہ تھا اور جامع مسجد اہلِ حدیث کے چوک میں ان کا مطب تھا۔ بہت سال مولانا محمد اسماعیل سلفی کے قائم کردہ ''مدرسہ محمدیہ'' میں طلبا کو پڑھاتے رہے تھے۔

اسماعیل ضیاء نے بتایا کہ ایک دن وہ قاضی صاحب کے پاس ان کے مطب میں بیٹھے تھے کہ ایک بڑی سی کار وہاں آ کر رکی۔ ایک شخص کار سے اتر کر قاضی صاحب کے پاس آیا اور نرم لہجے میں السلام علیکم کہہ کر بولا کہ اسے میاں دین محمد صاحب نے بھیجا ہے، وہ بیمار ہیں، فرماتے ہیں کہ قاضی صاحب انھیں آ کر دیکھیں اور کوئی دوا تجویز کریں۔ قاضی صاحب نے اس شخص کی بات سنی اور فرمایا: ''میں نہیں جاسکتا''۔ اس شخص نے دو تین دفعہ کہا کہ آپ تشریف لے جائیں میاں صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر قاضی صاحب نہیں گئے۔ وہ شخص چلا گیا تو اسماعیل ضیا نے قاضی صاحب سے کہا کہ میاں دین محمد بیمار ہیں۔ انھوں نے علاج کے لیے آپ کو بلایا ہے، آپ تشریف لے جاتے، تحریکِ خلافت اور بعض دوسری تحریکاتِ آزادی میں آپ دونوں اکٹھے کام کرتے رہے ہیں اور دونوں پرانے ساتھی ہیں۔

قاضی صاحب نے جواب دیا کہ آپ کی بات ٹھیک ہے، لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہم دونوں ایک ہی سطح پر رہتے تھے۔ اب یہ بڑے آدمی ہو گئے ہیں اور بڑے لوگوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ملنے اور ان کی کوٹھیوں میں جانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ میں اپنی سطح کے لوگوں سے ہی تعلق رکھتا ہوں۔ بڑا سمجھنے اور بڑا کہلانے والوں سے میل جول رکھنا میری عادت نہیں۔

میاں دین محمد گوجراں والا کی کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی زمانے میں ملکی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے تھے۔ اس وقت وہ نیشنلزم کے حامی تھے۔ آزادی سے قبل اور شاید کچھ عرصہ بعد ہائی کورٹ کے جج رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد صوبہ سندھ کے گورنر بنا دیے گئے تھے۔ متوازن اور صحت مند فکر کے مالک تھے۔ مسلکی اعتبار سے اہلِ حدیث تھے۔ قاضی عبدالرحیم صاحب ممدوح کے پرانے سیاسی رفیقوں اور تعلق داروں میں سے تھے۔ جب بیماری کی وجہ سے ان کا فرستادہ قاضی صاحب کو لینے آیا تھا اس وقت وہ سندھ کے گورنر تھے اور اپنے شہر گوجراں والا آئے تھے کہ بیمار ہوگئے، لیکن قاضی صاحب ان کے علاج کے لیے ان کے گھر نہیں گئے، انھوں نے فرمایا بیمار کو طبیب کے پاس آنا چاہیے۔ اگر میرے وہاں جانے کے بعد کوئی مریض آ گیا تو وہ پریشان ہوگا۔

اسی قسم کا واقعہ دہلی کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے۔ وہ مشہور کانگریسی لیڈر تھے، اور کانگرس کے صدر بھی رہے تھے۔ ان کے کلینک میں ایک مرتبہ وائسرے ہند کا آدمی آیا کہ صاحب بہادر بیمار ہیں ان کو علاج کے لیے یاد فرما رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اپنا کلینک چھوڑ کر اس لیے وائسرے کے علاج کے لیے نہیں گئے کہ مریض کو معالج کے پاس آنا چاہیے۔ اگر کوئی مریض ان کے بعد آیا تو اسے ڈاکٹر کو کلینک میں نہ پا کر تکلیف ہوگی۔

بات اسماعیل ضیاء کے متعلق ہو رہی تھی۔ وہ مخلص دوست اور دیانت دار سیاسی لیڈر تھے۔ توازن واعتدال کا پیکر، دھیمے مزاج کے مالک، تعلیم یافتہ، وسیع المطالعہ اور عمدہ خصال۔ لاہور آتے تو مجھ سے ضرور رابطہ قائم کرتے۔ دفتر بھی تشریف لاتے اور گھر بھی آتے۔

جو کتابیں انھیں پسند تھیں، ان کتابوں کے بہت سے حصے انھیں تقریباً زبانی یاد تھے، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کی بعض تقریریں کہنا چاہیے کہ انھیں حفظ تھیں۔ مولانا کے تذکرہ اور غبار خاطر کے متعدد مقامات ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے اسلوب تحریر سے وہ بہت متاثر تھے اور ان کی تصانیف کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قصص القرآن کی چاروں جلدیں اور ''اسلام کا اقتصادی نظام'' ان کی پسندیدہ کتابوں میں شامل تھیں۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین کو وہ سیرت کی بہترین کتاب قرار دیتے تھے۔

اسماعیل ضیاء کی طرح عبداللہ ملک مرحوم کی بھی میرے پاس آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک دن ملک صاحب ممدوح نے آتے ہی کہا کہ میں آج تمھارے پاس ایک خاص کام سے آیا ہوں اور وہ کام یہ ہے کہ تم برصغیر میں اہل حدیث کی سیاسی خدمات کے موضوع پر کتاب لکھو۔ میں نے کہا میرا بھی جی چاہتا ہے کہ یہ خدمت سرانجام دی جائے۔ تھوڑی دیر اس سلسلے میں بات ہوئی اور وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد اتفاق سے اسماعیل ضیا آ گئے۔ انھوں نے بھی یہی بات کی۔ میں نے انھیں بتایا کہ عبداللہ ملک ابھی گئے ہیں، اور یہی تاکید کر گئے ہیں۔

یہ تو ان دونوں کی بات تھی اور میں ذاتی طور پر دنوں مرحومین کی قدر کرتا ہوں۔ عبداللہ ملک تو سیاسیات کے موضوع کی متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے اور اپنے دور کے معروف صحافی بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو یہ فقیر ان شاءاللہ اس اہم موضوع پر اہلِ حدیث حضرات کی جدوجہد کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس موضوع سے متعلق میں نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بنا رکھا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس خاکے کی روشنی میں لکھنے کی سعی کی جائے، اللہ ہی مدد کرنے والا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اسماعیل ضیاء وسیع المطالعہ اور صاف بیان مقرر تھے۔ ۱۹۷۲ء کے آخری دنوں کی بات ہے کہ انھوں نے پنجاب اسمبلی میں ''لینڈ ایکوزیشن ایکٹ'' پر تقریر کی۔ بڑی مدلل تقریر تھی۔ اس موضوع سے متعلق انھوں نے علامہ رشید رضا کی تفسیر ''المنار'' کے بعض مقامات اور ابوعبید کی ''کتاب الاموال'' سے مواد حاصل کیا تھا اور یہ کتابیں وہ اسمبلی میں لے کر گئے تھے اور متعلقہ موضوع کے متعلق ان کی عبارتیں پڑھ کر تقریر کے دوران میں ان کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ اس زمانے میں اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے قائد بہاول پور کے علامہ رحمت اللہ ارشد تھے۔ اسماعیل ضیا کی تقریر کے بعد، انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ ''مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ پیپلز پارٹی میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو عالمانہ اور فاضلانہ انداز میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور اس کے باقاعدہ حوالے دیتے ہیں۔''

اس ایکٹ کے تحت حکومتِ پنجاب کو اختیار مل گیا تھا کہ وہ غریب لوگوں کی رہائش کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہاؤسنگ سکیمیں بنانے کی غرض سے زمین حاصل کر سکتی ہے۔ اس کا معاوضہ طے کرنے کا حق بھی صوبائی حکومت کو مل گیا تھا۔ اس قانون کے تحت پنجاب کے اکثر شہروں میں پیپلز کالونیاں اور بہاری کالونیاں بنائی گئی تھیں جنھیں عام زبان میں کچی آبادیاں کہا جاتا تھا۔ لیکن ضیاء الحق کے دور میں مارشل لا کے ایک ضابطے کے تحت اس قانون کو ختم کر دیا گیا تھا، اس لیے کہ اس سے غریب لوگوں کو فائدہ پہنچتا تھا اور غریبوں کو فائدہ پہنچانا اور کمزوروں کی مدد کرنا مارشلائی حکومتوں کے ضابطۂ اخلاق کے منافی ہوتا ہے۔ وہ عام طور سے فوجیوں اور اپنی ہاں میں ہاں ملانے والوں کی مدد کرتی ہیں، تاہم وہ کالونیاں بعض لوگوں کے قبضے میں رہیں اور انھوں نے مکان بنائے۔

اسماعیل ضیاء پر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم بہت اعتماد کرتے تھے اور ملاقات کے وقت ان سے احترام سے پیش آتے تھے۔ لسانی جھگڑے کی بنا پر کراچی کی فضا فساد آلود ہوئی تو صورتِ حال کی تحقیق کے لیے بھٹو صاحب نے وہاں ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا، جس کا قائد اسماعیل ضیا کو بنایا گیا تھا۔ وفد کے ارکان نے کراچی کے مختلف دھڑوں سے بات چیت کی اور اس کی رپورٹ بھٹو مرحوم کو پیش کی۔

ایک سلسلے میں حکومت نے چین کی حکومت سے گفتگو کے لیے ایک وفد بھیجا تو اس میں بھی اسماعیل ضیاء کو شامل کیا گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اسماعیل ضیاء کے والد حاجی محمد علی مرحوم نہایت عبادت گزار تھے۔ انھوں نے اپنے اس بیٹے کی مذہبی انداز میں تربیت کی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں اخبار ''الاعتصام'' گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا اور میں اس میں خدمت انجام دیتا تھا۔ مولانا محمد حنیف اس کے ایڈیٹر تھے۔ ایک دن حاجی صاحب گھبرائے ہوئے میرے پاس دفتر تشریف لائے اور پوچھا ''مولوی حنیف کہاں ہے؟'' میں نے عرض کیا خیریت تو ہے آپ گھبرائے ہوئے ہیں؟ فرمایا ایک اہلِ قرآن (منکرِ حدیث) میرے بیٹے اسماعیل کے پاس بیٹھا ہے اور حدیث کی مخالفت کر رہا ہے، وہاں فوری طور پر مولوی حنیف جائے اور اس منکرِ حدیث سے بات کرے۔ میں نے حاجی صاحب ہی کے الفاظ بیان کیے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے یہ الفاظ پنجابی میں کہے تھے، میں نے اردو ترجمہ کر دیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اسی وقت مولانا محمد حنیف ندوی کے گھر پہنچا اور انھیں حاجی صاحب کا پیغام دیا۔ مولانا ندوی حدیث کے بارے میں نہایت نازک احساسات رکھتے تھے۔ وہ فوراً وہاں پہنچے۔ اس منکر حدیث سے چند باتیں کیں اور وہ ان کی تاب سخن نہ لا کر خاموش ہو گیا اور وہاں سے چلا گیا۔ حاجی صاحب بے حد خوش ہوئے اور یہ واقعہ انھوں نے متعدد لوگوں کو سنایا۔

اسماعیل ضیاء کے والد گرامی حاجی محمد علی مرحوم کے بارے میں ایک اور واقعہ سنتے جایئے جو ان کے حوالے سے مجھے اسماعیل ضیاء نے سنایا تھا۔

مارچ ۱۹۴۲ء میں جمعیت علماے ہند کی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اور یہ لاہور میں جمعیت کی آخری کانفرنس تھی۔ اس کے صدر مولانا حسین احمد مدنی تھے اور صدر استقبالیہ میں مولانا عبدالقادر قصوری اور ناظم استقبالیہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔ پنڈال میں داخلے کے لیے ٹکٹ خریدنا ضروری تھا۔ گوجراں والا میں جن حضرات کو فروخت کے لیے ٹکٹ دیے گئے تھے، ان میں حاجی محمد علی مرحوم بھی شامل تھے۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ جب مولانا حسین احمد مدنی سٹیج پر تشریف لائے اور مجلس استقبالیہ کا اشتہار دیکھا جس میں صدر استقبالیہ مولانا عبدالقادر قصوری اور ناظم استقبالیہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی لکھا تھا تو مولانا مدنی نے پنجاب کے بعض دیوبندی علماے کرام سے خفگی سے فرمایا کہ دونوں عہدے ایک ہی مسلک کے لوگوں (یعنی اہلِ حدیث) کو دے دیے گئے ہیں، آپ میں سے کوئی شخص ان عہدوں میں سے کسی عہدے کا اہل نہیں تھا؟

اسماعیل ضیا کچھ مدت سے دل کے مریض تھے۔ اسی مرض سے ۱۰۔نومبر ۱۹۹۷ء کو دن کے دو بجے گوجراں والا کے اسپتال میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

شام کو میرے اور ان کے عزیز دوست ضیاء کھوکھر نے مجھے ان کی وفات کی بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی۔ اس سے تھوڑی دیر بعد گوجراں والا سے مدینہ کتاب گھر کے مالک عزیزی عبدالوکیل نے ٹیلی فون پر یہ اندوہناک خبر سنائی۔ دوسرے دن دس بجے جنازہ تھا۔ میں پہلے مدینہ کتاب گھر گیا اور پھر عبدالوکیل صاحب کے ساتھ جنازے میں شریک ہوا۔ وہاں بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی اور سب نے میرے ساتھ افسوس کیا۔

اسماعیل ضیاء سے میرے تعلقات اور دوستی کی مدت سنتالیس سال کے لیل ونہار پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشتمل ہے۔ میں ان کے بہت سے ذاتی اور گھریلو معاملات سے آگاہ ہوں۔ یہ سطور ۱۳۔دسمبر ۲۰۰۶ء کو لکھی جارہی ہیں۔ اس حساب سے ان کی وفات پر نو سال بیت چکے ہیں۔ لیکن یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ اسماعیل ضیاء فوت ہوگئے ہیں۔ مگر ہمارے جی کا کیا ہے مانے یا نہ مانے، وہ بہر حال اپنے اللہ کے دربار میں پہنچ گئے ہیں۔

اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه

تدفین کے بعد واپس آئے تو عبدالوکیل نے بتایا کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں اسماعیل ضیاء کامیاب ہوگئے تو ووٹروں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنے حلقہ انتخاب کے مختلف علاقوں میں گئے۔ ان کی دکان پر بھی پہنچے۔ ان کے والد عبدالجلیل نے ان سے کہا: ''ضیاء صاحب ہم آپ کے قدردان ہیں، لیکن ہم نے ووٹ آپ کو نہیں دیا۔''

ضیاء صاحب نے جواب دیا: ''مجھے معلوم ہے، آپ نے مجھے ووٹ نہیں دیا، آپ کا ایک نقطہ نگاہ ہے میں اس نقطہ نگاہ کا احترام کرتا ہوں۔''

عبدالجلیل بھی مرحوم ہوگئے ہیں اور اسماعیل ضیاء بھی اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔ میرا دونوں مرحومین سے تعلق تھا اور دونوں کے والد مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ ان کے بچے میرا احترام کرتے ہیں۔

یہ شریف النفس اور حلیم الطبع لوگ تھے۔ اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ ہم عاجز بندوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے اور انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین رب العالمین۔

اسماعیل ضیاء کی نرینہ اولاد چار بیٹے ہیں۔

۱۔ راشد عرفان: حبیب بینک میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں۔

۲۔ شاہد رضوان: گوجراں والا میں کاروبار کرتے ہیں۔ اپنے جدِ امجد حاجی محمد علی کی طرح طویل قامت ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر زاہد نعمان: ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور گوجراں والا میں ہیں۔

۴۔ سعد عدنان: گوجراں والا میں کوئی کاروبار کرتے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشفق خواجہ

(وفات ۲۱۔فروری ۲۰۰۵ء)

۱۹۸۵ء میں یہ خاک نشین ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا تھا۔ ادارے کے ماہنامے ''المعارف'' کی ادارت بھی میرے ذمے تھی۔ میرا کمرہ دوسری منزل میں تھا۔ غالباً مارچ کا مہینا تھا، ایک دن گیارہ بجے کے قریب میں نیچے اتر رہا تھا کہ سیڑھیوں میں دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی، جن میں ایک پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی تھے۔ انھوں نے حسبِ عادت مسکراتے ہوئے کہا: ''السلام علیکم'' میں نے بھی اپنے معمول کے مطابق اسی انداز سے ان کے سلام کا جواب دیا۔

ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے، وہ بھی بہت اچھی طرح ملے۔ تحسین فراقی صاحب نے اپنے خاص دلآویز اسلوب میں مجھے کہا: ''آپ نے انھیں پہچان لیا''؟

واقعہ یہ ہے کہ میں انھیں پہچان نہیں سکا تھا۔ اب ہم تینوں سیڑھیوں میں کھڑے ہیں۔ وہ اوپر جارہے تھے اور میں نیچے آرہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر رہے ہیں۔ میں ان صاحب کے چہرے سے تعارف کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن ناکام رہتا ہوں۔ ناکامی کا اعتراف میری زبان تو نہیں کرتی، لیکن میری خاموشی صاف بتا رہی ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس پر شرمندہ بھی ہوں اور شرمندگی کے آثار میرے چہرے پر ابھر آئے تھے۔ ان میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب انھوں نے خالص پنجابی میں کہا: بھٹی صاحب ہمیں پہچانیں یا نہ پہچانیں، ہم ان کے نیاز مند ہیں اور جو کچھ یہ لکھتے ہیں، اسے شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

تحسین فراقی میری ناکامی پر بہ دستور مسکرا رہے ہیں اور میں شرم و ندامت کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں نے اپنی بے بس اور ندامت سے بھری نگاہوں سے وہاں کھڑے کھڑے ان کو غور سے دیکھا۔ پورا قد، سرخی مائل گورا رنگ، گول چہرہ داڑھی مونچھ سے صاف، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ، خوب رو اور خوش اندام، پینٹ شرٹ پہنے ہوئے۔ مردانہ حسن و وجاہت کے تمام لوازم سے متصف۔

وہ السلام علیکم کہہ کر اوپر چلے گئے اور اس میں نیچے آگیا۔ سوچنے لگا یہ کون صاحب ہیں جو اتنی محبت سے ملے، اور کس درجے افسوس کی بات ہے کہ میں انھیں پہچان نہیں سکا۔ تحسین فراقی نے نہ خود ان کا تعارف کرایا اور نہ میں تحسین فراقی سے ان کا اسم گرامی پوچھنے کی جرأت کر سکا۔ وہ میری بے بسی کا تماشہ دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ تحسین فراقی استاد ہیں اور استاد کا کام صحیح بات بتا دینا ہے۔ لیکن وہ مجھ سے استادی کر گئے، جس کا مجھے بہت احساس ہوا۔

چھ سات منٹ اس الجھن میں گزرے ہوں گے کہ اچانک ذہن پر دستک ہوئی: ''یہ مشفق خواجہ ہیں۔''

اس سے پہلے کبھی ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، البتہ غائبانہ تعارف تھا، ان کے وسعتِ مطالعہ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا کتب خانہ مختلف موضوعات کی ہزاروں کتابوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ ان کتابوں کے مندرجات کو اپنے گنجینۂ ذہن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کی بہت سی تحریریں بھی دلچسپی سے پڑھی تھیں اور ان سے مستفید ہوا تھا۔

اسی وقت اوپر گیا اور مشفق خواجہ کی تلاش شروع ہوئی۔ جہاں جہاں ان کی موجودگی کا امکان تھا، وہاں پہنچا، لیکن وہ نہیں ملے۔ اس زمانے میں پاکستان ریسرچ سوسائٹی کا دفتر وہیں تھا اور اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالشکور احسن تھے، ان سے پتا کیا تو خواجہ صاحب وہاں نہیں تھے۔ نیچے بزم اقبال کا دفتر ہے اور اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر وحید قریشی تھے، ان کے ہاں گیا تو پتا چلا کہ تھوڑی دیر پہلے آئے تھے، کچھ دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ مجلس ترقی ادب کا دفتر بھی اسی بلڈنگ میں ہے، اس کے ڈائریکٹر احمد ندیم قاسمی مرحوم تھے، ان سے پوچھا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ تشریف لائے تھے، لیکن کہیں جانا چاہتے تھے، اس لیے چند منٹ کے بعد چلے گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب یقین ہوگیا تھا کہ وہ مشفق خواجہ ہیں، لیکن اتنی جلدی چلے کہاں گئے؟ آناً فاناً امام غائب ہوگئے؟ اب ان سے ملاقات کیسے ہوگی اور کب ہوگی؟ پہلے تو یہ الجھن رہی کہ یہ کون صاحب ہیں، اور اب یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ ان سے ملا کیسے جائے؟ بے حد پریشانی ہوئی کہ شکار جو خود ہی ہاتھ آیا تھا، اسے اپنی بے سمجھی کی بنا پر چھوڑ دیا۔ اس شکار کے دوبارہ گرفت میں آنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں واپس کراچی نہ چلے جائیں اور میری ان سے ملاقات نہ ہوسکے۔

دوسرے دن گیارہ بجے کسی نے بتایا کہ مشفق خواجہ اس وقت ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں اسی وقت اٹھا اور ڈاکٹر وحید قریشی کے دفتر گیا۔ خواجہ صاحب واقعی وہاں تشریف فرما تھے۔ اپنی نشست سے اٹھے اور بغل گیر ہوکر ملے۔ گفتگو کا سلسلہ چلا تو کل والی کسر پوری ہوگئی۔ تقریباً آدھ گھنٹا ان سے باتیں ہوئیں۔

اب آئندہ سطور میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مشفق خواجہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ ان کے اسلاف کی علمی اور معاشرتی حیثیت کیا تھی؟ کن لوگوں سے ان کے مراسم تھے؟ اپنے عہد کی کن معروف شخصیتوں کی ان کے گھر آمدورفت تھی؟ پھر خود مشفق خواجہ کا علمی مرتبہ کیا تھا؟ ان کے مشاغل کیا تھا اور ان کے تحقیقی، تصنیفی اور معلوماتی دوائر کہاں تک پھیلے ہوئے تھے؟

ان سوالات کے جوابات سنیے!

لاہور میں بھاٹی دروازے کے اندر ایک بازار کا نام تحصیل بازار ہے۔ اس میں ایک محلے کا نام ''ٹھڑیاں بھابھڑیاں'' تھا۔ آزادیٔ ملک سے قبل اس محلے میں ایک مکان للّی لاج کے نام سے موسوم تھا۔ اس مکان کے مالک تین بھائی تھے، جن کے نام یہ تھے:

۱۔ خواجہ کریم بخش

۲۔ خواجہ رحیم بخش

۳۔ خواجہ امیر بخش

یہ تینوں چند ہندوؤں کے جینی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے محلے میں رہتے تھے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جینی مذہب کے بارے میں بھی چند باتیں بیان کردی جائیں.......... جینی مذہب کے لوگ ہندوؤں کی مذہبی کتاب ویدوں کو نہیں مانتے۔ بعض دیگر امور میں بھی ان کے رجحانات عام ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ وہ کسی قسم کی ''جیوہتیا'' یعنی کسی جان دار چیز کے مارنے یا اسے تکلیف میں مبتلا کرنے کو سخت پاپ اور گناہ قرار دیتے ہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے، میں نے اپنے وطن کوٹ کپورہ کی ایک سڑک پر بیس بائیس آدمیوں کو دیکھا کہ دو دو کی قطار بنائے ہوئے جا رہے ہیں۔ داڑھی مونچھیں صاف اور سر منڈے ہوئے۔ ناک اور کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی۔ منہ پر اس طرح روئی باندھی ہوئی، جس طرح بچے کے منہ پر ''بب'' باندھی جاتی ہے۔ پاؤں میں جوتوں کے بجائے تلوؤں کے نیچے روئی باندھ رکھی ہے۔ جسم پر سفید دھوتی لپیٹی ہوئی ہے۔ اس ہیئت کذائی میں لوگ انھیں تعجب سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ تو انھیں دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ہندو ہیں، لیکن ہندوؤں کے کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، اس کا علم نہیں تھا۔ میرے پاس ایک ہندو کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا یہ کس فرقے کے لوگ ہیں؟

اس نے بتایا یہ جینی دھرم کے ماننے والے ہیں اور انھوں نے یہ روئی اس لیے ناک، کان اور منہ میں اور پاؤں کے تلوؤں سے باندھ رکھی ہے کہ کہیں ''جیوہتیا'' نہ ہو جائے، یعنی کوئی چھوٹی بڑی زندہ چیز ان کے منہ ناک اور کان میں داخل نہ ہو سکے اور نہ کوئی چیونٹی وغیرہ پاؤں کے نیچے آ کر مرے۔ بہ الفاظ دیگر کوئی چیز ان کی وجہ سے مر کر انھیں گناہ گار نہ کرے۔

گفتگو مشفق خواجہ کے آبا و اجداد کے بارے میں ہو رہی تھی۔ ان کے اسلاف کی وجہ سے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۸ء تک پورے تیرہ سال ان کے محلے تھڑیاں بھابھڑیاں کے اس مکان (لِلّی لاج) کو لاہور کے ایک تہذیبی، ثقافتی، علمی اور ادبی مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ ہر روز شام کے بعد اس دور کے لاہور کے بہت سے معروف ادیب، شاعر، سیاست دان، اخبار نویس، مصنف، وکیل اس مکان میں جمع ہوتے اور رات گئے تک مختلف مسائل پر ان کے درمیان سلسلۂ گفتگو جاری رہتا۔ ان حضرات کی طویل فہرست میں سر شیخ عبدالقادر، سر چودھری شہاب الدین، سر ڈاکٹر اقبال، مولانا ظفر علی خان، خلیفہ نظام الدین، اخبار ''وطن''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مالک و مدیر مولوی انشاء اللہ خاں کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس مجلس میں شعروشاعری کا دور چلتا، ادبی گفتگو ہوتی، سیاسی حالات زیر بحث آتے، علم و تحقیق کے مسائل کا تجزیہ کیا جاتا اور مختلف شخصیات کو موضوع کلام بنایا جاتا۔ ۱۹۱۸ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ان محافل رنگیں اور مجالس پُراز معلومات کے انعقاد کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا...... کیوں ختم ہو گیا؟

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خواجہ کریم بخش ملازمت سے ریٹائر ہو کر وسطی ہند کی ایک ریاست ''دھار'' میں چلے گئے۔ خواجہ رحیم بخش موجودہ مشرقی پنجاب کے ایک شہر میں ملازم ہو گئے اور انھوں نے اسی شہر کو اپنا مسکن بنا لیا۔ خواجہ امیر بخش اس سے چار سال قبل ۱۹۱۴ء میں وفات پا گئے تھے۔ اس طرح اس مکان کی علمی رونقیں درہم برہم ہو گئیں، اس کی ادبی چہل پہل کے نشانات مٹ گئے اور اس کی ثقافتی و تہذیبی روایت جو اس کے ساتھ وابستہ تھی، ختم ہو گئی۔ اب وہ ماضی کی ایک داستان ہے جس کا نئے دور کے لوگوں کو کوئی علم نہیں ہو گا۔ اگر کسی کو تھوڑا بہت علم ہو گا بھی تو اسے بیان نہیں کیا جاتا اور بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی۔

اس قسم کے کتنے ہی مقامات ہوں گے، جہاں کسی زمانے میں روزانہ علم کی برکھا ہوتی ہوگی، جن کے افق سے تحقیق کی گھٹائیں اٹھتی ہوں گی، جن کے آنگن میں ادب وشعر کی جھڑیاں لگتی ہوں گی، جن کے صحن میں تہذیب وثقافت کے پھول کھلتے ہوں گے، جہاں لطائف وظرائف کے گلستاں سجتے ہوں گے اور جہاں مختلف ذہن یک جا ہو کر بوقلموں افکار اگلتے اور ماضی کے خوش گوار واقعات کو حال کی فضاؤں سے گزار کر مستقبل کے منصوبے بناتے ہوں گے۔ لیکن اب وہ سب مقامات کھنڈروں میں بدل گئے ہیں اور ان میں جمع ہونے والے لوگ موت کی وادی میں پہنچ گئے ہیں۔ اس طرح بہت سے لِلّی لاج تاریخ کے گڑھے میں چلے گئے ہیں۔ کیا ہمارا فرض نہیں کہ ہم اپنے ماضی کو ٹٹولیں اور دورِ گزشتہ کی اپنی علمی تاریخ کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں؟

ابھی اوپر کی سطور میں ہم نے لاہور کی ''لِلّی لاج'' کے تین بھائیوں کے نام پڑھے۔ ان میں ایک بزرگ کا اسم گرامی خواجہ کریم بخش ہے۔ خواجہ کریم بخش کے ایک صاحب زادے خواجہ عبدالوحید تھے، جو عربی، اردو، فارسی اور انگریزی کے معروف عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خواجہ عبدالوحید ۳۔ جنوری ۱۹۰۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ لاہور سے کراچی چلے گئے تھے۔ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں ان کی وفات ہوئی۔ ان سے متعلق میں نے اپنی کتاب ''نقوشِ عظمت رفتہ'' میں چھوٹا سا مضمون لکھا ہے، جس میں اپنی معلومات کی روشنی میں ان کی زندگی کے بعض واقعات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مضمون میں خواجہ عبدالوحید مرحوم کی وصیت بھی درج کی گئی ہے، جسے لکھتے ہوئے مجھ سنگ دل کی آنکھوں میں بھی بے ساختہ آنسو تیرنے لگے تھے۔ مجھے بعض دوستوں نے بتایا کہ انھوں نے اس وصیت کو خوب صورت الفاظ میں لکھوا کر شیشے میں فریم کرا کے اپنے گھر میں ایسی جگہ پر لٹکایا ہے، جہاں ہر پڑھا لکھا فرد آسانی سے پڑھ سکے۔ بے حد مؤثر وصیت ہے۔

ہمارے مہربان و مشفق دوست جناب مشفق خواجہ، انہی خواجہ عبدالوحید کے صاحب زادۂ گرامی قدر ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ سطور سے ہمیں معلوم ہوا، اس خاندان کے ارکان کا علم وادب، تصنیف وتالیف اور تحقیق وکاوش سے ہمیشہ گہرا رابطہ رہا ہے۔ خواجہ عبدالوحید کے بڑے بھائی خواجہ عبدالمجید تھے، ان کے دائرۂ معلومات کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اردو لغت سے متعلق ''جامع اللغات'' کے نام سے ایک ضخیم اور مستند کتاب لکھی جو اہل علم میں متداول ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا اور وہ خواجہ عبدالوحید کے سگے بھتیجے تھے۔ ان کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو ان کی وفات کے بعد عجائب گھر کی لائبریری میں منتقل ہوا (مولانا غلام رسول مہر کے کتب خانے کا بھی اچھا خاصا حصہ ان کے انتقال کے بعد عجائب گھر کی لائبریری میں محفوظ ہوگیا ہے) ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید کئی سال میو ہسپتال لاہور کے منتظم رہے۔ وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی مجلس منتظمہ کے بھی رکن تھے۔ میں اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بہ حیثیت ریسرچ فیلو خدمات انجام دیتا تھا اور میرے وہیں ان سے تعلقات پیدا ہوئے تھے۔

دراصل میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مشفق خواجہ لاہور کے ایک قدیم اور مشہور علمی خانوادے کے ممتاز رکن تھے اور اس شہر کی کشمیری برادری سے ان کا تعلق تھا۔

مشفق خواجہ کے خاندانی پس منظر کا مختصر الفاظ میں ذکر کرنے کے بعد اب آیئے خودان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذاتی حالات تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

''مشفق خواجہ'' کا اصل نام جو پیدائش کے وقت والدین نے رکھا، عبدالحی تھا، جس کے ساتھ خاندانی لفظ ''خواجہ'' کا سابقہ لگایا گیا اور انھیں خواجہ عبدالحی کہا جانے لگا۔ ان کی ولادت ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم لاہور کے سناتن دھرم ہائی سکول میں حاصل کی۔ گھر میں چوں کہ ہر وقت پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور مختلف موضوعات کی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں موجود تھیں، اس لیے انھیں ابتدا ہی سے پڑھنے لکھنے کی عادت پڑ گئی تھی اور مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ سکول میں چوتھی یا پانچویں جماعت تک پہنچے تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ اس وقت ان کے والد خواجہ عبدالوحید سرکاری ملازم تھے اور ان کا تبادلہ لاہور سے کراچی کر دیا گیا تھا اور وہ اہل وعیال سمیت کراچی چلے گئے تھے۔ مشفق خواجہ نے پرائمری سے آگے کی تمام تعلیم کراچی میں حاصل کی۔

۱۹۵۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر کراچی کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔

۱۹۵۷ء میں ایم اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

اب ان کی تحریری دلچسپیوں اور تحقیقی وتصنیفی کاوشوں کی ایک جھلک۔

اللہ نے مشفق خواجہ کو جو ذہنی دولت عطا فرمائی تھی، اس سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت بھی بارگاہِ الٰہی سے انھیں ودیعت کی گئی تھی، اس لیے پڑھنے لکھنے ہی کو معمول بنا لیا۔ سب سے پہلے بچوں کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک چھوٹی چھوٹی کئی کتابوں کی صورت میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں روزنامہ ''امروز'' ایک مشہور اخبار تھا جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا ایک ایڈیشن کراچی میں بھی چھپتا تھا۔ کراچی کے روزنامہ ''امروز'' میں بچوں کے لیے مشفق خواجہ کی بہت سی تحریریں معرض اشاعت میں آئیں۔

۱۹۵۲ء میں جب وہ میٹرک کا امتحان پاس کر کے کراچی کے اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے تو اسی سال انھوں نے اردو زبان کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو کالج میگزین میں چھپا۔ یہ ان کا پہلا ادبی مضمون تھا یا یوں کہیے کہ وہ ان کے فکر کی توانائی، قلم کی استعداد اور معلومات کی قوتِ اظہار کا اولین مظہر تھا، جو اس حقیقت کی پیش گوئی کر رہا تھا کہ مستقبل میں ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا طرزِ نگارش کس درجہ زوردار ہوگا اور ان کا رہوارِ قلم کس قدر تیز رو اور خوش رفتار ہوگا۔

جس زمانے میں مشفق خواجہ بی اے آنرز کی منزل طے کر رہے تھے، اس زمانے میں ان کا زیادہ وقت انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی لائبریری میں گزرتا تھا۔ وہاں وہ اپنے مطلب کی کتابوں کے مطالعے میں مشغول رہتے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے ہوئی اور پھر یہ ملاقات مولوی صاحب کی خدمت میں ان کی باقاعدہ حاضری کا ذریعہ بن گئی۔ مولوی صاحب ان کی ذہانت اور تحقیقی امور میں دلچسپی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان کو انجمن کے ماہنامے ''قومی زبان'' کا اعزازی مدیر مقرر کر دیا۔ پھر ان کی قابلیت کی بنا پر سہ ماہی ''اردو'' کی ادارت ان کے سپرد کر دی گئی۔ ۱۹۵۸ء میں خواجہ صاحب ایم اے کے امتحان میں کامیاب ہو گئے تو انھیں ''قاموس الکتب'' کا مدیر بھی بنا دیا گیا۔ خواجہ صاحب انجمن کے شعبۂ تحقیق و مطبوعات کے نگران بھی رہے۔

علمی میدان میں قسمت نے خواجہ صاحب کی بے حد یاوری کی۔ انھیں ایک ایسا کام کرنے کا موقع میسر آیا، جس کی وجہ سے انھیں اردو زبان کے تیوروں کو سمجھنے اور اس کی نزاکتوں کے مختلف زاویوں کو حیطۂ فہم میں لانے میں بڑی مدد ملی۔ وہ کام یہ تھا کہ مولوی عبدالحق نے اپنی ''لغت کبیر'' کا مسودہ تیار کر کے الفاظ کے جو کارڈ بنائے، وہ خواجہ صاحب پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب مسودے میں انھیں درج کرتے جاتے تھے۔ اس سے خواجہ صاحب کو اردو زبان کے بہت سے گوشوں سے باخبر ہونے کے مواقع میسر آئے۔

۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۱ء تک چار سال مولوی عبدالحق صاحب سے ان کا قرب رہا اور حق یہ ہے کہ اس اثنا میں انھوں نے تحقیقی کام سرانجام دینے میں مولوی عبدالحق سے بہت استفادہ کیا۔

۱۹۷۳ء تک انھوں نے انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستگی اختیار کیے رکھی اور اس مدت میں جیسا کہ پہلے بتایا گیا، انجمن کے ماہنامے ''قومی زبان'' اور سہ ماہی ''اردو'' کی زمام ادارت ان کے سپرد رہی۔ علاوہ ازیں ''قاموس الکتب'' کے مدیر اور انجمن کے شعبۂ تحقیق و مطبوعات کے نگران بھی یہی تھے۔ طویل عرصے تک وہ یہ خدمت انجام دینے پر مامور رہے۔

اب آیئے ان کی تصنیفی اور تنقیدی سرگرمیوں کی طرف:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ **خوش معرکہ زیبا:** یہ تذکرۂ شعرا ہے جو ۱۸۴۸ء میں سعادت خاں ناصر نے تصنیف کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس تذکرے کو ایک مفصل مقدمے کے ساتھ مرتب کیا جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۷۰ء میں اور دوسری جلد ۱۹۷۱ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی۔ خواجہ صاحب کی یہ پہلی ناقدانہ اور محققانہ تدوین ہے۔

۲۔ **پرانے شاعر، نیا کلام:** بعض ایسے شعرا پر تحقیقی مضامین جن پر اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھا اور جن کا کلام پہلے شائع نہیں ہوا۔ ان شاعروں کی اچھی خاصی فہرست ہے۔ خواجہ صاحب نے ان شاعروں کے مفصل حالات بھی لکھے ہیں اور ان کے کلام کا انتخاب بھی کیا ہے۔ یہ کتاب سہ ماہی ''غالب'' میں بالاقساط شائع ہوئی۔

۳۔ **غالب اور صفیر بلگرامی:** عام طور سے غالب شناس حلقوں میں غالب کے شاگردوں کی تعداد کم وبیش دوسو بیان کی جاتی ہے، جن مین سے ایک شاگرد کا نام سید فرزند احمد صفیر بلگرامی تھا۔ وہ مشہور تذکرے ''جلوۂ خضر'' کے مصنف تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں انھوں نے نظم ونثر کی صورت میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ مرزا غالب نے صفیر بلگرامی کے نام جو خطوط لکھے، ان کی تعداد چھے ہے۔ اس کتاب میں مشفق خواجہ نے نہایت محنت کے ساتھ وہ تمام مواد جمع کر دیا ہے، جو انھیں غالب اور صفیر سے متعلق دست یاب ہوا۔ اس میں غالب کے خطوط کے ساتھ صفیر کے خطوط بھی دے دیے گئے ہیں، جن سے غالب کے خطوط کے مطالب واضح ہوجاتے ہیں۔ مشفق خواجہ کی یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں کراچی سے اور ۱۹۸۵ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔

۴۔ **جائزۂ مخطوطات اردو:** یہ ایک اہم منصوبہ تھا، جس پر ۱۹۶۷ء میں کام شروع کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے مختلف سرکاری، نیم سرکاری اور اہل علم کے ذاتی کتب خانوں میں جو اردو مخطوطات موجود ہیں، ان کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی جائیں۔ پھر ہر مخطوطے کے دوسرے نسخوں اور مطبوعہ نسخوں کی نیز مصنف کے حالات اور ماخذ کی تفصیل بیان کی جائے۔ یہ ایک قدیم کا سوانحی اور کتابیاتی جائزہ ہے۔ اس کی پہلی جلد جو ۱۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۶۹ء میں مرکزی اردو بورڈ (موجودہ اردو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سائنس بورڈ) لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کام بہت وسیع، بہت محنت طلب اور وقت طلب تھا۔ اندازہ لگایا گیا تھا کہ یہ کام دس جلدوں پر محیط ہوگا۔ معلوم نہیں خواجہ صاحب کی زندگی میں یہ کام کتنا ہوا اور کہاں تک پہنچا۔

۵۔ **تخلیقی ادب:** یہ پانچ جلدوں میں پھیلا ہوا بے حد اہمیت کا حامل سلسلہ ہے جو ہم عصر تخلیقی ادب کے جائزوں اور انتخابات پر مشتمل ہے۔ یہ پانچوں جلدیں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک کراچی سے شائع ہوئیں۔

۶۔ **اقبال:** کسی زمانے میں جو اصحابِ علم مشفق خواجہ کے بزرگوں سے دوستانہ مراسم رکھتے اور ان مجلسوں میں شریک ہوتے رہے تھے جو ان کے گھر میں جمتی تھیں، ان میں ایک شخص مولوی احمد الدین وکیل تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال کی زندگی میں ان پر ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام ''اقبال'' رکھا گیا تھا۔ اس کتاب میں اقبال کی ابتدائی دور کی وہ نظمیں بھی شامل تھیں جو اقبال شائع نہیں کرنا چاہتے تھے، اور اقبال کے اس وقت تک کے حالات بھی مرقوم تھے۔ لیکن اقبال اس کتاب کی اشاعت پر بوجوہ رضامند نہیں تھے، تاہم کتاب چھپ گئی۔ پھر یہ ہوا کہ اقبال کی عدم رضامندی کی بنا پر مولوی احمد الدین نے اسے نذرِ آتش کر دیا۔ معلوم نہیں کس طرح اس کے دو نسخے بچ گئے جو مشفق خواجہ کے ہاتھ آ گئے۔ اس سے تین سال بعد ۱۹۲۶ء میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ مولوی احمد الدین نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کر دیا۔ اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اردو میں اقبال کے متعلق یہ پہلی کتاب ہے جو ان کی زندگی میں چھپی۔

یہاں عرض کرنا یہ مقصود ہے کہ مشفق خواجہ نے اقبال کے بارے میں ۱۹۲۳ء میں شائع شدہ مولوی احمد الدین کی کتاب کو مرتب کیا۔ ۱۹۲۶ء میں شائع ہونے والی کتاب کو بھی پیش نگاہ رکھا۔ اس پر مقدمہ لکھا اور اسے ۱۹۷۹ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس کتاب کے متعلق ہندوستان کے مشہور ادیب و مصنف خلیق انجم نے ''ہماری زبان'' (دہلی) کے فروری ۱۹۸۰ء کے شمارے میں مضمون لکھا، جو بعد میں ان کی مرتبہ کتاب ''مشفق خواجہ......ایک مطالعہ'' میں چھپا۔

۷۔ **تحقیق نامہ:** یہ تحقیقی مقامات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۹۱ء میں بہ یک وقت لاہور اور دہلی سے شائع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۔ ابیات: خواجہ صاحب بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ''ابیات'' ان کا ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۵ء تک کا مجموعۂ کلام ہے۔

۹۔ کلیات یگانہ: مرزا یگانہ لکھنوی کی کلیات جو خواجہ صاحب نے مرتب کی لیکن ابھی شائع نہیں ہوئی۔ (اب شائع ہو چکی ہے۔ اکادمی بازیافت، کراچی۔ جنوری ۲۰۰۳ء۔ زاہد منیر عامر)

۱۰۔ فرمان سلیمان: مرزا سلیمان قدر کا روزنامچہ، نوشتہ لطافت لکھنوی۔ مرتب مشفق خواجہ (غیر مطبوع)

تحقیق کا یہ انتہائی محنت طلب اور خشک کام ہے جس کے سپرد مشفق خواجہ نے اپنے آپ کو کیسے رکھا، یعنی نہایت نفیس، خوش مزاج، خوش اندام، خوش کلام، خوب رو اور خوش لباس شخص نے اپنے لیے ایسا کام منتخب کیا، جو بے حد مغز ماری، انتہائی سر کھپائی اور نہایت ذہنی دھکم پیل کا کام ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس خشک تریں کام کا کوئی تھوڑا بہت اثر ان کے ذہن یا لباس یا گفتگو میں نہیں پایا جاتا تھا۔ نہ چہرے بشرے پر اس کا کوئی احساس دکھائی دیتا تھا۔ مجھ سے ملتے تو اسی قسم کی صاف سیدھی پنجابی میں باتیں کرتے، جو میرے ساتھ کرنی چاہییں، جن میں ذہن اور دماغ کو کوئی تکلیف پہنچنے کا احتمال نہ ہو۔ یعنی جن میں سوچنے سمجھنے کا کوئی خطرہ نہ پایا جاتا ہو۔

اس خشک کام کے ساتھ پچیس چھبیس سال خواجہ صاحب الحمدللہ ایک تر کام بھی کرتے رہے، وہ کام ہے کالم نگاری کا۔ کراچی کے ہفت روزہ ''تکبیر'' میں ''خامہ بگوش'' کے نام سے قلمی کالم لکھے۔ اس کالم میں وہ موقع و محل کی مناسبت سے مزاح، طنز، تنقید، سب ادبی رویوں کو ان کے اصل مقام پر بہ غایت ہنرمندی سے جمع کر دیتے تھے۔ اس اعتبار سے اس کالم کو ''مجمع الکلام'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ کالم ہر حلقے میں پڑھا جاتا اور بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اس کا انتخاب مظفر علی سید نے کیا، جو ۱۹۹۴ء میں دہلی اور لاہور سے کتابی شکل میں چھپا اور بے حد مقبول ہوا۔ یعنی ان کے تمام کاموں سے بازی لے گیا۔ کراچی کے روزنامہ ''جسارت'' اور بعض دیگر اخبارات و جرائد میں بھی وہ لکھتے رہے۔

یہ کالم نگاری مشفق خواجہ کے لیے نہایت ضروری تھی۔ میرے جیسے پڑھنے والوں کے لیے زود ہضم اور اصحاب تحقیق کے لیے ہاضمے کا چورن......! دراصل خواجہ صاحب کے لیے یہ کالم ذہنی آسودگی کا باعث اور ان کے اس دائمی اور موروثی مرض کا موثر ترین علاج تھا جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھیں تحقیق کے نام سے لاحق تھا۔

ریسرچ یا تحقیق کا دھندا میں بھی کرتا رہا ہوں۔ جس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے میں ''برصغیر میں علم فقہ'' کتاب لکھ رہا تھا مجھے پتا چلا کہ تحقیق کس شے کا نام ہے۔ نہایت مشکل لیکن انتہائی دلچسپ کام......! میرا تعلق ہندوستان کے عربی اور فارسی کے پرانے فقہی مخطوطات سے تھا۔ اب تو پنجاب یونیورسٹی لائبریری نیوکیمپس کے کوہ قاف میں چلی گئی ہے۔ اس وقت انارکلی کے قریب اولڈ کیمپس میں تھی۔ میں دفتر سے جلد ہی لائبریری آجاتا اور کام شروع کر دیتا۔ مولانا محمد حنیف ندوی اور شاہ محمد جعفر پھلواروی میرا مذاق اڑاتے اور پوچھتے کل کتنے مخطوطوں کے سوراخ گنے؟ کتنے مخطوطوں کی گرد جھاڑی؟ بوسیدہ کاغذوں کی مٹی میں ہاتھ مارتے ہوئے کتنی چھینکیں آئیں؟ اور حلق اور ناک کے ساتھ کیا بیتی......؟ لیکن جب کتاب چھپی تو بہت خوش ہوئے اور ازراہِ کرم دونوں نے اس فقیر کی کاوش کو سراہا۔

''فقہائے ہند'' کے حوالوں کا تعلق بھی زیادہ تر عربی اور فارسی کی پرانی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں سے تھا۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے چیف لائبریرین سمیت تمام لائبریرین ہمارے دوست تھے۔

جب تحقیق کے دھندے سے ہم شام کو فارغ ہو جاتے تو لائبریری کے سب ارکان اپنی عالمانہ اور محققانہ حیثیتیں بھول جاتے اور لطائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ قسم قسم کے لطائف اور طرح طرح کے ظرائف۔ یہ فنونِ لطیفہ دراصل اس مرضِ تحقیق کا علاج تھا جس میں تمام دن ہم مبتلا رہے تھے۔ ہر روز کی بیماری اور ہر روز کا علاج اور نہایت موثر علاج۔

مخطوطات کا نام ہم نے اپنے دفتر میں ''مخبوطات'' رکھا تھا۔ ایک دن ہمارے ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام نے مجھ سے پوچھا: کتنا کام ہو گیا؟ میں نے انھیں بتایا کہ کل فلاں ''مخبوطے'' پر کام کیا تھا، آج فلاں پر کیا جائے گا۔ میں نے یہ عمداً انہیں کہا تھا، چوں کہ مولانا محمد حنیف ندوی اور شاہ محمد جعفر پھلواروی کے ساتھ اسی تلفظ سے بات ہوتی تھی، اس لیے اکرام صاحب سے گفتگو میں یہی تلفظ زبان پر آگیا۔ وہ اپنی بے حد بیوروکریٹک سنجیدگی کے باوجود کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بولے ''مخبوطہ'' بالکل صحیح نام ہے۔ اس پر کام کرتے کرتے آدمی مخبوط الحواس ہو جاتا ہے یعنی یہ خلل ہے دماغ کا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''برصغیر میں علم فقہ'' تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور ''فقہائے ہند'' پہلی صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری تک دس جلدوں پر محیط۔ برصغیر میں علم فقہ (ایک دو کے سوا) تمام تر عربی اور فارسی مخطوطات کے مواد کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور فقہائے ہند میں بھی بہت سی معلومات مخطوطات (یعنی قلمی کتابوں) سے اخذ کی گئی ہیں۔

ان ''سطورِ معترضہ'' کے بعد اب پھر مشفق خواجہ کی طرف آتے ہیں۔

خواجہ مشفق صاحب کی شادی محترمہ آمنہ صدیقی سے ہوئی جو لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔ ان کے خاندان کے بعض لوگ اب بھی لکھنؤ میں اقامت گزیں ہیں۔ شادی کے بعد وہ آمنہ مشفق خواجہ ہوگئیں۔ وہ کراچی کے سرسید گرلز کالج میں پروفیسر رہیں۔ وہ اردو کی ادیبہ بھی ہیں اور مصنفہ بھی۔ شادی سے پہلے انھوں نے ''افکارِ عبدالحق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو بڑی مقبول ہوئی تھی، ہندوستان میں تو وہ بہت سے ناشروں نے شائع کی تھی۔ گزارش کا مقصد یہ ہے کہ محقق و مصنف اور ادیب و شاعر مشفق خواجہ کی شادی مصنفہ و ادیبہ خاتون سے ہوئی۔

اب خواجہ صاحب کے بارے میں چند اور باتیں۔

یہ تو پہلے بتایا جا چکا کہ خواجہ صاحب نہایت خوش لباس تھے۔ جس طرح وہ خوب صورت تھے، اسی طرح خوب صورت لباس زیب تن کرتے تھے۔ بالعموم محقق لوگوں کا لباس بھی محققانہ اور متقدمانہ ہوتا ہے۔ وہ پرانی اور قدیم کرم خوردہ، دیمک گزیدہ اور سوراخ زدہ کتابیں پڑھتے ہیں، پرانے مسائل اور پرانے افراد کو موضوع تحقیق ٹھہراتے ہیں اور پھر اسی قسم کا ذہن بنالیتے ہیں اور انہی کی طرز کا لباس پہننا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح متقدمین کے ساتھ خود بھی جیتے جی متقدمین بن جاتے ہیں اور کتابیں ان کے لیے قبریں بن جاتی ہیں، جن میں وہ اپنے آپ کو دفن کیے رکھتے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب میں یہ بات نہیں تھی۔ وہ متجددین یا ''مجددین'' میں سے تھے۔

ایک دن دس بجے کے لگ بھگ وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لائے۔ سردیوں کے دن تھے۔ شان دار انگریزی سوٹ پہنے اور ٹائی باندھے ہوئے۔ چائے پی رہے تھے کہ ان کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے ٹیلی فون ان کے قریب کر کے انھیں رسیور دیا۔ انھوں نے رسیور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پکڑ کر تار کو تھوڑا سا اپنی طرف کھینچا اور چائے کی بھری پیالی ان کی پتلون اور کوٹ پر گر گئی۔ پتلون بھی چائے زدہ ہوگئی اور کوٹ بھی ملوث بہ چائے ہوگیا۔ میں رومال سے صاف کرنے لگا تو کہا، آپ رہنے دیجیے، میں صاف کرلوں گا۔ اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہے، لیکن مجھے بہت احساس ہوا۔ خدا جانے انھوں نے کہاں کہاں جانا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ چلے گئے، لیکن چائے کے داغ سامنے سے ٹخنوں تک نمایاں نظر آرہے تھے اور عجیب سے لگ رہے تھے۔ دوسرے دن تشریف لائے تو لباس بدلا ہوا تھا۔

خواجہ صاحب بہت اچھے عکاس بھی تھے۔ ایک دن وہ اس فقیر کی کٹیا میں تشریف لائے۔ میں لاہور کے جس علاقے میں رہتا ہوں، اس کا نام سانده ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی اور پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر ان کے ساتھ تھے۔ یعنی ڈاکٹروں کی ٹیم ان کے ہم رکاب تھی۔ مجھے ان کی لاہور تشریف آوری کا علم نہیں تھا۔ وہ اچانک میرے گھر آئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر حکم ہوا۔ ''اب اس طرف رخ کر کے میرے سامنے بیٹھو۔'' بیگ سے کیمرہ نکالا اور کئی تصویریں کھینچ ڈالیں۔ پھر میرے ساتھ بیٹھ گئے اور ایک ساتھی سے کہا، اب تم ہماری تصویر کھینچو۔

اس سے کچھ عرصہ بعد پھر لاہور آئے تو انھیں میرا پرانا ٹیلی فون نمبر یاد رہا ۲۱۲۱۱۴...... یہ نمبر گھماتے رہے، لیکن میرا نمبر بدل چکا تھا۔ رابطہ نہ ہوسکا۔ تو گھر تشریف لے آئے۔ اب جو دوست ان کے ہم راہ تھے، وہ تھے ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر زاہد منیر عامر اور رفاقت علی شاہد۔ خیر و عافیت کے تبادلے اور کچھ باتیں کرنے کے بعد پھر تصویر کشی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ان کا کتب خانہ مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات کی ہزاروں کتابوں پر مشتمل تھا جن میں مخطوطات (یعنی مخطوطات) کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ بہت سی کتابیں انھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملیں اور بہت سی خود جمع کیں۔ وہ کثیر المطالعہ اہل علم تھے۔ سنا ہے ان کی رہائش گاہ کے تمام کمرے کتابوں سے بھر گئے تھے اور کتابوں کے سیلاب نے باورچی خانے کا رخ کرلیا تھا۔ جو کتابیں انھیں میسر آتیں ان کا باقاعدہ مطالعہ کرتے۔ ان کی اہلیہ بھی جیسا کہ پہلے بتایا گیا مصنفہ و معلمہ ہیں اور اردو ادب سے خاص طور پر دلچسپی رکھتی ہیں، اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے انھیں بھی لازماً کتابوں سے لگاؤ اور کتابیں جمع کرنے کا شوق بھی ہوگا۔

خواجہ صاحب کی وفات کے بعد معلوم نہیں ان کی کتابوں کا کیا بنا؟

کتابوں کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ بعض قابل احترام خواتین کتاب کو اپنی سوکن سمجھتی ہیں۔ شوہر بیوی سے باتیں کرنے کے بجائے کتاب پڑھنا شروع کر دے تو اسے سخت غصہ آتا ہے کہ یہ اس کی سوکن کہاں سے آگئی۔

ایک پروفیسر دوست نے بتایا کہ وہ گھر گئے تو ان کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ بیوی نے پوچھا یہ کتاب کہاں سے لائے؟ بولے بیس روپے کی خرید کر لایا ہوں۔ فرمایا وہ جو پہلی پچاس ساٹھ کتابیں الماری میں پڑی ہیں، وہ پڑھ لی ہیں؟ پہلے وہ تو پڑھ لو۔ وہ پڑھی نہیں اور نئی کتاب لے آئے۔

بولے: کسی وقت ضرورت پڑ جاتی ہے اس لیے لایا ہوں۔

ارشاد ہوا: جب ضرورت پڑتی اس وقت لے آتے۔ اب تو پیاز کی ضرورت تھی۔ کچھ اور پیسے ڈال کر میں ریڑھے والے سے پیاز لے لیتی۔ کتاب اکیلے پڑھو گے، وہ بھی اس وقت جب ضرورت پڑے گی۔ پیاز کی آج ضرورت ہے۔ وہ ہانڈی میں ڈالا جاتا تو سارا ٹبر کھاتا۔ تمھیں پتا ہی نہیں کون سی چیز کب خریدنی ہے۔ پیسا اچھی جگہ خرچ کیا کرو۔

اب ذیل میں مشفق خواجہ کے چند اخباری کالموں کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''اب جب کہ کتابیں موصول ہونے لگی ہیں تو ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تبصرے لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جب آج تک کسی نے نظیر صدیقی کو شاعری سے اور مستنصر حسین تارڑ کو سفرنامے لکھنے سے نہیں روکا تو ہمیں تبصرہ نگاری پر کون ٹوکے گا؟ جو حضرات اپنی کتابوں پر تبصرے کے خواہش مند ہوں، ان سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھیں۔

☆ کسی کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری نہیں، دو سے زائد بھی بھیجے جا سکتے ہیں، کیوں کہ کتابیں کتب فروش کے ذریعے اہل ذوق حضرات تک پہنچانے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔

☆ کسی کتاب پر مصنف حضرات ہمارا نام لکھ کر دستخط نہ کریں کیوں کہ جن کتابوں پر کچھ لکھا ہو، انھیں دکان دار سیکنڈ ہینڈ سمجھ کر قیمت کم لگاتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک کتاب کا نام ''خوشیوں کا باغ'' بتایا گیا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خوشیوں کا باغ'' کتابت وطباعت کے اعتبار سے ایک نہایت عمدہ تخلیق ہے۔ کتابت ایسی ہے، جیسے موتی پرو دیے گئے ہوں اور طباعت ایسی ہے، جیسے موتیوں کو دھوپ میں ڈال دیا گیا ہو۔ رہے مفاہیم ومطالب تو وہ پاکستانی ایڈیشن میں نظر نہیں آئے، ممکن ہے ہندوستانی ایڈیشن میں ہوں۔

جوش ملیح آبادی کے ''مقالات جوش'' مرتبہ سحر انصاری کے بارے میں مشفق خواجہ رقم طراز ہیں۔

''جوش صاحب کی نثر اور شاعری میں حیرت ناک حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں میں الفاظ کی کثرت سے قدرتِ کلام ظاہر ہوتی ہے۔ لفظ پر لفظ اور قافیے پر قافیہ اس طرح گرتا ہے جیسے کسی میدانِ جنگ میں کشتوں کے پشتے لگ رہے ہوں۔ یہ مقالات ادبی، سیاسی اور سماجی نوعیت کے ہیں۔ ان سے ادب، سیاست اور سماج کا کوئی مسئلہ حل ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت دلچسپ مقالات ہیں۔ اگر آپ انھیں پڑھنا شروع کر دیں تو کتاب ختم کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ کتاب کے ساتھ آپ خود بھی ختم ہو جائیں۔''

''اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی اس کتاب پر جناب غریب شہر مفصل تبصرے کر چکے ہیں، اس لیے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک لطیفہ سنانے کی اجازت دیجیے۔ صفحہ ۴۲ پر طبی نسخہ جات کی کتابوں کی فہرست میں شیخ محمد اکرام کی کتاب ''حکیم فرزانہ'' کا نام بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب مرزا غالب کی سوانح عمری ہے، لیکن ''حکیم'' کے لفظ کی وجہ سے مقتدرہ قومی زبان نے اسے طبی کتابوں میں شامل کر لیا ہے۔ امید ہے کہ زیر تبصرہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں علامہ اقبال کی سوانح عمریوں کو شامل کر لیا جائے گا کہ وہ تو حکیم الامت ہیں۔''

مشفق خواجہ کے اس قسم کے بہت سے تبصرے ہیں جو بڑے تیکھے اور بڑے دلچسپ ہیں، اور میرے خیال میں بے حد محققانہ بھی ہیں۔ بتایے اقبال کو ''حکیم الامت'' کہنے کی یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجہ کس کے ذہن میں آسکتی تھی۔ ویسے تو مولانا اشرف علی تھانوی کو بھی حکیم الامت کہا جاتا ہے اوران کی سوانح عمریاں بھی لکھی گئی ہیں۔

مشفق خواجہ بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''ابیات'' کے نام سے چھپا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایے:

یہی غزل مری محرومیوں کا نوحۂ غم
یہی غزل ترا آئینۂ جمال بھی ہے
جو پاسکا نہ تجھے میں تو کھودیا خودکو
یہ میرا عجز بھی ہے، یہ میرا کمال بھی ہے

☆☆☆☆☆

دل ایک اور ہزاروں آزمائشیں غم کی
دیا جلا تو تھا، لیکن ہوا کی زد پر تھا
ہر اک عذاب کو میں سہہ گیا، مگر نہ ملاذ
وہ ایک غم جو مرے حوصلے سے بڑھ کر تھا
اداس راتوں میں، پیہم سلگتی صبحوں ذ میں
جو غم گسار تھا کوئی تو دیدۂ تر تھا

☆☆☆☆☆

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا
کتنے چہروں پہ رہا عکس مری حیرت کا
مہرباں مجھ پہ ہوئے آئینہ پیکر کیا کیا
چشم خوباں کے اشاروں پہ تھا جینا مرنا
روز بنتے تھے، بگڑتے تھے، مقدر کیا کیا

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ کیا طلسم ہے میں اس کو دیکھ بھی نہ سکوں
کہ جس کے جلووں سے دامانِ چشم بھر جائے
ہے ایک خواب مری خود غریب آنکھوں میں
اگر یہ خواب مری روح میں اتر جائے

☆☆☆☆☆

یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا
وقت اک خوابِ رواں ہے سو گزر جائے گا
ہر گزرتے ہوئے لمحے سے یہی خوف رہا
حسرتوں سے مرے دامن کو بھر جائے گا

☆☆☆☆☆

اس سے اگلے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

شدتِ غم سے ملا زیست کو مفہوم نیا
ہم سمجھتے تھے کہ دل جینے سے بھر جائے گا
چند لمحوں کی رفاقت ہی غنیمت ہے کہ پھر
چند لمحوں میں یہ شیرازہ بکھر جائے گا
اپنی یادوں کو سمیٹیں گے بچھڑنے والے
کسے معلوم ہے پھر کون کدھر جائے گا
یادیں رہ جائیں گی اور یادیں بھی ایسی جن کا
زہر آنکھوں سے رگ و پے میں اتر جائے گا

☆☆☆☆☆

بجھے ہوئے درودیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وفا کے باب میں اس سے تو کچھ کمی نہ ہوئی
میں آپ اپنی خوشی سے یہ بازی ہار گیا
ہوائے سرد کا جھونکا بھی کتنا ظالم تھا
خیال و خواب کے سب پیرہن اتار گیا

☆☆☆☆☆

اس دشتِ بلا میں کہ جہاں ہے گزر اپنا
جز سایۂ غم کوئی نہیں ہم سفر اپنا
تنہائی نے دیواروں پہ وہ نقش گری کی
لگتا ہے کسی اور کا گھر اب تو گھر اپنا
میں آپ ہی دروازہ ہوں اور آپ ہی دستک
اور آپ ہی بیٹھا ہوں یہاں منتظر اپنا

☆☆☆☆☆

شعر کے معاملے میں، میں صرف یہ جانتا ہوں کہ جو شعر اچھا ہے، وہ سنتے اور پڑھتے ہی دل میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ مشفق خواجہ کے یہ اشعار جو ہم نے پڑھے نہایت خوب صورت ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ اشعار اداس فضاؤں، غم انگیز لمحوں اور یاس میں ڈوبے اور محرومیوں کے کانٹوں میں الجھے ہوئے لہجے میں کہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ انھیں پڑھ کر خود میری حالت غیر ہوگئی۔ میں اپنے آپ کو اداسی میں گھِرا اور یاس میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگا ہوں۔

عین ممکن ہے میں ان اشعار کو سمجھ نہ سکا ہوں اور ان کے مطالب کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام رہا ہوں، کیوں کہ اس فن سے میرے کبھی زیادہ مراسم نہیں رہے، بس تھوڑی سی علیک سلیک ہے، وہ بھی دور سے۔ تاہم میرا خیال ہے، خواجہ صاحب کے اس قسم کے اشعار کسی خاص پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب سے میرا خط و کتابت کا سلسلہ کئی سال جاری رہا اور ان کے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ تقریباً ہر خط میں انھوں نے اس فقیر کے کسی نہ کسی مضمون یا کسی کتاب کا اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انداز سے ذکر کیا، جس سے میری حوصلہ افزائی کا پہلو نکلتا ہے۔

مشفق خواجہ کے علاوہ بھی متعدد معروف شخصیتوں کے مکتوباتِ گرامی اس فقیر کے پاس موجود ہیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں مجھے ارسال فرمائے۔ خیال یہ ہے کہ ضروری نوٹس اور ہر شخصیت کے تعارف کے ساتھ یہ مکتوبات کسی رسالے میں یا کتابی صورت میں شائع کیے جائیں۔ بعض اہم شخصیات کے خطوط گم ہوگئے ہیں، جس کا مجھے بے حد افسوس ہے تاہم جو محفوظ ہیں ان کی حفاظت تو کرنی چاہیے۔

خواجہ صاحب ۲۱۔ فروری ۲۰۰۵ء کو اس دنیاے فانی سے رخصت ہوگئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے میرے عزیز دوست ضیا کھوکھر صاحب نے ایک روز شب کے دس بجے مجھے اسلام آباد سے ٹیلی فون کیا کہ مشفق خواجہ یہاں تشریف لائے ہیں اور آج کافی دیر ہم اکٹھے رہے ہیں۔ وہ تمھیں بہت یاد کر رہے تھے۔ ضیا کھوکھر نے مجھے ان کا ٹیلی فون نمبر دیا اور کہا کہ رات کو گیارہ بجے وہ اس نمبر پر موجود ہوں گے، چناں چہ میں نے گیارہ بجے ٹیلی فون کیا، لیکن وہ تشریف نہیں لائے تھے۔ پھر سوا گیارہ بجے کیا، اس وقت بھی نہیں تھے۔ پھر پونے بارہ بجے کیا اس وقت بھی موجود نہیں تھے۔ ساڑھے بارہ بجے میرا ان سے رابطہ ہوا۔ چند باتیں ہوئیں، ٹیلی فون کرنے کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا اب تو میں واپس کراچی جا رہا ہوں۔ اکتوبر (۲۰۰۴ء) میں لاہور آؤں گا تو آتے ہی آپ سے ملوں گا، لیکن نہ وہ آئے اور نہ ان سے ملاقات ہوئی۔ ان سے میرا خط کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا، لیکن سوءِ اتفاق سے کچھ عرصہ یہ سلسلہ منقطع رہا۔

ان کی وفات کے بعد مجھے ڈاکٹر زاہد منیر عامر (پنجاب یونیورسٹی) نے ٹیلی فون پر ان کی وفات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے بتایا کہ وفات سے چند روز پہلے انھیں خواجہ صاحب کا خط آیا تھا، جس میں آپ کا ذکر ایک ''مخلص دوست'' کے طور پر کیا ہے اور اس خط میں اسلام آباد کے ٹیلی فون سے متعلق بھی بتایا۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میں مشفق خواجہ کا مخلص دوست تھا یا نہیں تھا، لیکن یہ حقیقت ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ وہ بہت پیارے اہل علم تھے۔ بے حد مشفق۔ بڑی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ میری محدودسی تحریری کوششوں پرخوش ہوتے تھے اور اپنی گوناگوں علمی مصروفیات کے باوجود مراسلت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ مجھے وہ بہت یاد آتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں ان کی تحقیقی سرگرمیوں کی بہت شہرت تھی اور ہر جگہ کے اردو دان طبقے میں ان کا احترام تھا اور ان کی تحریریں بڑی دلچسپی اور نہایت شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں تقریباً ان کی تمام کتابیں چھپ گئی ہیں اور وہاں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

اس قسم کے اونچے درجے کے محقق اور صاف ستھرے ذہن کے اصحابِ قلم اب کہاں پیدا ہوں گے۔ ان کی تحریروں سے جہاں صحت مندانہ واقعات کی گرہیں کھلتی اور تحقیق کی راہیں اجاگر ہوتی ہیں، وہاں قاری کو نیا اسلوبِ بیان بھی ملتا ہے اور زبان کے ادبی پہلوؤں سے بھی ذہن آشنا ہوتا ہے۔ وہ بہت کام کر گئے اور بہت کام کر رہے تھے اور بہت کام کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے، لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

موت کا دروازہ کوئی بند نہیں کرسکتا اور عزرائیل کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاسکتی۔ آیے مشفق خواجہ کے لیے بارگاہِ الٰہی میں عاجزی کے ساتھ دعا کریں۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مارگریٹ مارکیوس سے مریم جمیلہ تک

(وفات ۳۱۔ اکتوبر ۲۰۱۲ء)

گزشتہ ۷۰، ۸۰ برسوں میں جن خوش بخت لوگوں کو اسلام کے شامیانۂ رحمت میں پناہ لینے کا شرف حاصل ہوا، ان میں ایک امریکی خاتون مریم جمیلہ کا نام خاص طور پر قابلِ تذکرہ ہے۔ ان کے آباواجداد کا تعلق یہودی مذہب سے تھا اور ان کا اصل وطن جرمنی تھا۔ ۱۹۴۸ء میں یہ لوگ طلبِ معاش کے لیے امریکہ آئے اور وہاں کے شہر نیوروشیل میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہیں ۲۲۔ مئی ۱۹۳۴ء کو ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی، جس کا نام والدین نے مارگریٹ مارکیوس رکھا۔ بچی کچھ بڑی ہوئی تو اسے سکول میں داخل کرادیا گیا۔ ابتدائے عمر ہی میں اس کے چہرے پر متانت کے آثار نمایاں تھے اور سکول میں تمام وقت وہ پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتی تھی اور اس کا شمار ذہین بچوں میں ہوتا تھا۔ یورپی اور امریکی معاشرے میں ناچ گانے کا جو کلچر راسخ ہو چکا ہے اور جس تہذیب نے اس معاشرت میں پنجے گاڑ رکھے ہیں، اس سے اس بچی کو آغازِ شعور ہی میں نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ عام بچوں کی طرح کھیل کود سے بھی اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہاں کے رواج کے مطابق کسی ہم عمر لڑکے کو اس نے اپنا دوست نہیں بنایا۔ زیادہ لڑکیوں سے بھی اس نے مراسم پیدا نہیں کیے۔ اس کی اصل مصاحب کتابیں تھیں اور ان کا مطالعہ اس کی ذہنی غذا۔

۱۹۵۲ء میں جب اس نے عمر کی اٹھارھویں منزل میں قدم رکھا تو وہ ہائی سکول کی تعلیم سے فارغ ہوئی۔ پھر اسی سال کے ستمبر میں یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور کچھ عرصہ ایک فیکٹری میں بھی تعلیمی قسم کی کچھ خدمات سرانجام دیں۔ امریکی معاشرے میں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ بالغ ہوتے ہی لڑکے اور لڑکیاں اپنی معاشی کفالت کے خود ذمے دار ہو جاتے ہیں، لیکن مارگریٹ مارکیوس کے والدین نے بیٹی کے خرچ اخراجات کے تمام معاملات اپنے ذمے لیے رکھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یونیورسٹی میں اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو پہلے سمسٹر کے آغاز ہی میں ایک بیماری کی زد میں آگئی اور مجبوراً یونیورسٹی چھوڑنا پڑی اور اس کا رجحان مذہب کی طرف ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد نیویارک کے ایک کالج میں داخلہ لیا۔ کالج میں اس کا دورِ طالب علمی بہت مختصر رہا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ نیویارک یونیورسٹی میں چلی گئی۔ یونیورسٹی میں اس نے اسلام اور یہودیت کا مضمون خاص طور پر دلچسپی سے پڑھا اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہودیت کے بھی وہ تمام گوشوں کو حیطۂ فہم میں لانے کے لیے کوشاں ہوئی اور یہودیوں کی مختلف تنظیموں سے رابطہ پیدا کیا، لیکن وہ اپنے اس آبائی مذہب سے متاثر ہونے کے بجائے، ذہنی اور فکری طور پر اس سے دور ہوگئی۔

۱۹۵۶ء میں اس پر پھر بیماری نے حملہ کردیا اور وہ اسپتال میں داخل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی رسمی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ یونیورسٹی چھوڑ دی اور ڈگری حاصل نہ کرسکی۔

اب یہ عمر کی چھبیسویں منزل میں پہنچ گئی تھیں اور ان کے مطالعے کا اصل محور مذہب قرار پایا گیا تھا۔ وہ اس ضمن میں اپنے والدین سے رہنمائی حاصل کرنے کی سعی کرتیں تو وہ بیٹی کو کوئی ایسی راہ نہ بتا سکتے جو اس کے لیے ذہنی اطمینان کا باعث ہوسکتی۔ یہودیت، عیسائیت، بہائیت وغیرہ مذاہب کی کتابوں کا انھوں نے مطالعہ کیا اور ان مذاہب کی مختلف تنظیموں کے رہنماؤں سے ملاقات کی، لیکن کہیں سے اطمینانِ قلب کی دولت حاصل نہ ہوسکی۔ ان مذاہب کے مطالعہ کے ساتھ اسلام کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ علامہ محمد اسد کی کتاب روڈ ٹو مکہ پڑھی چند اور کتابیں بھی پڑھیں۔ مختلف مذاہب کی کتابوں کے نتیجے میں وہ شدید نفسیاتی دباؤ میں آگئیں تو ڈاکٹروں کے مشورے سے ۱۹۵۷ء میں انھیں نفسیاتی امراض کے ایک اسپتال میں داخل کرادیا گیا، جہاں وہ دو سال (۱۹۵۹ء تک) رہیں۔ ان دو سالوں میں انھوں نے اسلام اور دیگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ جاری رکھا اور فیصلہ کرلیا کہ اسپتال سے فراغت کے بعد اسلام سے متعلق کچھ مزید معلومات حاصل کرکے اسلام قبول کرلیں گی۔ چنانچہ وہ اسپتال سے نکلیں تو نیویارک میں رہنے والے مسلمانوں سے ملنے کا اہتمام کیا اور بعض مسلمان گھرانوں کا پتا چلا تو ان کے گھروں میں گئیں اور وہاں کے اسلامک سینٹر میں بھی باقاعدگی سے آمدورفت شروع کردی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب انھوں نے صرف اسلام کو اپنے مطالعہ کا مرکز قرار دے لیا۔ پہلے ایک انگریزی ترجمۂ قرآن حاصل کیا۔ یہ ایک متعصب عیسائی پادری جارج گاسل کا ترجمہ تھا۔ اس ترجمے سے انھیں مترجم کے تعصب کا پتا چل گیا۔ اس کے بعد انھیں نیوروشیل پبلک لائبریری سے علامہ محمد اسد کا ترجمہ قرآن ملا۔ علامہ ممدوح نے یہودی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا اور بہت بڑے اسلامی سکالر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کے ترجمہ قرآن سے وہ بہت متاثر ہوئیں۔ اسے بار بار پڑھا اور اسے اپنا رہنما قرار دے لیا۔ قرآن کا یہ ترجمہ پڑھنے کے بعد وہ اچھی طرح سمجھ گئیں کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے اور اس کے تمام احکام صحیح ہیں۔

قرآن کے مطالعہ کے بعد انھوں نے احادیثِ رسول ﷺ کا مطالعہ کرنے کا عزم کیا۔ حسنِ اتفاق سے انھیں مشکوٰۃ الصابیح مل گئی، جس کا انگریزی ترجمہ حاجی فضل کریم مرحوم نے کیا ہے۔ مشکوٰۃ ان کے نزدیک اسلامی احکام کا ''انسائیکلوپیڈیا'' ہے۔ اگر وہ رسول اللہ ﷺ یا آپ کے صحابہ کرام کے متعلق کچھ جاننا چاہتیں یا روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے کسی مسئلے کے بارے میں اسلامی احکام معلوم کرنے کا ارادہ کرتیں تو مشکوٰۃ کی طرف رجوع کرتیں اور اپنا مقصد حاصل کر لیتیں۔

مشکوٰۃ کے علاوہ انھوں نے قبول اسلام سے قبل علامہ محمد اسد کے صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے کا مطالعہ کیا، جو ان کے لیے انتہائی دل بستگی کا باعث بنا۔ ان دنوں نیویارک کی اسلامی کتابوں کی ایک دکان سے انھوں نے اسلامی تعلیمات سے متعلق بہت سی کتابیں خریدیں، جن میں علامہ محمد اسد کی دو کتابیں روڈ ٹو مکہ اور اسلام ایٹ دی کراس روڈ شامل تھیں۔ پھر اسی دکان سے مثنوی مولانا روم، ہدایہ، مقدمہ ابن خلدون، اقبال کی شاعری اور بعض دیگر کتابوں کے انگریزی تراجم خرید کر پڑھے۔

کچھ مدت سے والدین سے ان کا اختلاف ہو گیا تھا جو ۱۹۵۹ء میں کافی بڑھ گیا تھا، اس لیے کہ وہ ہر وقت اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتی تھیں اور اس سلسلے میں والدین سے بحث بھی کرتی تھیں۔ ان کی اس روش سے تنگ آ کر والدین نے ان کو علیحدہ کر دیا اور وہ اپنی معاشی گاڑی کو چلانے کے لیے ملازمت کرنے لگیں۔ ان دنوں انھوں نے واشنگٹن ویمن ہاؤس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ کتابوں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خریداری اور اسلام کو ہر پہلو سے سمجھنے کے لیے لوگوں سے میل ملاقات اور مختلف اسلامی ملکوں کے اہل علم سے خط کتابت میں صرف ہو جاتا تھا۔ اسلام کی معاشرتی زندگی سے آگاہ ہونے کے لیے وہ لوگوں کے گھروں میں بھی جاتیں اور ان کے رہن سہن کے طور طریقوں کا مشاہدہ کرتیں۔

اس زمانے میں جن مسلمان اصحابِ علم سے انھوں نے مراسلت کی، ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

☆ ڈاکٹر فاضل جمالی (یہ اس وقت اقوام متحدہ میں عراقی حکومت کے مندوب تھے)

☆ ڈاکٹر محمود ایف حب اللہ (سابق ڈائریکٹر اسلامک سینٹر واشنگٹن)

☆ شیخ محمد بشیر ابراہیمی (سابق صدر علمائے الجزائر اور فرانسیسی استعمار کے خلاف جہاد آزادی کے رہنما)

☆ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی (مقیم پیرس)

☆ ڈاکٹر معروف دوالیبی (سابق پروفیسر آف شریعہ دمشق یونیورسٹی)

☆ ڈاکٹر سعید رمضان (سابق صدر اسلامک سینٹر جنیوا)

ان ذاتی اور قلمی روابط سے انھیں بہت فائدہ ہوا اور اسلامی تعلیمات کے بہت سے پہلوؤں سے شناسائی ہوئی۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے کس طرح متعارف ہوئیں اور یہ تعارف آگے چل کر کس قالب میں ڈھلا اور اس سے کیا نتائج نمودار ہوئے؟

مولانا مودودی کا ایک مقالہ ''لائف آفٹر ڈیتھ'' کے عنوان سے ڈربن کے ایک مجلّے ''دی مسلم ڈائجسٹ'' میں شائع ہوا تھا جو قبول اسلام سے قبل مارگریٹ مارکیوس کی نظر سے گزرا اور انھوں نے بڑی دلچسپی سے اس کا مطالعہ کیا۔ وہ اس موضوع پر اکثر اپنے والدین اور بعض دیگر حضرات سے گفتگو کرتی رہتی تھیں، لیکن انھیں کسی طرف سے اس کا اطمینان بخش جواب نہیں مل رہا تھا۔ اب مولانا مودودی کا مقالہ پڑھا تو اس سے بہت متاثر ہوئیں اور اس موضوع سے متعلق ان کے تمام شکوک رفع ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء کے آخر میں انھوں نے مولانا ممدوح سے خط و کتابت شروع کر دی۔ ان کے پہلے خط کا مولانا نے جو جواب دیا اس سے ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا حوصلہ بڑھا اور پھر باہمی مراسلت کا سلسلہ آگے چلا۔ اسلامی تعلیمات کی سچائی کے نقوش تو پہلے ہی سے ان کے دل پر مرتسم ہو چکے تھے، اس لیے کہ وہ اس سلسلے کی بے شمار کتابیں بھی پڑھ چکی تھیں اور متعدد لوگوں سے زبانی گفتگو میں بھی اسلام کے متعلق معلومات حاصل کر لی تھیں اور قبول اسلام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن مولانا مودودی کے مضمون اور خط نے انھیں خاص طور سے متاثر کیا۔ مراسلت کا دائرہ آگے بڑھا تو مولانا نے ان کو اسلام قبول کر کے کسی مسلم ملک میں قیام کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی تحریر کیا کہ وہ پاکستان آجائیں اور اس ملک میں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لیں۔ اس سے پہلے انھوں نے عالم اسلام کے جن اصحاب علم سے خط وکتابت کی، ان میں سے کسی نے ان کو اپنے ہاں آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔

اب ان کا کاروانِ زندگی آگے بڑھتا اور ایک نئی منزل میں داخل ہوتا ہے، جہاں وہ مارگریٹ مارکیوس کا بوسیدہ لبادہ اتار کر مریم جمیلہ کا خوب صورت برقع زیب تن کر لیتی ہیں۔ عیدالاضحیٰ کے روز ۲۴۔ مئی ۱۹۶۱ء کو اپنی دو مسلمان دوستوں خدیجہ فیصل اور بلقیس محمد کے ساتھ وہ بروکلین نیویارک کے اسلامک مشن کے ڈائریکٹر شیخ داؤد احمد فیصل کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ان سے دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کی درخواست کی۔ شیخ ممدوح نے ان کو بہ آوازِ بلند کلمۂ شہادت پڑھایا اور وہ اسلامی برادری کی باقاعدہ رکن بن گئیں۔ ان کا نام مریم جمیلہ رکھا گیا۔ اس طرح ان کا مارگریٹ مارکیوس سے مریم جمیلہ تک کا کٹھن مگر دلچسپ سفر اختتام کو پہنچا اور مغرب کی فضاؤں سے مستقبل کی ایک نام ور مبلغہ اسلام کا ظہور عمل میں آیا۔

قبولِ اسلام کے بعد مریم جمیلہ نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ملنے والے یہودیوں اور عیسائیوں نے انھیں پاکستان آنے سے روکنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم رہیں۔ وہ امریکہ سے ہوائی جہاز کے ذریعے پاکستان آنے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی تھیں، اس لیے ۱۸۔ مئی ۱۹۶۲ء کو ایک جرمن بحری جہاز پر نیویارک سے روانہ ہوئیں جو مصر، سوڈان، صومالیہ اور سعودی عرب کی بندرگاہوں پر رکتا ہوا ۲۶۔ جون ۱۹۶۲ء کو کراچی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ کراچی کی بندرگاہ پر جماعت اسلامی کے چند ارکان نے ان کا استقبال کیا۔ کچھ روز وہ ان کی مہمان رہیں۔ پھر ۳۰۔ جون کو لاہور پہنچیں۔ یہاں میاں طفیل محمد مرحوم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ انھوں نے انھیں مولانا مودودی کے گھر پہنچایا۔ پاکستان آکر اس نیک بخت خاتون نے کلیتًا یہاں کی تہذیب اختیار کرلی تھی۔ باقاعدہ پردہ کرتی تھیں۔ اردو زبان بھی سیکھ لی تھی اور بے تکلفی سے اردو بولتی تھیں۔ میں نے ان کے ہاتھ کی اردو تحریر دیکھی ہے۔ صاف زبان اور اچھی تحریر۔ بول چال اور رہن سہن میں وہ پاکستان کے مسلم معاشرے کا حصہ بن گئی تھیں۔

کچھ عرصہ ان کا قیام مولانا مودودی مرحوم کے ہاں رہا۔ پھر انھیں پتوکی میں جماعت اسلامی کے ایک رکن کے ہاں بھیج دیا گیا جو اس وقت ایک قصبہ تھا، اب ضلع قصور کی تحصیل ہے۔ وہاں کا ماحول بالکل دیہاتی تھا اور اس دیہاتی ماحول میں انھوں نے جتنا عرصہ گزارا، نہایت خوشی سے گزارا۔ وہ پنجابی زبان بھی سمجھ لیتی تھیں بلکہ بول بھی لیتی تھیں۔

۸۔اگست ۱۹۶۳ء کو ان کا نکاح مولانا مودودی نے چند لوگوں کی موجودگی میں محمد یوسف خاں صاحب سے پڑھایا۔ اس وقت مریم جمیلہ کی عمر ۲۹ سال کی اور یوسف خاں کی ۳۹ سال کی تھی۔ محمد یوسف خاں ۱۹۲۴ء میں مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر میں پیدا ہوئے اور اگست ۱۹۴۷ء میں ترکِ وطن کر کے لاہور آئے۔ ۱۹۵۱ء میں مولانا مودودی سے تعلق پیدا ہوا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے۔ جماعت کے یہ مخلص ترین سرگرم رکن تھے۔ طویل قامت اور سرخی مائل گورا رنگ، جی دار اور بے خوف شخص۔

مریم جمیلہ کے ساتھ شادی سے قبل ان کی شادی اپنے رشتے داروں میں ہوئی تھی اور وہ صاحب اولاد تھے۔ مریم جمیلہ اور ان کی پہلی بیوی (شفیقہ) کے درمیان ابتدا ہی میں اچھے مراسم پیدا ہوگئے تھے اور دونوں ہنسی خوشی سے ایک ہی مکان میں لاہور کے علاقہ سنت نگر میں رہتی تھیں۔ دونوں کے بچوں کا آپس میں بے حد پیار تھا اور وہ مریم جمیلہ کو خانم اور شفیقہ کو امی کہتے تھے۔ کئی سال اکٹھے گزارنے کے بعد پہلے شفیقہ فوت ہوئیں، پھر مریم جمیلہ نے وفات پائی۔

مریم جمیلہ اسلام کی مشہور اسکالر تھیں۔ اسلام کے مختلف پہلوؤں سے متعلق انھوں نے انگریزی میں چھوٹی بڑی ۳۴ کتابیں لکھیں جو ان کے نام دار شوہر محمد یوسف خاں نے شائع کیں۔ مختلف ممالک کے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام کے بہت بڑے خدام کی حیثیت سے انھوں نے شہرت پائی، لیکن میرے محدود علم کے مطابق انگریزی زبان میں اسلام کے بارے میں جو تحریری خدمت اس امریکی نژاد خاتون نے انجام دی وہ نوعیت اور بوقلمونی کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

محمد یوسف خاں جب تک تندرست رہے، یہ کتابیں چھاپتے رہے۔ لوگ انھیں خریدتے اور شوق سے پڑھتے تھے۔ میں بہ طور ریسرچ فیلو ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تصنیفی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ خاں صاحب ممدوح کتابوں کی خرید وفروخت اور تبادلے کے سلسلے میں وہاں آتے جاتے تھے۔ ہم انھیں ازراہِ مزاح مریم جمیلہ والے یوسف خاں کہا کرتے تھے اور ان سے ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ طویل مدت سے صاحب فراش ہیں اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ ختم ہے۔ میرا خیال ہے اب یہ کتابیں کوئی نہیں شائع کرے گا۔

مریم جمیلہ نے ۳۱۔ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو وفات پائی۔ اس کی اطلاع مجھے میرے دوست عرفان جعفر صاحب نے دی جو جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔ میں عزیزی حافظ حسان سعید کے ساتھ (جو ایم اے کے آخری سال کا طالب علم ہے) جنازے میں شامل ہوا۔ جنازہ یوسف خاں کے مکان کے قریب گراؤنڈ میں پڑھایا گیا۔ اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر میں یوسف خاں صاحب سے ملنا اور تعزیت کرنا چاہتا تھا، لیکن مدتِ مدید سے مل نہیں سکا تھا، اس لیے خیال ہوا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکیں گے اور اتنے لوگوں کے سامنے اپنا تعارف کرانا مناسب نہیں ہوگا۔

مریم جمیلہ کے ایک بیٹے حیدر فاروق امریکہ رہتے ہیں۔ وہ ان کی وفات کے بعد لاہور آئے تو عرفان جعفر صاحب کے ساتھ ۲۴۔ نومبر کو میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان دونوں نے مجھے بتایا کہ خاں صاحب کو تمھارے متعلق گزشتہ دور کی باتیں یاد ہیں۔ حیدر فاروق صاحب نے مجھے ۲۶۔ نومبر کو اپنے گھر آنے اور دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ میں عرفان جعفر صاحب کے ساتھ حاضر ہوا اور خاں صاحب کے ساتھ اظہار افسوس کیا۔ سلام دعا کے فوراً بعد انھوں نے کہا آپ تو سانده میں رہتے ہیں۔ پھر اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق بہت باتیں کیں۔ مولانا مودودی اور اپنے بارے میں دورِ گزشتہ کے واقعات بیان کیے۔ وہ اونچا سنتے ہیں اور بیمار بھی ہیں لیکن ان کی جسمانی حالت اور گفتگو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لہجے سے ان کے ماضی کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔

میرے خیال میں جماعت اسلامی کے پرانے اور نئے لوگوں میں سے کوئی ان کے پاس نہیں جاتا ہوگا۔ وہ ۱۹۵۱ء سے لے کر اپنی خانہ نشینی تک جماعت کی چشم دید اور گوش شنید تاریخ ہیں لیکن کوئی ان سے استفادہ کرنے والا نہیں ہے۔ شاید خود ان میں بھی کچھ لکھنے کی ہمت نہ ہو اور اپنے ہاتھ سے گزرے ہوئے واقعات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔

اب آیئے اللہ تعالیٰ سے عجز و عاجزی کے ساتھ دعا کریں کہ وہ مریم جمیلہ کی مغفرت فرمائے اور یوسف خاں کو صحت و عافیت سے نواز ے۔ آمین یا رب العالمین۔

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا مجاہد الحسینی

(ولادت ۴۔جنوری ۱۹۲۶ء)

۱۹۵۲ء کے آخر میں تحریک تحفظ ختم نبوت کو آگے بڑھانے اور اس محاذ میں سرگرمی پیدا کرنے کے لیے تمام مسالک فکر کے سرکردہ علما وزعما کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی، جسے مجلس عمل کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس مجلس عمل کے صدر مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری تھے جو انجمن حزب الاحناف کے صدر اور مسجد وزیر خاں کے خطیب تھے۔ ناظم مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو بنایا گیا تھا۔ صدر اور ناظم کے علاوہ مجلس عمل کے قابلِ احترام ارکان میں حسب ذیل شامل تھے۔

مولانا احمد علی لاہوری صدر انجمن خدام الدین لاہور، مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیت علماے پاکستان، مولانا غلام محمد ترنم خطیب جامع مسجد پنجاب سول سیکرٹریٹ لاہور، صاحب زادہ فیض الحسن سجادہ نشین آلومہار شریف، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد اسماعیل سلفی ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، حافظ کفایت حسین صدر مجلس تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، سید مظفر علی شمسی سیکرٹری مجلس تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا سید نور الحسن بخاری صدر تنظیم اہل سنت۔ جماعت اسلامی کی طرف سے مولانا امین احسن اصلاحی اور ملک نصراللہ خاں عزیز ایڈیٹر سہ روزہ ''کوثر'' لاہور۔

ان کے علاوہ بھی بعض حضرات کو مجلس عمل کے ارکان کی حیثیت حاصل تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے (اور میری یادداشت اللہ کے فضل سے مجھے دھوکا نہیں دے گی) جمعیت علماے اسلام کی بہ حیثیت جماعت اس مجلس عمل میں جو مرزائیوں کے خلاف قائم کی گئی تھی، کوئی نمائندگی نہ تھی۔ اس میں جماعتی حیثیت سے شیعہ بھی تھے، جماعت اسلامی بھی تھی، جمعیت علماے پاکستان بھی تھی، تنظیم اہلِ سنت بھی تھی، جمعیت اہلِ حدیث بھی تھی، مجلسِ احرار بھی تھی بلکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہنا چاہیے کہ اس سلسلے میں مجلس احرار سے تعلق رکھنے والے لوگ سب سے زیادہ تیز اور سرگرم تھے اور ان کی تیزی اور سرگرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اصل مسئلہ ان ہی کا ہے، لیکن جمعیت علماے اسلام کا اس میں کوئی رکن نہ تھا۔

مجلس عمل کے قیام سے کچھ پہلے اس دور کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ میانہ قد، سرخی مائل گورا رنگ، چوڑا چہرہ، خندہ رو، خوش مزاج، سیاہ داڑھی، جاذب نظر بشرہ، خوش گفتار، چاق چوبند، صحت مند۔ سفید شلوار اور سفید کھلی آستین کا کرتہ زیب تن۔ سر پر قراقلی ٹوپی۔ بے حد فعال اور متحرک۔ انداز کلام مودبانہ اور طریق میل جول مہذبانہ۔ پتا چلا کہ اس نوجوان کا نام مجاہد الحسینی ہے۔ ایک عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا نام جو والدین نے رکھا محمد یوسف تھا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اتنے خوب صورت نام کو اس خوب صورت شخص نے مجاہد الحسینی سے کیوں بدل دیا ہے، جب کہ نہ وہ تلوار بہ دست مجاہد تھے، نہ سینہ بہ دست حسینی۔ مان لیتے ہیں کہ یہ ان کا قلمی نام ہے لیکن اتنے اچھے نام پر اس قلمی نام کو ترجیح دینا محل نظر ہے۔ ممکن ہے انھیں اپنے آپ پر ''یوسف بے کارواں'' ہونے کا شبہ پڑ گیا ہو۔ یہ تو صرف محاورہ ہے اور وہ بھی واقعاتی اعتبار سے بالکل غلط، کیوں کہ یوسف تو کبھی بھی بے کارواں نہیں رہا۔ ہمیشہ با کارواں رہا ہے۔ دنیا کے اولین یوسف کو دیکھ لیجیے کہ وہ گھر سے دس بھائیوں کے کارواں کے ساتھ چلے۔ تھوڑا عرصہ کنویں میں رہے۔ پھر کارواں آیا اور انھیں کنویں سے نکالا تو وہ باکارواں ہوگئے۔ اس کے بعد وہ دور آیا کہ کتنے ہی کارواں ان کے آگے پیچھے رہے اور بے شمار کارواں ان سے طالب امداد ہوئے۔ پھر حسینوں کے کاروانوں نے ان کے حسن پر فریفتگی اپنا فرض قرار دیا۔

البتہ غالب کو اپنے روایتی محبوب سے یہ خطرہ ضرور ظاہر ہوا کہ اس کے حسن کی وجہ سے اگر اسے یوسف سے تشبیہ دی گئی تو اس کی طرف سے خفگی کا اظہار ہوگا کیوں کہ وہ یوسف سے زیادہ حسین ہے۔

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہر حال مجاہد الحسینی نے محمد یوسف پر اس قدر مضبوطی سے قبضہ کر لیا ہے کہ اب اس سے قبضہ چھڑانا کسی کے بس میں نہیں رہا۔ محکمہ مال کی اصلاح میں پکی جمع بندی ہوگئی ہے۔ کوئی مائی کا لال اس جمع بندی کو تڑوا نہیں سکتا۔

میری اور مجاہد الحسینی کی دوستی پر بھی چھپن ستاون برس کا طویل عرصہ بیت چکا ہے۔ اس کی جمع بندی بھی پکی ہے۔ اس وقت ہم دونوں جوان تھے۔ ہماری دوستی بھی جوان تھی۔ پھر یہ دوستی ہمارے قدم بہ قدم کہولت کی منزل طے کرتی ہوئی بڑھاپے کی حدود میں پہنچی۔ اب اس آخر عمر میں اسے توڑنا یا اس میں کمی کرنا مردانگی کے خلاف اور ماضی کی تاریخ کی نفی کرتا ہے۔

اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد آیئے اب مجاہد الحسینی کی زندگی کے یوم اول سے سلسلہ کلام شروع کرتے ہیں۔ مجھے بتایا یہ گیا تھا کہ مجاہد الحسینی ۴۔ جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ لیکن جب میں نے اصل صورت حال کی اپنے طور پر تحقیق کی تو پتا چلا کہ سارا معاملہ ہی گڑ بڑ ہے۔ مجاہد الحسینی کا تو اس وقت کہیں نام ونشان نہ تھا۔ ۴۔ جنوری ۱۹۲۶ء کو محمد یوسف پیدا ہوا تھا۔ اس کا مجھے اس طرح پتا چلا کہ میری تاریخ پیدائش ۱۵۔ مارچ ۱۹۲۵ء ہے۔ اس حساب سے میں ان سے ایک سال دو مہینے گیارہ دن پہلے اس دنیا میں آیا اور یہ عام سی بات ہے، اس پر کسی مجاہد کو وہ حسینی ہو یا کوئی اور، مجاہدہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ جو شخص پہلے آتا ہے اسے بعد میں آنے والے کا پتا ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے معلوم ہے کہ ۴۔ جنوری کو یعنی مجھ سے ایک سال دو مہینے گیارہ دن بعد اس دنیا میں مجاہد الحسینی نہیں بلکہ محمد یوسف آیا تھا۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے۔ مجاہد الحسینی تو اس سے انیس بیس برس بعد آیا ہوگا۔ اگر میری بات پر کسی کو یقین نہ آئے تو ریاست کپورتھلہ کے قصبہ سلطان پور لودھی جا کر وہ رجسٹر دیکھ لے جس میں بچے کی تاریخ پیدائش لکھی جاتی ہے، وہاں مجاہد الحسینی نام کے کسی بچے کی لکھت پڑھت نہیں ہوگی۔

چلیے وہ ہی کچھ مان لیتے ہیں جو وہ کہتے ہیں، اس لیے کہ ہم نے ان کو یار بنا لیا ہے اور سیانوں سے سنا ہے کہ یار کی یاری کو دیکھنا چاہیے، اس کی نیکی بدی کو نہیں دیکھنا چاہیے تو سیانوں کی کہاوت کے مطابق ہم وہ ہی بات کہیں گے جو ہمارے یار کی مرضی کے مطابق ہوگی یعنی یہ کہ محمد یوسف نہیں، مجاہد الحسینی ۴۔ جنوری ۱۹۲۶ء کو موضع سلطان پور لودھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ریاست کپور تھلہ) میں پیدا ہوئے تھے۔

اللہ معاف کرے یہ ہم نے دیدہ دانستہ اور جھوٹ بولا ہے یا کم از کم خلاف واقعہ بات کہی ہے کہ ایک شخص کی پیدائش کو دوسرے شخص کے نام لگا دیا ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ میں اور مجاہد الحسینی دنوں ریاستی ہیں اور دونوں کا آبائی اور پیدائشی تعلق خیر سے سکھ ریاستوں سے ہے۔ ان کی ریاست کا نام کپور تھلہ تھا اور میری جنم بھومی ریاست فرید کوٹ تھی۔ ان کا تعلق سکونت موضع سلطان پور لودھی سے تھا اور میرا موضع کوٹ کپورہ سے! ان کی ریاست کپور تھلہ کی وجہ تسمیہ تو معلوم نہیں کیا ہے۔ البتہ میری ریاست فرید کوٹ کا نام پاکپتن کے مشہور بزرگ بابا فرید الدین شکر گنج کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ریاست فرید کوٹ کے سرکاری نصاب کی چوتھی جماعت کی اردو کی کتاب میں جس کی حیثیت جغرافیہ اور تاریخ کی بھی تھی، اسی طرح لکھا تھا اور کوٹ کپورہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ رنجیت سنگھ سے بہت سال پہلے اس کی بنیاد ایک علاقائی حاکم چودھری کپور چند نے رکھی تھی۔ ''کوٹ'' ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں قلعہ۔ فصیل۔ شہر پناہ۔ قلعہ تو معلوم نہیں کب منہدم ہو گیا تھا، البتہ ہمارے وہاں سے نکلنے تک اس قلعے کی چھوٹی اینٹ کی بنائی ہوئی ایک بہت بڑی دیوار کھڑی تھی جو کم از کم چار فٹ چوڑی ہوگی۔

مجاہد الحسینی کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اپنے متعلق میں خوب جانتا ہوں کہ میں گوروؤں کی کرپا سے سکھ کلچر، سکھوں کے اندازِ کلام اور ان کے خاص قسم کے طرز زندگی سے بہت حد تک واقف ہوں۔ ان کے لوگ گیت اور ان کی بولیاں بھی جانتا ہوں اور بعض دوستوں کی فرمائش پر سناتا بھی ہوں اور تشریح طلب گیت کی تشریح بھی کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ سیاست میں بھی حصہ لیا۔ ان کے ساتھ سفر بھی کیے اور ان کے ساتھ قید بھی ہوا۔ اس حیثیت سے آپ چاہیں تو بے شک مجھے آدھا پونا ''خالصہ'' قرار دے لیں۔

مجاہد الحسینی نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور قصبے (سلطان پور لودھی) میں حاصل کی ہوگی۔ ریاست کپور تھلہ کا یہ مشہور قصبہ تھا۔ اس عہد کے معروف اہل علم بزرگ مستری محمد صدیق کا مسکن یہ ہی قصبہ تھا۔ وہ دراصل انجینئر تھے اور انھیں مستری اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے فن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں مہارت رکھتے تھے اور اس زمانے میں مستری کے لفظ کو انجینئر سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۔ مجاہد الحسینی اور مستری محمد صدیق ایک ہی محلے کے رہنے والے تھے۔ کسی زمانے میں مستری محمد صدیق کا تعلق مولانا ابوالکلام آزاد سے ہو گیا تھا اور وہ مولانا کی خدمت میں کلکتے چلے گئے تھے۔ مولانا کی جماعت حزب اللہ کے وہ ابتدائی ارکان میں شامل تھے۔ مولانا ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ مولانا نے اپنے بعض خطوط میں ان کا ذکر بھی فرمایا ہے۔

پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے مولانا مودودی کی تحریریں پڑھیں تو ان کا اخلاص انھیں مولانا مودودی کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ وہ جماعت اسلامی کے تاسیسی اجلاس میں شامل تھے جو ۲۶۔اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں ہوا تھا، میں نے ان کو اسی اجلاس میں پہلی دفعہ دیکھا تھا اور یہ ہی ان کو دیکھنے کا آخری موقع بھی تھا۔ سنا تھا کہ ان ہی کی تحریک و تجویز سے مولانا مودودی نے ملک کے ۷۵ افراد کو جمع کر کے جماعت اسلامی قائم کی تھی۔ مستری محمد صدیق اسلام سے قلبی محبت رکھنے کی بنا پر جماعت اسلامی میں شامل تو ہو گئے تھے۔ لیکن مولانا ابوالکلام کی علمیت، ان کے اندازِ گفتگو اور طرزِ اظہار کے جو جھنڈے ان کے دل پر گڑ چکے تھے، وہ اکھڑ نہ سکے۔ بالآخر جماعت اسلامی کی تاسیس سے تھوڑے عرصے بعد جب اصحاب علم و فہم کا ایک گروہ اس سے علیحدہ ہوا تو یہ بھی علیحدہ ہو گئے۔ اب جماعت اسلامی ماشاء اللہ اسی طرح اسلامی جمعیت طلبہ کا نام ہے، جس طرح مجاہد الحسینی، محمد یوسف کا!

اس وقت جالندھر شہر میں جامعہ خیر المدارس کے نام سے دیوبندی مکتب فکر کی مشہور درس گاہ قائم تھی جو مولانا خیر محمد جالندھری کے اہتمام میں ان ہی کے نام سے جاری تھی اور ریاست کپور تھلہ کا ضلع بھی جالندھر ہی تھا۔ چناں چہ مجاہد الحسینی (یعنی محمد یوسف) نے جالندھر کا قصد کیا اور جامعہ خیر المدارس میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۹۴۴ء میں وہ اس جامعہ سے فارغ ہوئے۔

اس سے بہت سال پہلے دارالعلوم دیوبند کے اکابر اہل علم کے باہمی انتظامی اختلاف کے نتیجے میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ صوبہ بمبئی کے ایک مقام ڈابھیل چلے گئے تھے اور وہاں دارالعلوم قائم کر لیا تھا۔ ہمارے دوست مولانا مجاہد الحسینی نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہاں جا کر مولانا عثمانی کے حضور بھی زانوئے شاگردی تہہ کیے۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی انھوں نے حصول علم کیا۔ اس طرح جن اساتذہ سے وہ مستفیض ہوئے وہ ہیں مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہم ۔ یہ ان کے ممتاز اور نامور اساتذہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے بعض حضرات سے استفادہ کیا۔ بیس سال کی عمر سے پہلے ہی انھوں نے اپنے عہد کے عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی تکمیل کر لی تھی۔

مولانا سید حسین احمد مدنی کے مجاہد الحسینی صاحب بے حد مداح تھے اور مداح ہیں۔ چناں چہ ۱۹۴۵ء میں وہ مولانا مدنی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقۂ بیعت میں شرکت کا اعزاز حاصل کیا۔

تقسیم ملک سے کچھ عرصہ قبل مولانا اشرف علی تھانوی لاہور تشریف لائے تھے۔ لاہور سے واپس ٹرین پر تھانہ بھون جاتے ہوئے، جالندھر ریلوے اسٹیشن پر جو لوگ ان سے ملاقات کو آئے ان میں نوجوان مجاہد الحسینی بھی شامل تھے۔

مجاہد الحسینی تقسیم ہند کے بعد پاکستان آئے۔ اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی پاکستان تشریف لا چکے تھے۔ اور خان گڑھ میں نواب زادہ نصراللہ خاں کے ہاں مقیم تھے۔ مجاہد الحسینی ابتدا میں وہیں پہنچے اور کچھ عرصہ وہاں اقامت گزیں رہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ حالات بدلے اور لوگوں نے اپنے اپنے ٹھکانے بنا لیے۔

مجاہد الحسینی کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ وہ خطیب بھی ہیں، اخبار نویس بھی ہیں اور مصنف بھی ہیں۔ درج ذیل سطور میں سب سے پہلے ان کی اخبار نویسی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر بائیس برس سے کچھ کم تھی۔ یہاں آ کر انھوں نے کیا کام شروع کیا، اس کا علم نہیں ہوسکا۔ البتہ ۱۹۴۹ء میں انھیں ملتان کے ہفت روزہ اخبار ''غریب'' کے ایڈیٹر بنایا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تئیس چوبیس سال ہوگی۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک تین سال وہ مجلس احرار کے ترجمان روزنامہ ''آزاد'' کے ایڈیٹر رہے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے زمانے میں حکومت نے یہ اخبار بند کر دیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۹ء تک روزنامہ ''نوائے پاکستان'' (لاہور) کی ادارت کی۔

پھر ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک لاہور کے ہفت روزہ ''پاسبان'' کی زمام ادارت ان کے ہاتھ میں رہی۔

بعد ازاں کئی سال مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے جاری کردہ ہفت روزہ ''خدام الدین'' (لاہور) کے رئیس التحریر رہے۔ پھر فیصل آباد سے اپنا ماہنامہ ''صوت الاسلام'' جاری کیا۔ یہ رسالہ عربی، اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔

ہمارے مراسم مجاہد الحسینی سے روزنامہ ''آزاد'' کے زمانۂ ادارت میں ہوئے۔ میں اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ ''آزاد'' کا دفتر سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے سامنے تھا اور مجلس احرار کا دفتر بھی (غالباً اس کے قیام کے زمانے ۱۹۲۹ء سے) یہی تھا۔ اس دفتر سے بہت بڑی سیاسی تاریخ وابستہ تھی جو آزادی وطن کی ایک طویل داستان رکھتی تھی۔ اس دفتر میں اپنے وقت کے بہت بڑے بڑے لوگ آئے جو مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔

میں شام کے بعد ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ مجاہد الحسینی کے دفتر جاتا تھا اور ان سے خوب باتیں ہوتی تھیں۔ میں وہاں جاتا تو مجاہد الحسینی مجھے گاجر کا حلوا کھلاتے اور پھر جب گاجر کا حلوا کھلانا ان کا معمول بن گیا تو میرا وہاں جانا بھی معمول بن گیا۔ اب میں ان سے ملنے کم اور حلوا کھانے زیادہ جاتا تھا۔ میں اس زمانے میں لوہاری دروازے (گمٹی بازار کی ایک گلی میں) رہتا تھا۔ مجاہد الحسینی کے دفتر کا رخ کرتے وقت میں دعا مانگتا کہ یا اللہ! مجاہد الحسینی دفتر ہی میں ہوں تاکہ مجھے گاجر کا حلوا ملے۔ میری ہمیشہ یہ دعا قبول ہوئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ مجاہد الحسینی سے حلوا کھانے کی حد تک تو میں مستجاب الدعوات ہو گیا ہوں۔ اس دعا کا فخر کے ساتھ میں اپنے دوستوں سے اظہار بھی کرتا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسے میری سستی یا ناشکری کہنا چاہیے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو اس وقت کے ضلع لائل پور اور موجودہ دور کے ضلع فیصل آباد میں وہابیوں کے دو بزرگ مستجاب الدعوات قرار پاتے۔ ایک صوفی عبداللہ مرحوم اور دوسرا یہ عاجز موجود! جس طرح میں نے صوفی صاحب پر کتاب لکھی اور ان کی قبولیت دعا کے واقعات اس میں بیان کیے ہیں، اسی طرح مجھ پر بھی کتاب لکھی جاتی اور اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں میری قبولیت دعا کے واقعات درج کیے جاتے، جن کا آغاز مجاہد الحسینی کے گاجر کے حلوے سے ہوتا۔ اس طرح مجاہد الحسینی کو بھی کریڈٹ ملتا کہ ان کے حلوے سے میری قبولیت دعا کی ابتدا ہوئی اور میری بھی شہرت ہو جاتی۔

میرے دوست مجاہد الحسینی اگر والدین نام کے مطابق یوسف رہتے تو ممکن ہے دنیا کے اولین یوسف کی طرح بادشاہ ہو جاتے یا کم از کم بادشاہی حلقے کے قریب انھیں کہیں جگہ مل جاتی، لیکن انھوں نے حسینی مجاہد ہونا پسند کیا اور پھر ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو حسینی مجاہدوں کے ساتھ ہوا تھا۔

مجاہد الحسینی نے صرف اخبار نویسی نہیں کی، وہ مصنف بھی ہیں اور انھوں نے متعدد تحقیقی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) معاشیات قرآنی: قرآن مجید کے نقطہ نظر سے معاشی مسائل کا حل

(۲) تعلیم القرآن کا قاعدہ: یہ مصور قاعدہ ہے۔ مولانا قاری محمد طیب نے اس پر تقریظ لکھی ہے۔

(۳) سیرت و سفارت رسول: مقابلۂ کتب سیرت میں یہ کتاب اول قومی صدارتی ایوارڈ کی مستحق قرار پائی۔

(۴) رسول اللہ ﷺ کی امن پالیسی: اس کتاب کے مندرجات کا اندازہ اس کے نام سے ہو جاتا ہے۔

(۵) رسول اللہ ﷺ کا نظام خدمت خلق: اس کا مطلب بھی اس کے نام سے ظاہر ہے۔

(۶) مشاہیر کی تقریریں: بعض مشہور سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کی تقریروں پر مشتمل ہے۔

(۷) خطباتِ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری: شاہ جی کے حالات، شخصیت اور خطابت

(۸) شاہ ولی اللہ کے دیس میں: یہ دہلی (اور ہندوستان) کا سفرنامہ ہے۔

(۹) سفرنامہ ارض الاسلام: بعض اسلامی ملکوں کا سفرنامہ

(۱۰) تنقیدات: مطلب نام سے واضح ہو جاتا ہے۔

(۱۱) مولانا سید حسین احمد مدنی، علامہ اقبال اور مسئلہ قومیت:

(۱۲) حج و عمرہ: اس بنیادی رکن اسلام کی ادائیگی کا طریقہ۔ مصور

(۱۳) اسلامی زرعی معیشت: اسلام کے نقطہ نظر سے زرعی معیشت کی وضاحت

(۱۴) اسیران مالٹا (ناقدین کا تعاقب)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجاہد الحسینی ما شاء اللہ متعدد مرتبہ حج بیت اللہ کر چکے ہیں اور ہر مرتبہ امیر الحجاج مقرر کیے گئے۔ یہ ایک اعجاز ہے جو انھیں حاصل ہوا۔ حج کے موقع پر انھیں ارض حجاز میں وہاں کی بہت سی اہم شخصیتوں سے ملاقات کے مواقع میسر آئے۔ ان شخصیتوں میں (۱) شیخ عبد العزیز بن صالح خطیب وامام مسجد نبوی (۲) خادم الحرمین الشریفین ملک فیصل شہید بن ملک عبد العزیز (۳) شیخ عبد العزیز بن باز (۴) شیخ عبد اللہ بن سبیل امام کعبۃ اللہ (۵) سعود الفیصل ڈپٹی منسٹر حکومت سعودیہ (۶) جناب ابراہیم العنقری وزیر اطلاعات ونشریات حکومت سعودیہ شامل ہیں۔

تحریک تحفظ ختم نبوت کے بارے میں مجاہد الحسینی ایک سال قید رہے۔ لاہور سنٹرل جیل میں ان کے ساتھ قید تھے۔ (۱) مولانا احمد علی لاہوری (۲) سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۳) مولانا محمد اسماعیل سلفی (۴) مولانا عبد الحامد بدایونی (۵) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری (۶) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور (۷) مولانا امین احسن اصلاحی۔ ان حضرات کے ساتھ ان کی ہر وقت رفاقت تھی۔

ان کے علاوہ برصغیر کے بے شمار حضرات سے ان کی ملاقات رہیں۔ مثلاً مولانا قاری محمد طیب، سید سلیمان ندوی، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا عبد القادر رائے پوری، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا غلام رسول مہر، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر حمید اللہ اور دیگر بہت سے اصحاب علم کی مجلس میں بیٹھنے اور ان سے میل جول کے ان کو مواقع ملے۔ یہ سب حضرات اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔

مجاہد الحسینی ابتدائے عمر ہی سے مجلس احرار سے وابستہ رہے ہیں اور اس کے تمام سرکردہ رہنماؤں سے ان کا تعلق رہا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مجلس احرار کا دفتر اور اس کا پورا ریکارڈ انہی کے قبضے میں آیا۔ اس حیثیت سے یہ مجلس احرار کے تمام معاملات سے آگاہ اور مختلف اوقات میں انھوں نے جو فیصلے کیے ان سے باخبر ہیں۔ احرار رہنماؤں کی باہمی خط وکتابت اور دوسری جماعتوں کے اکابر سے ان کی مراسلت کا بھی انھیں علم ہوگا۔ یہ ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دور کی پوری سیاسی کہانی ہے۔اسے ترتیب دے کر چھاپ دیا جائے تو بے شمار ایسی باتیں لوگوں کے سامنے آئیں گی، جن سے وہ اب تک بے خبر ہیں۔

جہاں تک میں جانتا ہوں مولانا مجاہد الحسینی باہمت عالم دین ہیں۔ان کی ہمیشہ کوشش اور خواہش رہی کہ مشترکہ معاملات میں اہل حدیث اور احناف متحد رہیں۔ایک مرتبہ وہ مولانا احمد علی صاحب اور مولانا ابوالحسنات صاحب کو اس سلسلے میں مولانا داؤد غزنوی کے پاس لائے۔اس مجلس میں یہ فقیر بھی حاضر تھا۔مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد حنیف ندوی، سید ابوبکر غزنوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھی تشریف فرما تھے۔گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا سلسلہء گفتگو جاری رہا۔مقصد یہ تھا کہ اسی طرح ایک متحدہ کمیٹی بنائی جائے جس طرح تحریک تحفظ ختم نبوت کے موقعے پر مجلس عمل بنائی گئی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کام کچھ آگے بھی بڑھا تھا، لیکن بعض لوگوں نے کچھ ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ بات درمیان ہی میں رہ گئی۔مجاہد الحسینی صاحب ۸۰ برس سے اوپر چلے گئے اور صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں خیر و عافیت سے رکھے اور وہ امورِ خیر کی انجام دہی میں مصروف رہیں۔

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی

(ولادت ۱۹۶۹ء)

میانہ قد، گندمی سرخی مائل رنگ، خوش اخلاق، خوش گفتار، صاف کلام خطیب، کلمہ حق کہنے میں جری، مہمان نواز، فراخ حوصلہ، اساتذہ کے حضور نہایت مؤدب، رفقائے کار کے بہی خواہ، طلبا کے لیے سراپا شفقت، محنتی معلم، اپنے مسلک کے جرات مند مبلغ۔ یہ ہیں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی جو ۱۹۶۹ء کو موضع جید چک نمبر ۱۶ (تحصیل منڈی ڈھاباں سنگھ ضلع شیخوپورہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد درس نظامی کی تکمیل جن حضرات سے کی، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا عبدالحمید ہزاروی، مولانا حافظ عبدالعزیز علوی، حافظ عبدالرزاق سعیدی، حافظ عبدالسلام بھٹوی، مولانا حافظ عبدالمنان نورپوری، حافظ محمد عباس انجم گوندلوی، مولانا عبداللہ امجد چھتوی، مولانا محمد رفیق سلفی، مولانا جمعہ خاں، مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی، قاری عبدالرزاق اور قاری عبدالشکور مدنی، حافظ محمد الیاس اثری۔

یہ حضرات جلیل المنزلت علما اور رفیع المرتبت مدرس ہیں۔ ان میں سے حضرت حافظ عبدالمنان نورپوری وفات پاگئے ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ابتدائی تعلیم کے بعد حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی نے درس نظامی کی پوری تعلیم کے لیے انہی عالی قدر اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے۔ انھوں نے ۱۹۸۶ء میں جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ گوجراں والا سے تحصیل علم کا آغاز کیا تھا۔ آٹھ سال بعد ۱۹۹۳ء اسی جامعہ کے بانی و مہتمم مولانا عبداللہ مرحوم ومغفور کے دست مبارک سے سندِ فراغ حاصل کی۔

تقریر وخطابت سے دورِ طالب علمی سے ہی انھیں دلچسپی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد باقاعدگی سے خطابت وتدریس کا سلسلہ ضلع گوجراں والا کے موضع ترگڑی سے شروع کیا۔ یہاں ان سے میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے عربی اور اسلامیات کے متعدد طلباء نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے تھے، اپنے نصاب کی بعض کتابیں پڑھیں۔ ان کے علاوہ بھی کتنے ہی نوجوانوں نے ان سے علم حدیث اور صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس گاؤں اور اس کے اردگرد کے دیہات کے لوگوں پر ان کی خطابت اور تدریس کا بہت اچھا اثر پڑا اور لوگ مسلک اہل حدیث سے آشنا ہوئے اور ان کے عمل وعقیدے میں تبدیلی آئی۔

کچھ عرصہ ان کا قیام راہوالی میں رہا۔ وہاں کی مرکزی مسجد اہل حدیث میں ان سے بعض حضرات نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا۔ یہاں ان سے چودھری عبدالحمید گجر، ضیاء الدین اور عبدالماجد ساہی نے بعد نماز عشاء جامع ترمذی پڑھنا شروع کی۔ پوری کتاب تو نہ پڑھی جا سکی، لیکن اس کے اثرات بہت نمایاں ہوئے اور ان حضرات کو علم حدیث سے لگاؤ پیدا ہوا۔

راہوالی سے دارالعلوم محمدیہ (پرانا لاری اڈا) شیخوپورہ میں کچھ عرصہ تدریس کا موقع ملا۔ وہاں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے ساتھ ساتھ مشکوٰۃ شریف اور سنن نسائی شریف پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک سال سنن نسائی کی آخری حدیث کا درس حضرت حافظ عبدالمنان نورپوری رحمہ اللہ نے دیا اور دوسرے سال نسائی شریف کی آخری حدیث کا درس مولانا عبداللہ امجد چھتوی نے دیا۔ وہاں دو سال قیام رہا۔ مشکوٰۃ المصابیح کے ساتھ دو سال سنن نسائی پڑھائی۔ باقی فنون کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

ایک سال حافظ محمد الیاس اثری کے حکم سے گوجرانوالا کے مدرسہ علوم اثریہ میں خدمت تدریس انجام دی۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کو جن مقامات میں مستقل خطبات جمعہ دینے کے مواقع میسر آئے، اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

☆ ترگڑی ضلع گوجرانوالا میں تقریباً چار سال فریضہ خطابت سرانجام دیتے رہے۔

☆ راہوالی (گوجرانوالا) کی جامع مسجد ابوبکر صدیق میں اڑھائی سال یہ خدمت انجام دی۔

☆ ایمن آباد (ضلع گوجرانوالا) کی جامع مسجد اہل حدیث میں ایک سال۔

☆ شیخوپورہ کی جامع مسجد قبا اہل حدیث (جنڈیالہ روڈ) میں تین سال۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ شاہ کوٹ (ضلع ننکانہ) کی جامع مسجد اہل حدیث میں ایک سال۔

☆ میر پور (ضلع ننکانہ صاحب) کی جامع مسجد توحید اہل حدیث میں پندرہ سال سے خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں، جس میں مقامی لوگوں کے علاوہ قرب وجوار کے کافی تعداد میں لوگ آتے اور بڑے شوق سے ان کا خطبہ سنتے ہیں۔

۲۰۰۲ء سے یزدانی صاحب جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں خدمت تدریس میں مشغول ہیں۔ جامعہ کے نصاب کے مطابق وہ مختلف فنون کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ ابتدائی سالوں میں ترجمہ قرآن پڑھایا اور اس کے ساتھ عقائد و سیرت اور صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھائیں۔

جامعہ سلفیہ کو ماشاء اللہ ہمیشہ لائق مدرسین کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ ۴۔اپریل ۱۹۵۵ء کو اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ وہ سارا نقشہ اب بھی میرے سامنے ہے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد میں نے جامعہ میں باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع ہوتے دیکھا اور اخبار الاعتصام میں، جس کا میں اس وقت ایڈیٹر تھا، افتتاح کی پوری روداد لکھی۔ اللہ تعالیٰ کا اس تدریسی ادارے پر یہ خاص کرم ہے کہ آغاز ہی سے اسے قابل معلمین اور لائق متعلمین کی آماجگاہ بنا دیا۔ اس وقت جامعہ میں آٹھ سو طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اساتذہ کی بڑی تعداد انھیں تعلیم دینے پر مقرر ہے۔ حفظ قرآن کا بھی انتظام ہے اور تجوید کے ساتھ قرآن مجید حفظ کرایا جاتا ہے۔

جامعہ کے پرنسپل ایک عرصے سے چودھری محمد یاسین ظفر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور تمام معلمین کو خوش رکھے اور ان کی تنظیمی اور تدریسی مساعی کو شرفِ قبولیت سے نوازے آمین۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی فاضل معلمین کی اسی لائق تکریم جماعت کے رکن ہیں جو دلجمعی اور محنت سے اپنے مفوضہ فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور طلبا ان کے اسلوب تدریس سے مطمئن ہیں۔ فنون کی بعض کتابوں کے ساتھ ساتھ آج کل وہ صحاح ستہ کی اہم کتاب سنن ابی داؤد پڑھا رہے ہیں۔ جامعہ سلفیہ کے مجلّے ''ترجمان الحدیث'' کی ادارت بھی ان کے سپرد ہے، جب کہ اس کے رئیس التحریر چودھری محمد یاسین ظفر ہیں اور مضمون نگاروں میں جامعہ کے عالی مرتبت اساتذہ بھی شامل ہیں اور عزیز القدر طلبا بھی۔!

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کے دل میں جامعہ سلفیہ کے اساتذہ کرام کا احترام تو جاگزیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے ہی، ان کے علاوہ دیگر تدریسی اداروں کے اساتذہ کی بھی یہ قدر کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جامعہ سلفیہ کے اساتذہ اور فیصل آباد کے دارالقرآن والحدیث کے مدرسین کے تذکار خود لاہور آکر مجھے دیے۔

یزدانی صاحب اساتذہ اور اپنے رفقائے کار سے کس تکریم سے پیش آتے اور طلبا کو کس درجے مستحق شفقت قرار دیتے ہیں، اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھے اپنے ہاں میر پور (شاہ کوٹ، ضلع ننکانہ) حاضر ہونے کی دعوت دی۔ وہاں یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ گوجراں والا سے ان کے اساتذہ کرام میں سے حضرت حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ بھی تشریف فرما ہیں اور شیخ الحدیث مولانا عبدالحمید ہزاروی حفظ اللہ بھی، مرید کے مرکز طیبہ سے حافظ عبدالسلام بھٹوی صاحب اور ستیانہ بنگلہ سے مولانا محمد عبداللہ امجد چھتوی بھی تشریف فرما تھے۔ نیز جامعہ سلفیہ کے معزز اساتذہ میں سے چودھری محمد یاسین ظفر، مولانا حافظ عبدالعزیز علوی، حافظ مسعود عالم اور بعض دیگر اساتذہ بھی موجود ہیں۔ ان حضرات سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔

ایک دفعہ جمعۃ المبارک کے روز مجھے اور میرے بھائی سعید احمد بھٹی کو بلایا تو وہاں ان کے تقریباً اسی (۸۰) طالب علموں کو دیکھا جو چند روز سے گاؤں میں موجود تھے اور استاذ مکرم سے اپنی نصابی کتابیں پڑھ رہے تھے، مولانا سلیم اعظم بلوچ بھی آئے تھے، جنھوں نے خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا تھا۔ فیصل آباد سے مولانا محمد رمضان سلفی کو بھی بلایا گیا تھا۔

اس طرح یزدانی صاحب علمائے کرام بالخصوص جامعہ سلفیہ کے اساتذہ وطلبا سے بہت قرب رکھتے ہیں اور طلباء بے حد شوق سے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میر پور کی جماعت سے خطابت کا یزدانی صاحب کوئی پیسا نہیں لیتے۔ وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں اور یہ ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

فیصل آباد کی بعض مساجد کی انتظامیہ کے محترم ارکان نے کئی مرتبہ ان سے کہا کہ ان کی مسجد میں وہ خطبہ جمعہ دیں گے تو ان کی توقع سے بڑھ کر انھیں تنخواہ دی جائے گی۔ ایک مرتبہ ایک مسجد کے چند حضرات جامعہ کے پرنسپل چودھری محمد یاسین ظفر کے پاس آئے کہ وہ یزدانی صاحب سے ان کی مسجد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں جمعہ پڑھانے کی سفارش کریں، چودھری صاحب ممدوح نے ان سے بات کی تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ نہیں وہیں ٹھیک ہوں جہاں طویل مدت سے خطابت کا فریضہ سرانجام دے رہا ہوں۔ اگر تنخواہ کے لیے کام کرنا ہے تو کسی نے ان سے زیادہ پیسے دینے کی کوشش کی تو انھیں چھوڑ کر وہاں جانے کو جی چاہے گا۔ مناسب یہی ہے کہ ایک ہی جگہ جم کر خدمت انجام دی جائے۔

اس مادی دنیا میں ان اوصاف کے مالک علما وخطبا کا وجود بسا غنیمت ہے۔ اللہ ان کا حامی وناصر ہو۔ جس سے مدرسے کے طلبا خوش ہوں اور اس کے طریق تدریس پر اطمینان کا اظہار کریں، وہ کامیاب مدرس ہے اور جس خطیب کے طرز خطابت سے اس کے سامعین مطمئن ہوں اور اس سے اثر پذیر ہوتے ہوں، وہ کامیاب خطیب ہے۔ یہ بڑی نعمت ہے جو اللہ نے اس وصف کے مدرس اور خطیب کو عطا فرمائی ہے۔ اس پر اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ آج سے ساٹھ سال قبل اپریل ۱۹۵۵ء میں ہمارے بزرگوں نے جس مقصد کے لیے فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ قائم کیا تھا، اللہ کے فضل سے وہ مقصد حاصل ہو رہا ہے اور یہاں کے اساتذہ نہایت محنت سے خدمت تدریس میں مشغول ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ جامعہ سلفیہ کے بانیوں، اس کے معاونوں اور مدرسین کو جو وفات پا گئے ہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور جو زندہ ہیں، انھیں زیادہ سے زیادہ خدمت دین کی توفیق مرحمت فرمائے۔

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آہ! ابو جی......ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

حافظ محمد حسان سعید

آہ!۔۔۔ میں آج اس شخصیت کے بارے میں تحریر لکھنا چاہ رہا ہوں، جس کے بارے کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ جن کو جماعت اہل حدیث ہی نہیں بلکہ اہل علم کی کثیر تعداد جو چاہے دیو بندی ہوں، بریلوی ہوں، جماعت اسلامی کے افراد ہوں، چاہے اہل تشیع ہوں یا دیگر اہل خرد ہوں، ہمارے محترم بزرگ وعظیم اہل قلم، دانش ور، دنیائے صحافت کے بے تاج بادشاہ جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ، جنھیں ہمارے خاندان کے سب افراد وخواتین ''ابو جی'' کے لقب سے یاد کرتے اور پکارتے تھے، کے آخری دنوں کی روداد لکھنا پڑے گی۔

انھوں نے ہمارے درمیان جس برکت ونور کا ہالہ بنا رکھا تھا اور جن کی برکت اور رحمت سے اکثر اہل علم کی زیارت وملاقات اور پھر ہمارے گھرانے کے افراد ان اہل علم کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے، آج وہ شخصیت یعنی ہمارے ابو جی مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کے متعلق قلم ساتھ نہیں دے رہا کہ انھیں مرحوم لکھوں۔

میرے والد گرامی جناب سعید احمد بھٹی کے بڑے بھائی جنھیں والد صاحب بھی ابو جی ہی کہا کرتے تھے۔ جو ہر وقت ابو جی کی خدمت میں ہی رہتے تھے۔ ابو جی کی رونق اور ان کی خوشبو بھلائے بھی ہم نہ بھلا سکیں گے۔

آج کچھ سطور لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں کہ انھوں نے اپنی زندگی کی اکانوے بہاریں اس دنیائے رنگ وبو میں گزاریں، یوں تو انھوں نے اپنی زندگی کی آپ بیتی ''گزر گئی گزران'' تحریر فرما دی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی زندگی کے آخری چند روز جنھیں میں نے حیطۂ تحریر میں پیش کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

۱۶۔دسمبر ۲۰۱۵ء بروز پیر دوپہر تین بجے جب راقم یونیورسٹی سے گھر پہنچا، تو گھر داخل ہوتے ہی والدہ سے ابو جی کے بارے میں پوچھا کہ ابو جی کہاں گئے ہیں؟ والدہ نے کہا کہ آج "الاعتصام" کے دفتر میں میٹنگ تھی۔ بارہ بجے دفتر سے ایک شخص (سجاد صاحب) موٹر سائیکل پر آئے تھے، ان کے ساتھ گئے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد ابو جی نے دفتر سے فون کیا تو راقم نے پوچھا کہ آپ نے گھر کب تک آنا ہے؟ کہنے لگے کہ تھوڑی دیر تک آرہا ہوں۔

چار بجے کے قریب ابو جی اکیلے گھر پہنچے، تو میں نے عرض کیا، کیا آپ دفتر سے اکیلے آئے ہیں۔ کہنے لگے نہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی صاحب کے ساتھ آیا ہوں، وہ مجھے سڑک تک چھوڑ کر گئے ہیں۔ میں نے کہا آپ ڈاکٹر صاحب کو بھی ساتھ ہی گھر لے آتے۔ کہنے لگے میں نے ان سے کہا تھا، لیکن لکھوی صاحب شدید نزلے (Flu) میں گھرے ہوئے تھے، اس لیے وہ گھر نہیں آئے۔

تھوڑی دیر بعد جب میری والدہ نے چائے کا پوچھا تو کہنے لگے تھوڑی دیر بعد پیوں گا، آج میری کمر میں درد ہے۔ والدہ نے کمر دباتے ہوئے کہا کہ ابو جی جب آپ دوائی کھائیں گے تو ان شاء اللہ درد ٹھیک ہو جائے گا۔ ۱۱۔ستمبر ۲۰۱۱ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر ۱۰۶۔راوی روڈ پر ابو جی اور راقم ایک میٹنگ کے سلسلے میں رکشے پر جا رہے تھے، ہم دفتر کے قریب ہی تھے کہ رکشہ الٹ گیا۔ جس سے ابو جی کا دایاں بازو فریکچر ہوگیا اور کمر میں بھی معمولی چوٹیں آئیں۔ بازو کے فریکچر ہونے کی وجہ سے کمر کی تکلیف کا احساس اس وقت تو نہ ہوا لیکن اس کے بعد ہر سال شدید سردی کے دنوں میں کمر میں درد ہوتا تھا، جوں ہی سردی کی شدت میں کمی ہوتی تو الحمد للہ ابو جی بالکل ٹھیک ہو جاتے اور سال کے باقی دنوں میں ایسا محسوس ہوتا، جیسا انھیں کبھی کمر میں تکلیف ہوئی ہی نہیں۔

بہ ہر حال اسی وقت میرے والد گرامی ابو جی کے لیے وہ ادویات میڈیکل سٹور سے خرید لائے جو ڈاکٹر صاحب نے کمر درد کے لیے تجویز کر رکھی تھیں۔ ان ادویات کے استعمال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے وقتی طور پر کمر میں درد کی شدت کافی کم ہوگئی۔

۱۷۔ دسمبر کی شام کو مولانا محمد داؤد غزنویؒ کے فرزند ارجمند سید یحییٰ غزنوی صاحب گھر تشریف لائے تو انھیں پرتپاک انداز سے ملے۔ دوران گفتگو جن کتابوں میں غزنوی علما کا ذکر کیا گیا ہے، وہ دکھائیں اور کچھ کتب انھیں تحفتاً پیش کیں۔ ۱۷، ۱۸ اور ۱۹۔ دسمبر کو ابو جی کی صحت دن کے اوقات میں بالکل ٹھیک رہتی اور وہ اپنے معمول کے کام بھی سرانجام دیتے، لیکن بعض اوقات رات کے آخری پہر کمر میں درد کی وجہ سے سانس بھی اکھڑنے لگتا۔

۲۰۔ دسمبر بروز اتوار صبح نو بجے ابو جی کو کمر میں شدید درد ہوئی تو راقم نے ان کے ذاتی معالج، معروف ماہر قلب اور مولانا معین الدین لکھویؒ کے بڑے بیٹے ڈاکٹر زعیم الدین لکھوی صاحب کو فون کیا اور انھیں کمر میں درد کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی عرض کی کہ درد کے ساتھ بعض اوقات سانس بھی اکھڑنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اس وقت بہاول نگر جا رہا ہوں آپ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عظیم الدین لکھوی صاحب سے رابطہ کریں۔

راقم نے اسی وقت ڈاکٹر عظیم الدین لکھوی صاحب کو فون کیا اور انھیں ابو جی کی صحت کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ میں کچھ ادویات کے نام لکھ کر آپ کو میسج (Message) کرتا ہوں، آپ یہ ادویات انھیں دیں اور ساتھ ہی کہا کہ میں کسی ہسپتال میں بیڈ کا انتظام بھی کرتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق ادویات دیں تو سانس اکھڑنے میں نمایاں کمی آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر عظیم الدین لکھوی صاحب کا دوبارہ فون آیا تو کہنے لگے، میں نے میو ہسپتال (Mayo Hospital) کی کارڈیالوجی وارڈ نمبر دو (Cardiyalogy Ward-II) میں بیڈ کا انتظام کروا دیا ہے، آپ بھٹی صاحب کو فوراً وہاں لے جائیں، میری ایم۔ ایس میو ہسپتال اور ڈیوٹی ڈاکٹر سے بات ہوگئی ہے۔

جب راقم نے ابو جی کو ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچایا تو ازراہِ مزاح کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق دوا کھانے سے تو میری صحت ٹھیک ہوگئی ہے۔

بہ ہرحال راقم اور میرے والد صاحب بارہ بجے رکشے پر ابو جی کو میو ہسپتال کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کارڈیالوجی وارڈ میں لے کر گئے۔ جب ہم متعلقہ وارڈ میں پہنچے تو ڈیوٹی ڈاکٹر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے ابو جی کا تفصیلی معائنہ کیا اور کہا کہ شدید سردی کی وجہ سے اسحاق بھٹی صاحب کے سینے پر بلغم جمی ہوئی ہے اس لیے انھیں (Nebualize) کریں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ جب (Nebualize) کرنا شروع کیا تو ڈاکٹر کو کہنے لگے کہ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کو بھی زندگی کے آخری دنوں میں سانس کی تکلیف کی وجہ سے اسی طرح (Nebualize) کیا جاتا تھا۔ (Nebualize) کرنے سے ان کی صحت کافی بہتر ہوگئی۔

رات دس بجے میں نے اپنے والد محترم سے کہا کہ آپ اب گھر چلے جائیں، میں یہاں ٹھہر جاتا ہوں تو ابو جی فوراً بولے۔ نہیں۔ سعید! ادھر میرے پاس ہی رہے گا، حسان! تم گھر جا کر آرام کرو۔ جب میں وارڈ سے نکلنے لگا تو مجھے بلایا اور فرمانے لگے کہ میرے فلاں فلاں دوست کو فون کر دو اور انھیں بتاؤ کہ میں ہسپتال میں داخل ہوں، میرے لیے خصوصی دعا کریں۔

رات گیارہ بجے راقم گھر پہنچا تو گھر والوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ابو جی کی صحت اب کافی بہتر ہے۔ ان شاء اللہ کل یا پرسوں ہم گھر آ جائیں گے۔

۲۱۔ دسمبر کی علی الصبح راقم اور محمد نعمان اسحاق (نواسہ مولانا محمد اسحاق بھٹی) گھر سے نکلنے لگے تو میرے والد گرامی کا فون آیا کہ ابو جی کہہ رہے ہیں کہ مطالعے کے لیے میری دو کتابیں (تذکرہ مولانا محی الدین لکھویؒ اور برصغیر کے اسلام میں اولین نقوش) بھی ساتھ لیتے آنا۔ ہم نے ناشتے کے ساتھ ان کتابوں کو بھی رکھ لیا، جب ہم وہاں پہنچے تو ابو جی بیٹھے ہوئے تھے اور ہمیں کہنے لگے کہ رات کے آخری پہر پھر مجھے کمر میں درد ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب میں کافی بہتر ہوں۔

چوں کہ آپ جس وارڈ میں تھے وہاں مریض کے ساتھ لواحقین کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن وارڈ کی انتظامیہ نے میرے والد گرامی کو ایک کرسی دے دی تھی، جس پر بیٹھ کر ہی انھوں نے ساری رات گزاری۔ ہم نے ابو جی سے کہا، اب آپ انھیں گھر جانے دیں ہم آپ کے پاس ہی تو موجود ہیں۔ کہنے لگے نہیں، سعید! ادھر میرے پاس ہی رہے گا۔

دوپہر ایک بجے کے قریب ڈاکٹر عظیم الدین لکھوی صاحب ابو جی کی عیادت کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئے تو ان کے ساتھ سینیئر ڈاکٹرز بھی تھے۔ جن سے وہ کافی دیر مشورہ کرتے رہے۔ اسی دوران ڈاکٹر زعیم الدین لکھوی صاحب کا بھی راقم کو فون آیا، ابو جی کی صحت کے بارے میں پوچھنے کے بعد کہنے لگے کہ میں تھوڑی دیر تک بھٹی صاحب کے چیک اپ کے لیے آرہا ہوں۔ میں نے ابو جی کو بتایا تو بڑے خوش ہوئے اور ساتھ ہی پوچھنے لگے کہ کیا اسحاق وغیرہ (داماد اور ان کی بیٹی) بہاول نگر سے چل پڑے ہیں؟ راقم نے کہا جی ابو جی! وہ ان شاء اللہ چار بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے۔راقم نے مزید کہا کہ اب آپ عصر کی نماز ادا کر لیں تو فرمانے لگے کہ میں نے تو عصر کی نماز پڑھ بھی لی ہے۔ ساڑھے تین بجے چچا طارق محمود بھٹی اور ان کی اہلیہ ابو جی کی عیادت کے لیے آئے تو ابو جی کی صحت بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ دوران گفتگو ابو جی اخبار کے ایڈیٹوریل صفحے کا مطالعہ کرتے رہے۔

میں اور نعمان عصر کی نماز پڑھ کر واپس آئے تو اسی اثناء میں ڈاکٹر زعیم الدین لکھوی صاحب بھی ابو جی کے چیک اپ کے لیے وارڈ میں پہنچ گئے، لیکن اس وقت ابو جی کا سانس اچانک اکھڑنے لگا۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹرز کو کچھ ادویات تبدیل کرنے کو کہا اور اپنے بیٹے ڈاکٹر یحییٰ سے سانس کو بہتر کرنے والی مشین کو بازار سے منگوایا۔ ڈاکٹر زعیم صاحب کے اردگرد کئی ڈاکٹرز بھی جمع ہوگئے جو ابو جی کے سانس کو بہتر کرنے کے لیے ڈاکٹر زعیم صاحب کی مدد کر رہے تھے۔ سانس بہتر نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹرز نے ابو جی کو وینٹی لیٹر پر لگانے کا فیصلہ کیا، اس امید سے کہ اس سے ابو جی کا سانس بہتر ہو جائے گا۔

راقم ڈاکٹر زعیم الدین لکھوی صاحب کے ساتھ ہسپتال کی جس جس وارڈ میں وینٹی لیٹرز (Ventilater) موجود تھے وہاں گیا، لیکن کوئی وینٹی لیٹر ایسا نہیں تھا جس پر کوئی مریض نہ ہو۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے ذرائع استعمال کیے تو ہمیں ایک وینٹی لیٹر ہسپتال کی ایسٹ میڈیکل وارڈ (East Medical Ward) سے ملا۔ جس پر فوری طور پر ہم نے ابو جی کو ایسٹ میڈیکل وارڈ میں شفٹ کیا۔ ڈاکٹرز نے انھیں فوری طور وینٹی لیٹر پر لگا دیا۔ ابو جی کی طبیعت زیادہ خراب ہونے پر ڈاکٹر زعیم الدین لکھوی صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عظیم الدین لکھوی صاحب کو بھی بلا لیا تھا، دونوں بھائی رات گئے تک ہمارے ساتھ رہے۔ اسی دوران

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں میرا بڑا بھائی محمد لقمان سعید، بہاول نگر سے بھائی جان اسحاق (داماد)، باجی (بیٹی)، عویمر اسحاق (نواسہ) اور گاؤں سے میری بڑی بہن اور بھانجا محمد ثوبان بھی ہسپتال پہنچ گئے تھے۔

ہم ساری رات ہسپتال میں رہے۔ ڈاکٹرز وقفے وقفے سے مسلسل چیک اپ کر رہے تھے۔ رات گئے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی میں اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر رانا تنویر قاسم اور مکتبۃ السلفیہ کے مالک محمد حماد شاکر صاحب بھی عیادت کے لیے ہسپتال پہنچے۔

۲۲۔ دسمبر ۲۰۱۵ء کو جب فجر کی اذان شروع ہوئی تو ڈاکٹرز چیک اپ کر رہے تھے، کہ اسی دوران ٹھیک صبح پانچ بج کے تیس منٹ پر ابو جی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ابو جی (مولانا محمد اسحاق بھٹی) جنھیں دنیا مؤرخ اسلام، ذہبی دوراں اور شہسوار قلم جیسے القابات سے پکارتی تھی، علم اور عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے ہمارے خاندان میں بھی ''اتحاد و اتفاق'' کی علامت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خاص وصف عطا کیا تھا کہ آپ ہر فرد سے اس کی ذہنی سطح پر آکر گفتگو کرتے، جس کی وجہ سے خاندان کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ ابو جی سب سے زیادہ پیار مجھ ہی سے کرتے ہیں، درست بات بھی یہی ہے کہ آپ خاندان کے ہر فرد سے بے حد محبت کرتے تھے۔

شاعر کی زبان میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

☆☆☆☆☆

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ

(وفات ۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳ء)

نومبر ۲۰۱۵ء کے آخری ایام میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے چھوٹے بیٹے سید احمد غزالی غزنوی کی اہلیہ محترمہ نے ابو جی (مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب) کو فون کیا اور درخواست کی کہ ۱۶۔ دسمبر کو چوں کہ مولانا کی برسی ہے اس لیے آپ ان پر ایک کالم لکھیں جو ۱۶۔ دسمبر کو پاکستان کے اہم قومی اخبارات میں شائع ہو۔ ابو جی نے حامی بھر لی۔ فون رکھنے کے بعد راقم سے فرمانے لگے کہ جس طرح سقوط ڈھاکہ اور سانحہ پشاور جیسے سانحات ۱۶۔ دسمبر کو ہوئے اسی طرح ۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو برصغیر کی سیاسی و مذہبی تحریک پر ایک سانحہ برپا ہوا جب ایک نابغہء روزگار شخصیت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کا انتقال ہوا تھا۔ دسمبر کے دوسرے ہفتے میں جناب سید احمد غزالی غزنوی صاحب کی اہلیہ کا دوبارہ ٹیلی فون آیا تو ابو جی نے کہا کہ مجھے یاد ہے میں ان شاء اللہ یہ کالم ضرور لکھوں گا اور اس کالم کے آخر میں غزنوی فاؤنڈیشن ٹرسٹ کا بھی ذکر کروں گا جو معاشرے میں موجود مستحق اور نادار افراد کی مالی مدد کے ساتھ ساتھ انھیں علاج معالجے کی مفت سہولیات فراہم کرتی ہے۔ جس کی نگرانی مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے دونوں بیٹے سید یحییٰ غزنوی اور سید احمد غزالی غزنوی کرتے ہیں۔

۱۳۔ دسمبر کو راقم نے کالم کے بارے میں یاد کرایا تو فرمانے لگے کہ کل لکھوں گا۔ ۱۴۔ دسمبر کو جب میں یونیورسٹی سے گھر آیا تو ابو جی نے مجھے بلا کر کالم دکھایا اور کہا میں اس کو کل مکمل کر کے اہم اخبارات میں بھیج دوں گا۔ لیکن کچھ دیگر تصنیفی مصروفیات کی وجہ سے یہ کالم بروقت مکمل نہ ہو سکا۔ جس کا انھیں شدید رنج تھا۔ ۱۸۔ دسمبر کو مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے فرزند ارجمند سید یحییٰ غزنوی صاحب گھر تشریف لائے، رات گئے تک ملاقات جاری رہی۔ دوران گفتگو ابو جی نے سید صاحب کو نا مکمل کالم دکھایا اور کہا افسوس میں اسے بروقت مکمل نہ کر سکا۔ سید صاحب کہنے لگے کہ میں اب ۲۲۔ دسمبر کو آؤں گا تو فرمایا: ان شاء اللہ میں اس وقت تک اسے مکمل کر لوں گا۔ بہ ہر حال اللہ تعالیٰ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو کچھ اور ہی منظور تھا، ۱۸۔ دسمبر کے بعد ابو جی کمر میں شدید درد کی وجہ سے اسے مکمل نہ کر سکے۔ یہ چوں کہ ابو جی کی آخری تحریر ہے اس لیے اس تحریر کا عکس بھی قارئین کے لیے پیش کر دیا گیا ہے۔

(حافظ محمد حسان سعید)

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے جدِ امجد کا اسم گرامی حضرت سید عبداللہ غزنوی تھا۔ ان کی ولادت ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۱ء) میں افغانستان کے شہر غزنی کے مضافات میں قلعہ بہادر خیل کے مقام پر ہوئی جو خواجہ ہلابل پہاڑ کے قریب ہے۔ والدین نے ان کا نام محمد اعظم رکھا تھا، لیکن انھوں نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو خود ہی اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ اس لیے کہ اس میں اللہ کی الوہیت کا اظہار بھی ہے اور بندے کی عبودیت کا اقرار بھی۔ انھوں نے پہلے غزنی اور اس کے قرب وجوار کے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ پھر اس علاقے کے ممتاز ترین عالم ملا حبیب اللہ قندھاری کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے تفسیر وحدیث کی کتابیں پڑھیں۔ بعدازاں دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح بخاری کا درس لیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع تھی اور دہلی شہر میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔

افغانستان کے لوگ اس وقت مشرکانہ رسوم وبدعات میں مبتلا تھے۔ حضرت سید عبداللہ صاحب نے وطن آ کر توحید کی تبلیغ اور بدعات کی مخالفت شروع کی تو وہاں کے علما نے ان کے خلاف ہنگامہ بپا کر دیا، حکومت کے بھی ان کے خلاف کان بھرے گئے۔ لیکن اس کے باوجود عوام میں حضرت ممدوح کا اثر بڑھتا گیا اور لوگ توجہ سے ان کی بات سننے لگے۔ اب علمائے سوء نے سیاسی اندازِ گفتگو اختیار کیا اور یہ شوشہ چھوڑا کہ اگر انھیں ڈھیل دی گئی تو ان کا دائرۂ اثر پھیلتا جائے گا اور یہ لوگ حکومت پر قبضہ کر لیں گے۔

اس سے حکومت حرکت میں آئی اور انھیں اور ان کے تین بیٹوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا اور شدید ترین سزائیں دی گئیں......... پھر معاملہ یہاں تک بڑھا کہ انھیں افغانستان سے نکال دیا گیا اور وہ سخت گرمیوں میں تکلیفیں جھیلتے ہوئے اہل وعیال سمیت پشاور آ گئے۔ چند روز پشاور رہے، پھر وہاں سے چل کر ایک پڑاؤ لاہور کیا اور جلد ہی لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے امرتسر کو روانہ ہوئے۔ چند روز امرتسر سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ایک بستی ''خیردی کے'' میں گزارے اور پھر امرتسر شہر میں آگئے۔ امرتسر کے جس محلے میں سکونت اختیار کی، اسے محلّہ غزنویہ کہا جانے لگا اور جس مسجد میں نماز پڑھنا شروع کی، اسے مسجد غزنویہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہاں ایک دینی مدرسہ جاری کیا تو وہ مدرسہ غزنویہ کہلایا، جس میں ہندستان بالخصوص پنجاب کے دور دراز علاقوں سے طلبائے علم آئے اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔

درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ان حضرات نے تصنیف وتالیف اور وعظ وتذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کی کوشش سے ہی اس ملک میں امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کی تصنیفات کی اشاعت ہوئی۔ بہت سی اہم عربی کتابوں کے اردو زبان میں ترجمے کیے گئے۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے فرزندان گرامی میں سے مولانا عبدالجبار غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی نے علم وفضلیت اور وعظ وتذکیر میں بالخصوص بڑی شہرت پائی۔ ان بزرگانِ عالی قدر کے درس وتدریس کے دائرے نے بھی اس زمانے میں بے حد وسعت اختیار کی۔ مولانا عبدالواحد غزنوی کے ایک بیٹے مولانا اسماعیل غزنوی تھے جنھوں نے ملک کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مولانا اسماعیل غزنوی کے صاحب زادے ڈاکٹر خالد غزنوی تھے جو مشہور معالج اور متعدد طبی کتابوں کے مصنف تھے۔

مولانا عبدالجبار غزنوی کے فرزند گرامی مولانا محمد داؤد غزنوی تھے، جن کی ولادت ۱۸۹۵ء میں بمقام امرتسر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے آبائی مدرسہ غزنویہ میں اپنے والد مکرم حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی، اپنے چچا زاد مولانا عبدالاول غزنوی بن مولانا محمد غزنوی اور مدرسے کے بعض دیگر اساتذہ کرام سے حاصل کی۔

مولانا کے جدِّ امجد حضرت سید عبداللہ غزنوی اور والد محترم حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی نے احادیث کی انتہائی درجے کی کتابیں دہلی میں حضرت سید میاں نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھیں۔ حضرت میاں صاحب تو مولانا داؤد غزنوی کے دورِ طفولیت ہی میں ۱۳۔اکتوبر ۱۹۰۲ء کو وفات پا گئے تھے، لیکن مولانا چاہتے تھے کہ دہلی کے اسی مدرسے میں تفسیر وحدیث کی کتابیں پڑھی جائیں، جس میں ان کے جدِّ امجد اور والد مکرم نے پڑھی تھیں، چناں چہ ابتدائی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم کے بعد وہ دہلی چلے گئے اور وہاں حضرت میاں صاحب کے عالی مرتبت شاگرد حضرت حافظ عبداللہ غازی پور مرحوم ومغفور کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے اور ان سے تفسیر وحدیث میں فیض یاب ہونے کی سعادت حاصل کی۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد واپس امرتسر آئے تو مدرسہ غزنویہ کی مسندِ درس پر متمکن ہوئے اور سلسلہ تدریس کا آغاز کیا۔ اس پر کچھ عرصہ گزرا تھا کہ یورپ کی پہلی جنگ کے بعد جو جولائی ۱۹۱۴ء میں شروع اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی، ہندوستان میں آزادی کی تحریک کا آغاز ہوگیا اور اس تحریک نے اتنی شدت اختیار کی کہ انگریزی حکومت سے عدم تعاون اور ترکِ موالات تک نوبت جا پہنچی، اسی اثنا میں تحریک خلافت شروع ہوگئی۔ امرتسر ان تحریکوں کا بڑا مرکز تھا۔ مولانا داؤد غزنوی ان انگریز مخالف تحریکوں میں شامل ہوگئے اور جلد ہی ان کی سرگرمیاں قائدانہ حیثیت اختیار کر گئیں۔ پھر قید و بند کا معاملہ پہنچا اور بار بار اس منزل سے گزرنا پڑا۔ لیکن یہاں اس عہد کے سیاسی حالات کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، ان کی زندگی کے بعض دیگر پہلوؤں کی نشان دہی کرنا مقصود ہے۔

مولانا مرحوم نے اس گھرانے میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تھا، جن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ علم وعرفان سب سے بڑی دولت، زہد وتقویٰ سب سے بڑا سرمایہ اور کتاب وسنت سے محبت اور اس پر عمل اصل مقصد حیات ہے۔ اسی فضا میں انھوں نے پرورش پائی اور یہی فضا آخر تک ان کے قلب وذہن پر چھائی رہی۔ ان کا آبائی مدرسہ ان کی دلچسپیوں کا اصل محور تھا، وہ خود تو ۱۹۳۰ء سے لاہور کی چینیاں والی مسجد میں خطابتِ جمعہ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے اور اسی مسجد کے چھوٹے سے مکان میں سکونت پذیر تھے، لیکن امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کا اہتمام بھی ان کے سپرد تھا اور مہتمم کے طور پر وہاں ان کی آمد ورفت رہتی تھی۔

تقسیم ملک سے کچھ عرصہ پہلے انھوں نے مدرسہ غزنویہ کے قریب کچھ جگہ خرید کر مدرسے کے لیے نئی عمارت تعمیر کی تھی۔ اس میں طلباء کے لیے ہوسٹل بھی بنایا تھا۔ تقسیم کے بعد مدرسہ غزنویہ لاہور میں منتقل ہوا تو کچھ عرصہ تعلیم کا سلسلہ مسجد چینیاں والی میں جاری رہا۔ پھر شیش محل روڈ پر محکمہ اوقاف کی ایک بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا، جس کا نام پرتی مدھی سناتن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دھرم تھا اور یہاں سناتن دھرمیوں کا ایک مندر تھا۔ اس کے ہال کو بھوپندراہال کہا جاتا تھا۔ یہ ہال راجا بھوپندر سنگھ والی پٹیالہ کے نام سے موسوم ہے۔ اسی ہال میں طلبا کے لیے تعلیم کا انتظام کیا گیا اور نمازیں بھی اسی میں پڑھی جاتی ہیں۔ مولانا کی رہائش بھی اسی بلڈنگ میں تھی۔ محکمہ اوقاف کی طرف سے یہ بلڈنگ مہتمم دارالعلوم تقویۃ الاسلام و مدرسہ غزنویہ کے نام الاٹ ہوئی، جس کا باقاعدہ ماہانہ کرایہ ادا کیا جاتا ہے۔

ایک دن میں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کا کلیم تو داخل کرایا اور اس کے بدلے میں بلڈنگ مل گئی اور مدرسہ جاری ہوگیا، لیکن آپ نے اپنے امرتسر کے سکونتی مکان کا کلیم کیوں نہیں داخل کرایا؟ فرمایا میرے پاس امرتسر میں کوئی سکونتی مکان نہ تھا۔ جو مکان مجھے والد کے ترکے سے ملا تھا، وہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو فروخت کر دیا تھا، اس لے کلیم داخل کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر فرمایا آپ میری ظاہری حالت کو دیکھتے ہیں، میری غربت کا آپ کو علم نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا ممدوح کچھ عرصہ اپنے مدرسے میں طلباء کو پڑھاتے بھی رہے۔ وہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف "موطا" سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اس کی تدریس شروع کی۔ اس وقت بائیس طلبا موطا امام مالک پڑھتے تھے۔ جس طرح خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حدیث کی یہ کتاب پڑھاتے وقت بہترین لباس پہنتے اور نہایت اہتمام سے اس کا درس دیتے تھے، مولانا داؤد غزنوی بھی اپنی حیثیت کے مطابق اس کی تدریس کے موقع پر بہترین لباس زیب تن فرماتے اور ایک گھنٹے کے اس درس میں کسی آنے والے سے کوئی بات نہ کرتے اور کامل دلجمعی سے درس دیتے۔ بعض طلبا ان کی تقریر کے نوٹس بھی لیتے۔ وہ جلال اور جمال کا حسین ترین نمونہ تھے۔ جس طرح وہ خود خوب صورت تھے، اسی طرح ان کا اندازِ کلام بھی خوب صورتی کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے جدِ امجد کا اسمِ گرامی حضرت
سید عبداللہ غزنوی تھا۔ ان کی ولادت ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۱ء) میں
افغانستان کے شہر غزنی کے مضافات میں قلعہ بہادر خیل کے مقام پر ہوئی
جو خواجہ بلال پہاڑ کے قریب ہے۔ والدین نے ان کا نام محمد اعظم رکھا
تھا لیکن انھوں نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو خود ہی اپنا نام عبداللہ
رکھ لیا۔ اس لیے کہ اس میں اللہ کی الوہیت کا اظہار ہے اور بندے
کی عبدیت کا اقرار ہے۔ انھوں نے پہلے غزنی اور اس کے قرب و
جوار کے اساتذہ سے تحصیلِ علم کی۔ پھر اس علاقے کے ممتاز ترین
عالم ملا حبیب اللہ قندھاری کی خدمت میں حاضری دی اور ان
سے تفسیر و حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں دہلی جا کر حضرت
میاں سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح بخاری کا درس لیا۔ یہ
اس زمانے کی بات ہے جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی شروع
تھی اور دہلی شہر میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔

افغانستان کے لوگ اس وقت مشرکانہ رسوم و بدعات
میں مبتلا تھے۔ حضرت سید عبداللہ صاحب نے وطن آ کر توحید کی تبلیغ اور
بدعات کی مخالفت شروع کی تو وہاں کے علما نے ان کے خلاف
ہنگامہ بپا کر دیا۔ حکومت کے بھی ان کے خلاف کان بھرے گئے۔ لیکن اس کے
باوجود عوام میں حضرت ممدوح کا اثر بڑھتا گیا اور لوگ توجہ سے ان
کی بات سننے لگے۔ اب علمائے سو نے سیاسی اندازِ گفتگو
اختیار کیا اور یہ شوشہ چھوڑا کہ اگر انھیں ڈھیل دی گئی تو ان
کا دائرۂ اثر پھیلتا جائے گا اور یہ لوگ حکومت پر قبضہ کر لیں گے۔
اس سے حکومت حرکت میں آئی اور انھیں اور ان کے متبعین
کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا اور شدید ترین سزائیں
دی گئیں۔ پھر سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ انھیں افغانستان
سے نکال دیا گیا اور وہ سخت گرمیوں میں تکلیفیں جھیلتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہوئے اہل وعیال سمیت پشاور آ گئے۔ چند روز پشاور رہے، پھر
وہاں سے چل کر ایک مہینہ لاہور گزارا اور جلد ہی لاہور سے
امرتسر کو روانہ ہوئے۔ چند روز امرتسر سے دس بارہ میل کے فاصلے
پر ایک بستی خیردی کے میں گزارے اور پھر امرتسر شہر میں آ گئے۔
امرتسر کے جس محلے میں سکونت اختیار کی، اسے محلہ غزنویہ کہا جانے
لگا اور جس مسجد میں نماز پڑھنا شروع کی، اسے مسجد غزنویہ
کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہاں ایک دینی مدرسہ جاری کیا جو وہ
مدرسہ غزنویہ کہلایا، جس میں ہندوستان بالخصوص پنجاب کے دور
دراز علاقوں سے طلبائے علم آنے اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔

درس وتدریس کے ساتھ ان حضرات نے تصنیف وتالیف
اور وعظ وتذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کی کوشش سے امام ابن تیمیہ
اور امام ابن قیم کی تصنیفات کی اشاعت ہوئی۔ بہت سی اہم عربی کتابوں
کے اردو زبان میں ترجمے کیے گئے۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے فرزندان
گرامی میں سے مولانا عبدالجبار غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی نے علم وفضیلت اور
وعظ وتذکیر میں بالخصوص بڑی شہرت پائی۔ ان بزرگان عالی قدر نے
درس وتدریس کے دائرے کو اس زمانے میں بے حد وسعت
اختیار کی۔ مولانا عبدالواحد غزنوی کے ایک بیٹے مولانا اسماعیل غزنوی
تھے جنھوں نے ملک کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا اور قید وبند کی
صعوبتیں برداشت کیں۔ مولانا اسماعیل غزنوی کے صاحبزادے ڈاکٹر خالد
غزنوی تھے جو مشہور معالج اور متعدد طبی کتابوں کے مصنف تھے۔

مولانا عبدالجبار غزنوی کے فرزند گرامی مولانا محمد داؤد غزنوی
تھے، جن کی ولادت ۱۸۹۵ء میں بمقام امرتسر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم الفرقان
اپنے آبائی مدرسہ غزنویہ میں اپنے والد مکرم حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی،
اپنے چچا زاد مولانا عبدالاول غزنوی بن مولانا محمد غزنوی اور مدرسے کے بعض
دیگر اساتذہ کرام سے حاصل کی۔

مولانا کے جد امجد حضرت سید عبداللہ غزنوی اور والد محترم حضرت

مولانا عبدالجبار غزنوی نے بھی احادیث کی ابتدائی درجے کی کتابیں دہلی میں حضرت سید میاں نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھیں۔ مولانا [illegible]

حضرت میاں صاحب تو وفات پا گئے تھے، لیکن مولانا چاہتے تھے کہ دہلی کے اسی مدرسے میں تفسیر و حدیث کی کتابیں پڑھی جائیں، جس میں ان کے جد امجد اور والد مکرم نے پڑھی تھیں، چنانچہ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ دہلی چلے گئے اور وہاں حضرت میاں صاحب کے عالی مرتبت شاگرد حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری مرحوم و مغفور کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور ان سے تفسیر و حدیث میں فیض یاب ہونے کی سعادت حاصل کی۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد واپس امرتسر آئے تو مدرسہ غزنویہ کی مسند درس پر متمکن ہو گئے اور سلسلہ تدریس کا آغاز کیا۔ اسے ابھی کچھ عرصہ گزرا تھا کہ یورپ کی پہلی جنگ کے بعد جو (فروری) ۱۹۱۴ء میں شروع اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی، ہندوستان میں آزادی کی تحریک کا آغاز ہو گیا اور اس تحریک نے وقتی شدت اختیار کی کہ انگریزی حکومت سے عدم تعاون اور ترک موالات تک نوبت جا پہنچی۔ اسی اثنا میں تحریک خلافت شروع ہو گئی۔ امرتسر ان تحریکوں کا مرکز تھا۔ مولانا داؤد غزنوی ان انگریز مخالف تحریکوں میں شامل ہو گئے اور جلد ہی ان کی سرگرمیاں قائدانہ حیثیت اختیار کر گئیں۔ پھر قید و بند کا مرحلہ بھی بار بار اس منزل سے گزرنا پڑا۔ لیکن یہاں اس عہد کے سیاسی حالات کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، ان کی زندگی کے بعض دیگر پہلوؤں کی نشاندہی کرنا مقصود ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ نے ایک گھرانے میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تھا، جس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ علم و عرفان سب سے بڑی دولت، زہد و تقویٰ سب سے بڑا سرمایہ اور کتاب و سنت سے محبت اور اس پر عمل اصل

www.KitaboSunnat.com

متعدد حیات ہے۔ اس فضا میں انھوں نے پرورش پائی اور یہی
فضا آخر تک ان کے قلب و ذہن پر چھائی رہی۔ ان کا آبائی مکان
ان کی دلچسپیوں کا اصل محور تھا۔ وہ خود تو ۱۹۳۰ء سے لاہور
کی چینیاں والی مسجد میں خطابت جمعہ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے اور
اسی مسجد کے چھوٹے سے مکان میں سکونت پذیر تھے، لیکن امرتسر کے مدرسہ
غزنویہ کا اہتمام بھی ان کے سپرد تھا اور مہتمم کے طور پر وہاں ان کی
آمد و رفت رہتی تھی۔

تقسیم ملک سے کچھ عرصہ پہلے انھوں نے مدرسہ غزنویہ
کے قریب کچھ جگہ خرید کر مدرسے کے لیے نئی عمارت تعمیر
کی تھی۔ اس میں طلباء کے لیے ہوسٹل بھی بنایا تھا۔ تقسیم کے بعد مدرسہ
غزنویہ لاہور میں منتقل ہوا تو کچھ عرصہ تعلیم کا سلسلہ مسجد چینیاں والی
میں جاری رہا۔ پھر شیش محل روڈ پر محکمہ اوقاف کی ایک
بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا، جس کا نام پیرزادہ بی بی منا تن دعوم تھا
اور پیاں منا تن دعوم ہوں کا ایک مندر تھا۔ اس کے ہال کو
تعلیم کا انتظام کیا گیا اور نمازیں بھی اسی میں پڑھی
جاتی تھیں۔ مولانا کی رہائش بھی اسی بلڈنگ میں تھی۔ محکمہ اوقاف
کی طرف سے یہ بلڈنگ مہتمم دار العلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) کے نام
الاٹ ہوئی، جس کا باقاعدہ ماہانہ کرایہ ادا کیا جاتا ہے۔

ایک دن میں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے امرتسر کے مدرسہ غزنویہ
کا کلیم تو داخل کر دیا اور اس کے بدلے میں بلڈنگ الاٹ ہو گئی اور مدرسہ
جاری ہو گیا، لیکن آپ نے اپنے امرتسر کے سکونتی مکان کا کلیم کیوں نہیں
داخل کر دیا؟ فرمایا میرے پاس امرتسر میں کوئی سکونتی مکان نہیں
تھا۔ جو مکان تھا وہ الگ تھلگ تھا۔ وہ میں نے اپنے
چھوٹے بھائی کو وقف کر دیا تھا۔ اس لیے کلیم داخل کرانے کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر فرمایا آپ میری تمام حالت کو
دیکھتے ہیں، پھر کیا فرق ہے؟ آپ کو علم نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیام پاکستان کے بعد مولانا ممدوح کچھ عرصہ اپنے مدرسے میں
طلبا کو پڑھاتے بھی رہے۔ وہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
کی مشہور تصنیف "موطا" سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے
اس کی تدریس شروع کی۔ اس وقت چالیس طلبا موطا امام
مالک پڑھتے تھے۔ جس طرح خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
حدیث کی یہ کتاب پڑھاتے وقت بہترین لباس پہنتے اور نہایت
اہتمام سے اس کا درس دیتے تھے، مولانا داؤد غزنوی بھی اپنی
حیثیت کے مطابق اس کی تدریس کے موقعے پر بہترین لباس
زیب تن فرماتے اور ایک گھنٹے تک اس درس میں کسی
سے کوئی بات نہ کرتے اور کامل دلجمعی سے درس دیتے۔ بعض طلبا
ان کی تقریر کے نوٹس بھی لیتے۔ وہ جلال اور
جمال کا حسین ترین نمونہ تھے۔ جس طرح وہ خود خوب صورت
تھے، اسی طرح ان کا انداز کلام بھی خوب صورت اور ان کے لب و لہجے سے
دو بالا ہوتا تھا۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی تصنیفات

برصغیر میں علم فقہ
لسان القرآن (جلد سوم)
ارمغان حنیف
قصوری خاندان
صوفی محمد عبداللہؒ (حالات۔خدمات۔آثار)
میاں عبدالعزیز مالواڈہ
بزم ارجمنداں
قافلہ حدیث
برصغیر میں اہل حدیث کی آمد
دبستانِ حدیث
چمنستانِ حدیث
ارمغانِ حدیث
تذکرہ مولانا غلام رسول قلعویؒ
تذکرہ مولانا محی الدین لکھویؒ

برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش
چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں
میاں فضل حق اور ان کی خدمات
اسلام کی بیٹیاں
تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ
کاروانِ سلف
نقوش عظمت رفتہ
ہفت اقلیم
برصغیر میں اہل حدیث خدام قرآن
گلستان حدیث
برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات
مولانا احمد دین گکھڑوی
روپڑی علمائے حدیث
گزر گئی گزران (آپ بیتی)

صدارتی اور استقبالیہ خطبات
فقہائے ہند پہلی صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری تک (دس جلدیں)
برصغیر میں اہل حدیث کی تدریسی و تنظیمی سرگزشت

عربی سے اردو

الفہرست / ابن ندیم
حضرت ابو بکر صدیقؓ / محمد حسین ہیکل
ریاض الصالحین / ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
20S/13 جناح سٹریٹ، اسلامیہ کالونی سانده، لاہور
Ph 0301-4768918 .0423-7143677
mishaqbhattiri2002@gmail.com